تاریخِ اسلام

در آثار استاد مطہری

مرتبہ:

سید سعید روحانی

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

تاریخِ اسلام

در آثار استاد مطہری

مرتبہ: سید سعید روحانی

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس ۵۴۲۵ - کراچی - پاکستان

کتاب .... تاریخ اسلام در آثار استاد مطہری

مرتب .... سید سعید روحانی

ترجمہ .... محمد حسن جعفری

تطبیق و تہذیب .... رضا حسین رضوانی، علی محمد رحمانی

طبع اول .... نومبر ۲۰۱۵ء

مطبع .... محراب پریس کراچی

ISBN 978-969-9303-27-0

جملہ حقوق محفوظ ہیں: یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کئے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل میں تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریۃً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لئے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئیؒ نے ۱۹۷۷ء میں جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان کی بناء رکھی تھی۔ یہ ادارہ اب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی دام ظلہ کی سرپرستی میں کوشش کر رہا ہے کہ حتی الامکان معتبر اسلامی لٹریچر دنیا تک پہنچایا جا سکے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم و معارف کی طرف متوجہ کرانا اور اُس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا اور اسے اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

الحمد للہ یہ ادارہ اب تک اردو اور انگریزی زبانوں میں عراق، ایران، لبنان، افغانستان، سوڈان، مصر اور تیونس کے علماء اور دانشوروں کی سیکڑوں کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ انسانیت کو صراط مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

علاوہ ازیں یہ ادارہ ایک ہزار سے زائد مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم نونہالوں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

اسلام کی دعوت ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لیے تمام مومنین کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں تعاون کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا میں عام کیا جا سکے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بحق محمدؐ و آل محمدؑ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفسی
وکیل آیت اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی دام ظلہ العالی

اسلام

اسلام ہی وہ دین ہے جسے اللہ نے اپنی پہچان کرانے کے لیے پسند کیا، اپنی نظروں کے سامنے اس کی دیکھ بھال کی، اس کی تبلیغ کے لیے بہترین خلق کا انتخاب فرمایا۔ اپنی محبت پر اُس کے ستون کھڑے کئے، اُس کی برتری کی وجہ سے تمام ادیان کو سرنگوں کیا اور اس کی بلندی کے سامنے سب ملتوں کو پست کیا۔ اس کی عزت کے ذریعے دشمنوں کو ذلیل اور اُس کی مدد سے مخالفوں کو رسوا کیا۔ اس کے ستون سے گمراہی کے کھمبوں کو گرا دیا۔ پیاسوں کو اس کے تالابوں سے سیراب کیا اور پانی اُلچنے والوں کے ذریعے حوضوں کو بھر دیا۔ پھر اسے اس طرح مضبوط کیا کہ نہ اس کے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں، نہ اس کی کڑیاں الگ الگ ہو سکتی ہیں، نہ اس کی بنیاد گر سکتی ہے، نہ اس کے ستون اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہیں، نہ اس کا درخت اکھڑ سکتا ہے، نہ اس کی مدت ختم ہو سکتی ہے، نہ اس کے قوانین ختم ہو سکتے ہیں، نہ اس کی شاخیں کٹ سکتی ہیں، نہ اس کی راہیں تنگ نہ اس کی آسانیاں دشوار ہیں، نہ اس کے سفید دامن پر سیاہی کا دھبہ، نہ اس کی استقامت میں پیچ وخم، نہ اس کی لکڑی میں کجی، نہ اس کی کشادہ راہ میں کوئی دشواری ہے، نہ اس کے چراغ گل ہوتے ہیں، نہ اس کی خوشگواریوں میں تلخیوں کا گزر ہوتا ہے۔ اسلام ایسے ستونوں پر حاوی ہے جس کے پائے اللہ نے حق کی سرزمین میں قائم کئے ہیں اور اُن کی بنیاد کو استحکام بخشتا ہے اور ایسے سرچشمے ہیں جن کے چشمے پانی سے بھرپور اور ایسے چراغ ہیں جن کی لوئیں ضیا بار ہیں۔ ایسے مینار ہیں جن کی روشنی میں مسافر قدم بڑھاتے ہیں اور ایسے نشان ہیں جن سے سیدھی راہوں کا قصد کیا جاتا ہے اور ایسے گھاٹ ہیں جن پر اترنے والے اُن سے سیراب ہوتے ہیں۔ اللہ نے اسلام میں اپنی انتہائے رضامندی، بلند ترین ارکان اور اپنی اطاعت کی اونچی سطح کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ کے نزدیک اس کے ستون مضبوط اس کی عمارت سربلند، اس کی دلیلیں روشن اور لوئیں ضیابار ہیں۔ اس کی سلطنت غالب اور مینار بلند ہیں اور اس کی بیخ کنی دشوار ہے۔ پس تم اس کی عزت باقی رکھو اس کے احکام کی پیروی کرو، اس کے حقوق ادا کرو اور اس کے ہر حکم کو اس کی جگہ پر قائم کرو۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۶)

استاد شہید شیخ مرتضیٰ مطہری

maablib.org

شیخ مرتضیٰ مطہری ۱۹۲۰ء میں مشہد مقدس کے ایک گاؤں فریمان میں شیخ محمد حسین مطہری کے گھر پیدا ہوئے۔ مشہد میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے حوزہ علمیہ قم میں داخلہ لیا۔ وہاں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۲ء تک آپ نے آیت اللہ العظمیٰ بروجردی سے فقہ اور اصول، آیت اللہ العظمیٰ خمینی سے ملا صدرا کا فلسفہ، عرفان اور اخلاق اور علامہ سید محمد حسین طباطبائی سے فلسفہ، بوعلی سینا کی شفا وغیرہ اور آیت اللہ میرزا علی آقا شیرازی سے اخلاق اور عرفان کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں ان اساتذہ کا کردار بہت اہم ہے۔

قم میں تکمیل تعلیم کے بعد آپ ایک عرصے تک تہران یونیورسٹی میں الٰہیات اور معارف اسلامی کے سربراہ رہے۔ استاد شہید امت کی اصلاح میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ سیکڑوں اہم موضوعات پر آپ کی تحریریں اور تقریریں ''مجموعہ آثار شہید مطہری'' کے عنوان سے ۲۰ مجلدات میں شائع ہو چکی ہیں۔ تدریسی امور کے علاوہ آپ اجتماعی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آپ علمی اور تبلیغی مقاصد کے لیے قائم ہونے والے ادارے ''حسینیہ ارشاد'' تہران کے بانی اراکین میں سے تھے۔ اس ادارے سے آپ کا بہت سا علمی کام شائع ہوا ہے۔ جب انقلاب اسلامی ایران کی تحریک زور پکڑنے لگی تو شاہ کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں آپ کو جیل بھیج دیا گیا۔

آپ انقلاب اسلامی ایران کے ایک مرکزی رہنما تھے اور آپ نے انقلاب کی کامیابی کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی۔ امام خمینی نے آپ کو دستور ساز کونسل کا چیئرمین مقرر کیا تھا۔ اسلام کی ترویج اور اسلامی انقلاب کے لیے کام کرنے کے جرم میں ایک انتہا پسند مذہبی گروپ ''فرقان'' نے یکم مئی ۱۹۷۹ء کو گولی مار کر آپ کو شہید کر دیا۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

فہرست

پیش لفظ ۱۳
قارئین سے چند باتیں ۱۴

پہلا باب: بنیادی مباحث
۱۷ ـ ۳۹

ماہیت تاریخ ۱۹
(۱) تاریخ کا مفہوم ۱۹
قرآن میں تاریخ کا فلسفہ ۲۱
(۲) تاریخ میں تبدیلیاں ۲۲
تاریخ کی حرکت کے عوامل ۲۳
مذکورہ نظریات کا جائزہ ۲۴
(۳) تاریخ کی اہمیت ۲۶
تاریخ نگاری اور چند مسلمان مورخین کا تعارف ۲۹
تاریخ نگاری کی اقسام ۲۹
پہلا مسلمان مورخ ۳۰
چند مورخین کا تعارف ۳۰
اسلام کی جنم بھومی ۳۲

عرب کے سماجی، اعتقادی اور ثقافتی حالات ۳۳
ایران کا رُو بہ زوال تمدن ۳۵
بحث کے چیدہ نکات ۳۶

دوسرا باب: تاریخ زندگی و سیرت رسول اکرم ﷺ

۴۱ _ ۸۱

رسول اکرم ﷺ کی زندگی سے آشنائی ۴۳
رسول اکرم ﷺ کی زندگی اور اَخلاق و کردار ۴۳
رسول اکرم ﷺ کی خصوصیات ۴۴
اسلام میں قیادت اور رہبری کے شرائط ۵۰
رسول اکرم ﷺ کی بعثت ۵۵
رسول اکرم ﷺ کی ہجرت ۵۷
رسول اکرم ﷺ کے غزوات ۶۰
حجۃ الوداع ۶۶
اسلام کی کامیابی اور فروغ کے اسباب ۶۹
مقدمہ ۶۹
بحث کے چیدہ نکات ۷۷

تیسرا باب: سقیفہ سے قتل عثمانؓ تک

۸۳ _ ۱۰۶

واقعات سقیفہ کا تجزیہ ۸۵
(۱) نص اور وصیت ۸۷
(۲) لیاقت اور اہلیت ۸۹

(۳) قرابت اور نسب ۹۰
حضرت عمرؓ کا عہد خلافت ۹۱
خلفائے ثلاثہ کی فتوحات کا تجزیہ ۹۳
فتوحات کا نتیجہ ۹۳
ساسانی سلطنت کی شکست اور مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب ۹۵
اسلامی تمدن میں ایران کا کردار ۹۵
تمدن ایران پر اسلام کے اثرات ۹۷
حضرت عثمانؓ کا قتل ۹۹
(۱) حضرت عثمانؓ کا کردار ۹۹
(۲) لوگوں کا ردعمل ۱۰۱
(۳) قتل عثمانؓ میں معاویہ کا کردار ۱۰۳
بحث کے چیدہ نکات ۱۰۴

چوتھا باب: تاریخ زندگی حضرت علیؑ

۱۰۷ ـ ۱۴۳

حضرت علیؑ خلفاء کے دور میں ۱۰۹
(۱) خلفاء پر تنقید ۱۰۹
(۲) حضرت علیؑ کی صبر آزما خاموشی ۱۱۴
بیعت، خصوصیت اور حکومت علیؑ کی سیاسی روش ۱۱۷
(۱) بیعت ۱۱۷
(۲) خلافت قبول کرنے کا فلسفہ ۱۱۸
(۳) مرتضوی حکومت کی سیاسی روش ۱۱۹

حکومت مرتضوی کو در پیش مشکلات ۱۲۵
(۱) حضرت عثمانؓ کا قتل ۱۲۵
(۲) عدل میں رواداری نہ کرنا ۱۲۵
(۳) سیاست میں سچائی ۱۲۶
(۴) ناکثین، قاسطین اور مارقین ۱۲۶
(۱) ناکثین ۱۲۷
(۲) قاسطین ۱۲۸
(۳) مارقین ۱۲۹
حضرت علیؑ کی شہادت میں قطام کا کردار ۱۳۵
حضرت علیؑ کی زندگی کا حیرت انگیز عرصہ ۱۳۶
بحث کے چیدہ نکات ۱۳۸

پانچواں باب: ائمہ طاہرینؑ بنی امیہ کے دور میں
۱۴۵ ۔ ۲۰۳

اموی حکومت کی خصوصیات اور سیاسی روش ۱۴۷
تمہید ۱۴۷
بنی امیہ کے متعلق حضرت علیؑ کی پیش گوئی ۱۴۹
صلح امام حسنؑ اور اس کے اسباب و نتائج ۱۵۶
امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے زمانے کا فرق ۱۵۷
شرائط صلح ۱۵۹
سوال و جواب ۱۶۱
قیام عاشورا اور اس کے اسباب و نتائج ۱۶۳

امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ ۱۶۳
کسی تحریک کے مقدس ہونے کی شرائط ۱۶۴
قیام حسینی کے اہم اسباب ۱۶۶
حسینی جدوجہد میں اہل بیتؑ کا کردار ۱۷۰
حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا کردار ۱۷۲
قیام حسینی کو زندہ رکھنے کا فلسفہ ۱۷۴
عاشورا کے تاریخی شعار ۱۷۵
قیام امام حسینؑ کے نتائج ۱۷۸
امام سجادؑ اور امام باقرؑ کی حیات مبارکہ ۱۸۶
امام سجادؑ کی حیات مبارکہ ۱۸۶
امام محمد باقرؑ کی حیات مبارکہ ۱۹۱
مختلف معصومین علیہم السلام کی سیرت کا ایک جائزہ ۱۹۳
بحث کے چیدہ نکات ۱۹۶

چھٹا باب : ائمہ طاہرینؑ بنو عباس کے دور میں

۲۰۵ ـ ۲۶۰

بنو عباس کا دور حکومت ۲۰۷
بنی ہاشم کے بزرگوں کا خفیہ اجلاس ۲۰۷
بنو عباس نے لوگوں کی ناراضگی کا فائدہ اٹھایا ۲۰۹
عباسی حکومت کی روش اور خصوصیت ۲۱۳
امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کی حیات مبارکہ ۲۱۶
امام جعفر صادقؑ کی حیات مبارکہ ۲۱۶

امام موسیٰ کاظمؑ کی حیاتِ مبارکہ ۲۲۰
امام مختلف زندانوں میں ۲۲۲
امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کے اسباب ۲۲۵
امام علی رضاؑ سے امام عصرؑ تک ائمہ کی حیاتِ مبارکہ ۲۲۷
امام علی رضاؑ کی حیاتِ مبارکہ ۲۲۷
امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کا مسئلہ اور تاریخ کے بیانات ۲۲۸
مامون کے اقدام کا محرک ۲۲۹
مفروضوں کی تحقیق ۲۳۳
مسلمات تاریخ ۲۳۶
سوال و جواب ۲۳۸
امام محمد تقیؑ کی حیاتِ مبارکہ ۲۴۱
امام علی نقیؑ کی حیاتِ مبارکہ ۲۴۲
امام حسن عسکریؑ کی حیاتِ مبارکہ ۲۴۴
امام مہدیؑ کی حیاتِ مبارکہ ۲۴۸
عظیم انتظار کی خصوصیات ۲۵۱
بحث کے چیدہ مطالب ۲۵۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اگلی قوموں کی زندگی کی تحقیق اور سبق آموزی کے لیے تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے کیونکہ اس طرح بہت سے تلخ و شیریں واقعات کی روشنی میں انسان اپنی کامیابی کے راستوں کا انتخاب کرسکتا ہے اور تاریخی واقعات کا تنقیدی تجزیہ کرسکتا ہے۔ امام علی علیہ السلام کے بقول اس طرح انسان طول تاریخ کو حاصل کر لیتا ہے اور اگلی قوموں ساتھ زندگی بسر کرسکتا ہے نیز اُن کی اچھائیوں اور برائیوں سے سبق سیکھ سکتا ہے۔

اس سیر و سفر میں جو چیز زمانی ارتقاء کے لحاظ سے قابل توجہ قرار پاتی ہے وہ تاریخی واقعات کی حقیقی نقشہ کشی ہے۔ اس نقشہ کشی سے جہاں گزشتہ قوموں کے حالات معلوم ہوتے ہیں وہاں انسان آئندہ کے لیے اپنی آبرومندانہ اور شرافت مندانہ زندگی کے لیے لائحہ عمل بھی مرتب کرسکتا ہے۔

علاوہ ازیں تاریخ اسلام کے مطالعے سے انسان سرچشمہ وحی سے نیز اسلام سے اور مسلمان قائدین کی پُرافتخار زندگی اور مسلمانوں کے انفرادی و اجتماعی معاملات کی اصلاح کے لیے اُن کی جدوجہد سے آگاہ ہوتا ہے۔

۱۹۹۸ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو استاد شہید مطہری کے بیان کردہ زیادہ سے زیادہ مطالب اس میں شامل کیے گئے۔ اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت جناب سید سعید روحانی نے اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ استاد شہید کے اقوال بلاکم و کاست پیش کیے جائیں چنانچہ اُنھوں نے اصلی متون کی طرف رجوع کیا تاکہ امانت کے تمام تقاضے پورے ہوسکیں۔

امید ہے کہ طالب علم اور تاریخ کے شائقین اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے اور تاریخ اسلام کے پُرافتخار مباحث سے روشناس ہوں گے۔

ہم استاد شہید مطہری کے درجات کی بلندی کے لیے نیز اس کتاب کو مرتب کرنے والے اور اُن کے معاونین کی توفیق و سعادت کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہیں۔

مدیریت تحقیق و تدوین متون درسی

قارئین سے چند باتیں

عزیزان من! یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں "بنیادی مباحث" بیان کئے گئے ہیں یعنی تاریخ کا مفہوم، قرآن میں تاریخ کا فلسفہ، تاریخ کی حرکت کے عوامل، تاریخ کی اہمیت، تاریخ نگاری اور چند مسلمان مورخین کا تعارف، تاریخ نگاری کی اقسام اور عرب و ایران میں اسلام کے فروغ کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں "رسول اکرم ﷺ کی حیات اور سیرت" نیز آنحضرت ﷺ کی شخصیت اور آپ کے اخلاق عالیہ پر بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں آنحضرت ﷺ کی خصوصیات، اسلام میں قیادت اور قائد کی شرائط، آنحضرت ﷺ کی بعثت، ہجرت اور آپ کے غزوات، حجۃ الوداع اور غدیر خم کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ نیز اسلام کی کامیابی اور اس کے فروغ کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے باب میں سقیفہ کے واقعات، خلفائے ثلاثہ کی فتوحات نیز اسلام کے ایران پر اور ایران کے اسلامی تمدن پر اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عثمانؓ کے طرز حکومت، لوگوں کے ردعمل اور حضرت عثمانؓ کے قتل میں معاویہ کے کردار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں حضرت علیؑ کی حکومت، سابقہ خلفاء پر آپ کی تنقید اور اُن کے عہد میں آپ کی خاموشی کی وجوہات بتائی گئی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت علیؑ کے سیاسی مخالفین کے کردار اور آپ کی حکومت کو درپیش مشکلات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں "بنی امیہ کے دور میں ائمہ طاہرینؑ کا کردار" پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں اسلامی حکومت پر بنی امیہ کے قبضے کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور بنی امیہ کی سیاسی چالوں، صلح امام حسنؑ کے اسباب اور امام حسنؑ و امام حسینؑ کے عہد کے معروضی حالات پر گفتگو کی گئی ہے اور امام حسینؑ کے قیام و انقلاب کے بنیادی محرکات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور کربلا میں اہلبیتؑ بالخصوص حضرت زینب کبریٰؑ کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس باب میں امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کی زندگی کے چند گوشوں پر بحث کی گئی ہے اور ائمہ طاہرینؑ کی سیرت کے ظاہری اختلاف کے فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آخری باب میں "بنو عباس کے دور میں ائمہ طاہرینؑ کا کردار" پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں بنو عباس کے برسرِاقتدار آنے کی وجوہات، اس دور میں امام جعفر صادقؑ کے ردِعمل اور عباسی حکومت کی سیاسی چالوں، امام جعفر صادقؑ و امام موسیٰ کاظمؑ کے دور کے سیاسی و سماجی حالات، امام موسیٰ کاظمؑ کو گرفتار اور قید کرنے کے اسباب، امام علی رضاؑ کی ولی عہدی اور آپ کی اس سے دستبرداری کے تاریخی مسئلے کی تحقیق، امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ، امام حسن عسکریؑ اور امام مہدیؑ کی حیاتِ مبارکہ کے چیدہ چیدہ حالات اور قیام مہدیؑ کے انتظار کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تدوین میں درج ذیل نکات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

(۱) اس کتاب کو استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی ساٹھ کتابوں اور اُن کی تقریر کی کیسٹوں سے جمع کیا گیا ہے۔

(۲) استاد شہید کی کتابوں کی روشنی میں تاریخ اسلام کے مطالب کو مدون کیا گیا ہے جبکہ مطالب کے اجمال اور تفصیل میں موضوعات کی اہمیت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

(۳) کتاب کے حجم کو مناسب رکھنے کے لیے مطالب کے تکرار سے احتراز کیا گیا ہے اور نسبتاً کم اہم واقعات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور حوالہ جات کو حاشیے میں لکھا گیا ہے۔

(۴) اس کتاب کو مختلف کتابوں سے مدون کیا گیا ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ کسی واقعے کی مکمل تفصیل اِس میں موجود نہ ہو چنانچہ قارئین محولہ کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

(۵) مطالب کو نقل کرنے میں پوری احتیاط برتی ہے اور جہاں ہم نے استاد شہید کے کچھ مطالب کو حذف کیا ہے وہاں نقطے لگا کر اسے واضح کر دیا ہے اور جہاں ہم نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا ہے اس عبارت کو ( ) قوسین میں لکھا ہے۔

(۶) بعض مقامات پر استاد شہید کے بیان کردہ مطالب کی وضاحت کے لیے ہم نے اپنی طرف سے چند جملوں کا اضافہ اس لیے کیا ہے تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اور متن کا تسلسل قائم رہے۔

(۷) کتاب کے حاشیے راقم نے لکھے ہیں اور عنوانات بھی قائم کئے ہیں۔ ہر بحث کے آخر میں استاد شہید کے متن کو مدنظر رکھ کر راقم نے "بحث کے چیدہ نکات" کی سرخیاں قائم کی ہیں۔

(۸) نہج البلاغہ سے اقتباسات کے لیے ہم نے استاد شہید کے بیان کردہ حوالوں کے علاوہ دیگر کتب کے حوالے بھی پیش کئے ہیں۔

میں آخر میں استاد شہید مرتضیٰ مطہری کے درجات کی بلندی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اور علامہ محقق سید مرتضیٰ عسکری صاحب کی زحمتوں پر اُن کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود اس کتاب پر نظر ثانی فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

علاوہ ازیں حجۃ الاسلام جناب نجف لک زایی، حجۃ الاسلام جناب علی رضا امینی، حجۃ الاسلام جناب سید علی رضا صدر، حجۃ الاسلام جناب محمد خردمند اور اُن تمام احباب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تدوین میں میری مدد فرمائی۔ میں بارگاہ رب العزت میں اُن سب کی توفیقات میں اضافے کے لیے دست بدعا ہوں۔

سید سعید روحانی

۱۹۹۸ء

پہلا باب

بنیادی مباحث

ماہیت تاریخ

تاریخ نگاری اور چند مسلمان مؤرخین کا تعارف

اسلام کی جنم بھومی

mahdi.org

ماہیت تاریخ

(۱) تاریخ کا مفہوم

تین قسم کے علوم کا تاریخ سے قریبی تعلق ہے۔

(۱) **نقلی تاریخ:** دور حاضر کے حالات و واقعات کے مقابلے میں گزشتہ دور کے انسانوں کے حالات و واقعات کو تاریخ کہا جاتا ہے جبکہ دور حاضر کے حالات و واقعات حالیہ زمانے کی باتیں ہیں جو آئے دن اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ پھر جب یہ حالات و واقعات ماضی کا قصہ بنتے ہیں تو تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح علم تاریخ ماضی کے واقعات و حادثات اور اگلے لوگوں کے حالات، ان کے طرز حیات، فتوحات اور سیرت و عادات کے بیان سے عبارت ہے۔ علم تاریخ اس معنٰی میں اولاً جزئی ہے یعنی یہ لوگوں کے ذاتی معاملات کا علم ہے، کلیات یا قواعد وضوابط و روابط کا علم نہیں ہے۔ ثانیاً یہ ایک "نقلی" علم ہے، عقلی علم نہیں ہے۔ ثالثاً یہ "بودن" کا علم ہے "شدن" کا علم نہیں ہے۔[۱] رابعاً اس کا تعلق ماضی سے ہے حال سے نہیں۔ اس طرح کی تاریخ کو ہم "نقلی تاریخ" کہتے ہیں[۲] کیونکہ یہ نقل کی گئی ہوتی ہے۔

(۲) **علمی تاریخ:** گزرے ہوئے دور کے حالات و واقعات کے تجزیے کے ذریعے اس زمانے پر نافذ قوانین اور نظام کے سلسلے کو علمی تاریخ کہا جاتا ہے۔ نقلی تاریخ کے واقعات کو اس علم کے مقدمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ نقلی تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس مواد کی سی ہے جسے طبیعی علوم کا ماہر اپنی لیبارٹری میں رکھ کر ان کا تجزیہ کرتا ہے اور وہ تاریخی حوادث کے علل و معلول کے سلسلے کا مطالعہ کر کے عمومی قواعد وضوابط کو دریافت کرتا ہے اور ان قواعد کو ماضی اور حال دونوں پر منطبق کرتا ہے۔

تحلیل و تجزیے کے اس علم کو "علمی تاریخ" کہا جاتا ہے۔ اگرچہ علمی تاریخ کا موضوع ماضی کے

۱۔ ☆ تہذیب و تمدن کے آغاز و زوال کے اسباب، سماجی زندگی کے حالات اور معاشروں پر حکم فرما کلی قوانین کو جو ان کی تعمیر سے متعلق ہوتے ہیں اصطلاح میں معاشروں کے "بودن" کے قوانین کہا جاتا ہے جبکہ ایک دور سے دوسرے دور اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف سفر ارتقاء کے اسباب کو معاشروں کے "شدن" کے قوانین کہا جاتا ہے یعنی "زندگی اور سکون" سے متعلق باتوں کو بودن جبکہ تکامل اور حرکت سے متعلق باتوں کو شدن کہا جاتا ہے۔ (رضوانی)

۲۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۳۶۷۔ جامعہ و تاریخ ص ۷۰۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۳۷۵۔ جامعہ و تاریخ ص ۸۱

واقعات ہوتے ہیں لیکن اس سے قواعد کا استنباط کیا جاتا ہے ان کا تعلق صرف ماضی سے نہیں بلکہ حال و مستقبل سے بھی ہوتا ہے اسی لیے تاریخ کا علم بہت فائدہ مند ہوتا ہے اور علمی تاریخ کو انسان کی شناخت کا اہم حوالہ قرار دیا جاتا ہے اور ان کے قواعد کو مستقبل پر منطبق کیا جاتا ہے۔

علمی تاریخ کا تعلق نقلی تاریخ کی طرح ماضی سے ہوتا ہے نہ کہ حال سے اور یہ "ہونے" کا علم ہے "ہوجانے" کا نہیں البتہ تاریخ کے برعکس یہ کلی ہے، جزئی نہیں اور عقلی ہے، محض نقلی نہیں۔ علمی تاریخ دراصل معاشرہ شناسی ہے مگر اس میں معاشرہ شناسی کا موضوع ماضی اور حال دونوں زمانوں پر محیط ہوتا ہے۔

(۳) **فلسفۂ تاریخ:** فلسفۂ تاریخ معاشروں کی تبدیلی کا علم ہے یعنی ایک معاشرہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں کیسے داخل ہوتا ہے اور اس تبدیلی کے پیچھے کون سے قوانین کارفرما ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ معاشروں کے "شدن" کا نہیں بلکہ "بودن" کا علم ہے...

(معاشرہ) ایک زندہ موجود ہے اور اس میں دو طرح کے قوانین پائے جاتے ہیں۔ ایک کو "زندگی کے قوانین" اور دوسرے کو "ترقی و کمال کے قوانین" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مختلف قسم کے تمدنوں کی پیدائش، ان کے زوال اور حیات اجتماعی کے جو اسباب ہوں اور جو تمام معاشروں کی تبدیلی کے لیے لازمی ہوں ایسے کلی قوانین کو ہم معاشروں کے "ہونے" کا اصطلاحی نام دیتے ہیں اور ایسے اسباب جو معاشرے کی ایک حالت سے دوسری حالت میں ارتقاء کا باعث بنیں جو معاشرے کو ایک دور سے دوسرے دور میں داخل کریں اور معاشرے کو ایک (فاسد) نظام سے نکال کر (بہتر) نظام میں لے آئیں ایسے قوانین کو ہم معاشرے کے "ہوجانے والے" قوانین کہتے ہیں...

پس تیسرے معنیٰ میں علم تاریخ معاشرے کے ارتقاء کا علم ہے کہ معاشرہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں کیسے داخل ہوتا ہے۔ اس مفہوم میں علم تاریخ زندگی کے کسی خاص مرحلے یا کئی مراحل کا علم نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مسائل علمی تاریخ کے مسائل سے مخلوط نہ ہونے پائیں اسی لیے ہم انہیں فلسفۂ تاریخ کا نام دیتے ہیں۔ غالباً وہ مسائل جن کا تعلق علمی تاریخ یعنی معاشرے کی غیر ارتقائی حرکت سے ہے وہ فلسفۂ تاریخ کے ان مسائل سے متعلق ہیں جن کا تعلق معاشرے کی ارتقائی حرکت سے ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے بہت سے شبہات جنم لیتے ہیں۔

علمی تاریخ کی طرح فلسفۂ تاریخ کلی ہے، جزئی نہیں ہے اور عقلی ہے نقلی نہیں ہے لیکن علمی تاریخ کے برعکس یہ معاشروں کے "ہونے" کا نہیں "ہوجانے" کا علم ہے۔ علمی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ فلسفۂ تاریخ کا تعلق صرف ماضی سے نہیں ہوتا۔ یہ واقعات کا علم ہے جو ماضی سے شروع ہو کر مستقبل تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح کے مسائل کے لیے زمانے کو "ظرف" قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ان مسائل کی مختلف جہات میں سے ایک جہت کی صورت گری ہوتی ہے۔[1]

۱۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۳۶۸ ۔ جامعہ و تاریخ ص ۷۱

قرآن میں تاریخ کا فلسفہ

قرآن "اتفاقات" کو اصل تسلیم نہیں کرتا بلکہ صراحتاً واقعات کو اصل کا درجہ دیتا ہے لہٰذا اگر تاریخ کو واقعات پر مبنی قرار دیا جائے اور اس کے ساتھ یہ مانا جائے کہ "تاریخ کے واقعات" انسان کے اختیار سے باہر ہیں اور انسان ان واقعات میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا... تو پھر تاریخ سے سبق سیکھنے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے... اگر برائی اور فساد کو تاریخ کے موثر عوامل کا درجہ دیا جائے تو تاریخ انسان کی استاد تو ہوگی مگر بہت برا استاد قرار پائے گی۔ اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ انسان تاریخ کا مطالعہ ہی نہ کرے... لیکن اگر تاریخ کو "اتفاقات کے مجموعہ" کی بجائے واقعہ مانا جائے اور اگر وہ واقعہ بھی جبر محض نہ ہو اور اس میں انسانی کردار شامل ہو اور انسانی کردار، عوامل شر و فساد پر منحصر نہ ہو اور زیادہ تر عوامل صلاح... تقویٰ، پاکیزگی اور حق و ایمان کے حامل ہوں تو اس صورت میں تاریخ کو نہ صرف استاد سمجھا جائے گا بلکہ اسے بہترین استاد کا درجہ دیا جائے گا۔

قرآن کی نظر میں[1] صلاح... تقوی اور اخلاص تاریخ میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ آخری کردار اور آخری فتح ہمیشہ حق کی ہی ہوا کرتی ہے۔[2]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید، تاریخ کو انفرادی نظر سے دیکھتا ہے یا اجتماعی نظر سے؟ کیا قرآن مجید کا نظریہ یہ ہے کہ انفرادی زندگی کو دوسروں کے لیے عبرت کا سامان بنا کر پیش کیا جائے یا اس کی نظر اجتماعی زندگی پر بھی ہے یا کم از کم اس کے سامنے اجتماعی زندگی بھی ہے؟

دوسرے مفروضے کی بنیاد پر کیا قرآن مجید سے اس بات کا استنباط کیا جا سکتا ہے کہ افراد سے ہٹ کر خود معاشرہ بھی زندگی اور موت، شخصیت، شعور و ادراک، وجدان، ذوق، احساس اور قوت رکھتا ہے یا نہیں؟ اور اس مفروضے کی بنیاد پر کیا قرآن مجید سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ معاشروں اور قوموں پر سنتیں اور روشیں اور مخصوص قوانین لاگو ہوتے ہیں یا نہیں؟

ان تینوں سوالات کا جواب اثبات میں ہے۔[3]

قرآن کریم تاریخ کے کچھ عبرت انگیز واقعات دوسری قوموں کو متنبہ کرنے کے لیے بیان کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ
وہ ایک امت تھی جو گزر چکی یعنی وہ ایک معاشرہ تھا جو کہ رخصت ہوگیا۔ ان کی کمائی ان کے لیے تھی اور تمہاری کمائی تمہارے لیے ہے۔ تم سے ان کے اعمال کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا (تم صرف اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہو)۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۳۴ و ۱۴۱)

۱۔ سورۂ مجادلہ: آیت ۲۱۔ سورۂ صافات: آیت ۱۷۳

۲۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۳۶۸۔ جامعہ و تاریخ ص ۱۷

۳۔ تفسیر المیزان ج ۴، ص ۱۰۲۔ ج ۷، ص ۳۳۳۔ ج ۸، ص ۸۵۔ ج ۱۰، ص ۱۷، ۷۳۔ ج ۱۸، ص ۱۹۱

قرآن کریم نے کئی مقامات پر اگلی قوموں کی زندگی اور عرصۂ حیات پر گفتگو کی ہے۔ وہ فرماتا ہے: وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ہر قوم کی زندگی کی ایک مدت ہوتی ہے۔ پس جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔

(سورۂ اعراف: آیت ۳۴)

قرآن کریم اس گمان کا سختی سے انکار کرتا ہے کہ افکار و ارادہ نیز بے قاعدہ و بے حساب مشیت، مقدرات تاریخ کو دگرگوں کرتی ہے اور فرماتا ہے: ...فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ○ کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے ان کے ساتھ اس سے ہٹ کر کوئی اور طریقہ برتا جائے گا؟ (ایسا ممکن نہیں ہے) تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تمھیں اللہ کی روش میں ہرگز کوئی تغیر و تبدل نظر نہیں آئے گا۔

(سورۂ فاطر: آیت ۴۳)

قرآن کریم کہتا ہے کہ لوگ تاریخ سے متعلق ''سنت الٰہی'' کا مطالعہ کر کے اپنی تقدیر خود بنا سکتے ہیں، چاہیں تو اچھی تقدیر بنائیں، چاہیں تو بری تقدیر بنائیں... یعنی دنیا عمل اور ردعمل کا دوسرا نام ہے۔ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے جبکہ تاریخ یقینی شرافت کے ایک سلسلے کا نام ہے۔ اس سلسلے میں انسان کی آزادی اور اختیار کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ...إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ...اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے آپ کو نہیں بدلتی۔[1] (سورۂ رعد: آیت ۱۱)

(۲) تاریخ میں تبدیلیاں

انسان اور بعض جانوروں کی اجتماعی زندگی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جانوروں کی زندگی میں جمود اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ موریس مٹرلنک Maurice Maeterlinck کے بقول — بشرطیکہ اسے صحیح مانا جائے — ''جانوروں کے تمدن میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی جبکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بہت تیزی سے ہوتی ہے'' یعنی تدریجی طور پر اس میں تیزی آجاتی ہے لہٰذا انسان کی اجتماعی زندگی کی تاریخ کئی ادوار پر محیط ہے جو مختلف نظریات کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

سوال یہ ہے کہ دوسرے جانداروں کی زندگی میں یہ تبدیلی کیوں نہیں ہوتی؟ انسان میں اس تبدیلی کا بنیادی سبب جو انسانی زندگی کو ترقی دیتا ہے وہ جانوروں میں کیوں نہیں پایا جاتا؟ یہ تبدیلی اور ترقی کن قوانین کی مرہون منت ہے یا اصطلاحاً یہ ارتقاء کس میکانزم کے تحت ہوتا ہے؟

۱۔ قیام و انقلاب مہدیؑ از دیدگاہ فلسفۂ تاریخ ص ۱۷ ۔ ۱۹ ۔ خاتمیت ص ۹۳ ۔ ۹۸

تاریخ کی حرکت کے عوامل [1]

"فلسفۂ تاریخ" کی کتابوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے کہ تاریخ کی حرکت کیا ہے اور عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اس گفتگو کو کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو غلط نظریات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ عام طور پر حسب ذیل اسباب کو تاریخ کی حرکت کے عوامل قرار دیا جاتا ہے۔

(۱) نسلی برتری کا نظریہ [2]

اس نظریے کے مطابق تاریخ کے ارتقاء کا بنیادی عامل چند اقوام ہیں یعنی چند اقوام ایسی ہوتی ہیں جن میں تہذیب و تمدن آفرینی کی صلاحیت دوسری اقوام کی نسبت زیادہ ہوتی ہے مثلاً شمالی اقوام کو جنوبی اقوام پر برتری حاصل ہے۔ شمالی اقوام نے تمدن کی پیشرفت میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے چنانچہ فرانس کے مشہور فلسفی کومت گوبینو Comte de Gobineau کا جو ایک صدی قبل ایران میں تین سال تک فرانس کے سفیر رہے یہی نظریہ تھا۔

(۲) جغرافیائی نظریہ [3]

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ فطری ماحول ہی تمدن وثقافت اور صنعت و حرفت کو پیدا کرتا ہے۔ معتدل آب و ہوا والے علاقوں کے لوگ بھی معتدل مزاج اور ذہین ہوتے ہیں۔

بوعلی سینا نے اپنی کتاب "القانون" کے ابتدائی صفحات میں فطری ماحول پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ قدرتی ماحول انسان کی فکر اور اس کے ذوق و احساسات پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق خون اور نسل تاریخی تبدیلیوں کا باعث نہیں بنتے بلکہ ماحول کی تبدیلی نسلوں کے مختلف ہونے کا موجب بنتے ہیں۔ سترہویں صدی کا فرانسیسی ماہر عمرانیات منتسکیو Montesquieu اسی نظریے کا حامی تھا۔ اُس نے اپنی کتاب "روح القوانین" The Spirit of the Laws میں اسی نظریے کا اثبات کیا ہے۔

(۳) ہیروز کا نظریہ [4]

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کی تبدیلیوں کے پیچھے "ہیروز" کا کردار ہوتا ہے۔ چنانچہ نابغۂ روزگار لوگ ہی اپنے زمانے میں علمی، سیاسی، اقتصادی، فنی اور اخلاقی تبدیلیوں کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق انسانوں کی اکثریت تخلیقی صلاحیتوں سے عاری ہوتی اور دوسروں کی ایجادات کو استعمال کرتی ہے۔

۱۔ اسلام و مقتضیات زمان ج ۲، ص ۹۳ ـ ۲۰۱

۲۔ فلسفۂ تاریخ ص ۳۲، ۳۵

۳۔ فلسفۂ تاریخ ص ۶۰، ۷۳

۴۔ فلسفۂ تاریخ ص ۴۸، ۵۵ـ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۲۹۶، ۲۹۸ـ جامعہ و تاریخ ص ۲۴۹، ۲۵۲

چند افراد ہی پورے معاشرے کی قیادت کرتے ہیں اور یہ لوگ موجد، مبدع اور جدید خیالات کے خالق ہوتے ہیں اور یہی لوگ تاریخ کے پہیے کو گردش دیتے ہیں اور معاشرے کو ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ مشہور انگریز فلسفی تھامس کارلائل Thomas Carlyle نے اپنی کتاب On Heroes, Hero-Worship میں اسی نظریے کو پیش کیا ہے اور اس نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے۔

(۴) نظریہ اقتصادی[۱]

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اقتصادیات تاریخ کو حرکت میں لاتی ہے۔ کسی بھی معاشرے کے اجتماعی اور تاریخی امور خواہ ان کا تعلق تہذیب سے ہو یا مذہب سے، چاہے وہ امور سیاسی ہوں یا فوجی و اجتماعی ان تمام معاملات میں اس قوم کی اقتصادیات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ معاشرے کی تبدیلی میں اقتصادیات کا مرکزی کردار ہوتا ہے اور اقتصادیات معاشرے کو زیر و زبر کر دیتے ہیں اور اقتصادیات ہی کسی معاشرے کو ارتقاء کی شاہراہ پر گامزن کرتے ہیں۔ نابغہ روزگار شخصیات جن کا ''ہیروز تھیوری'' میں تذکرہ کیا گیا ہے ان کی حیثیت اقتصادیات کی سیاسی اور اجتماعی ضروریات سے زیادہ نہیں ہوتی اور یہ ضروریات اپنی جگہ پیداواری اونچ نیچ کا معلول ہیں۔

کارل مارکس اور تمام مارکسیسٹ اور چند غیر مارکسیسٹ افراد بھی اس نظریے کے حامی ہیں۔ شاید یہ ہمارے دور کا مقبول ترین نظریہ ہے۔

(۵) نظریہ الٰہی[۲]

اس نظریے کے مطابق زمین پر جو بھی واقعات جنم لیتے ہیں اُن سب کا تعلق آسمانی احکام سے ہے۔ خدا کی حکمت سے یہ تبدیلیاں ہوتی ہیں لہٰذا جو چیز تاریخ کو حرکت میں لاتی ہے اور تبدیلی پیدا کرتی ہے وہ خدا کا ارادہ ہے۔ تاریخ، خدا کے مقدس ارادے کی مظہر ہے۔ چنانچہ مشہور پادری اور مؤرخ بوسوئہ کا یہی نظریہ تھا جو فرانس کے بادشاہ ''لوئی پانزدہم'' Louis XV کا معلم و مربی تھا۔

مذکورہ نظریات کا جائزہ

ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ اسباب میں سے کسی ایک کو تاریخ کا عامل محرک سمجھنا صحیح نہیں اور مذکورہ اسباب کی حیثیت ''خلط مبحث'' کی سی ہے جبکہ مذکورہ نظریات میں سے کوئی بھی نظریہ مکمل طور پر تاریخ کے پہیے کو گردش دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔

نسلی برتری کا نظریہ، معاشرتی شناخت کا ایک نظریہ ہے جو اس لحاظ سے قابل بحث ہے کہ کیا تمام

۱۔ فلسفہ تاریخ ص ۷۳، ۱۰۰

۲۔ فلسفہ تاریخ ص ۲۱، ۲۷

انسانی نسلیں موروثی عوامل کی وجہ سے یکساں صلاحیت کی حامل ہیں؟ اور کیا تمام نسلیں برابر ہیں؟

اگر تمام اقوام کو یکساں مان لیا جائے تو ہر نسل کو تاریخ کی حرکت میں شریک ماننا پڑے گا یا کم از کم یہ کہا جائے گا کہ سب نسلیں تاریخ کا رخ موڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اگر تمام نسلوں کو برابر مان لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ کچھ نسلوں نے تاریخ کے پہیے کو گردش دینے میں کردار ادا کیا تھا اور وہ تاریخ کو حرکت دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھیں تو یہ کہنا ٹھیک ہے مگر فلسفہ تاریخ کا راز پھر بھی راز ہی رہے گا۔

فرض کیجئے کہ ہم یہ مانیں کہ صرف ایک ہی نسل نے تاریخ کے پہیے کو گردش دینے میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور دوسری طرف ہم یہ مانیں کہ تاریخ کی حرکت میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور مشکل حل نہ ہوگی کیونکہ یہ معلوم نہیں ہے کہ آخر انسان کی زندگی یا انسانوں کی نسل ہی تبدیلی کے عمل سے کیوں گزر رہی ہے اور حیوان کی زندگی اس طرح کیوں نہیں ہے؟ یہ راز کہاں سے کھلے گا کہ ایک نسل تاریخ کو حرکت دیتی ہے یا تمام نسلیں تاریخ کو حرکت دیتی ہیں؟ اس سے تاریخ کو حرکت میں لائے جانے کا راز نہیں کھل سکتا۔

اسی طرح "جغرافیائی نظریہ" بھی اپنی جگہ معاشرہ شناسی کے لیے مفید ہے کہ کچھ علاقوں کی آب و ہوا عقلی، فکری، ذوقی اور جسمانی نشو و نما کے لیے موثر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کی آب و ہوا انسان کو حیوانی حد یا حیوانی حد کے قریب رکھتی ہے جبکہ کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جو انسان اور حیوان کے درمیان فاصلہ بڑھا رہے ہیں۔

اس نظریے کے مطابق تاریخ کی حرکت صرف چند علاقوں اور ملکوں تک محدود ہے اور باقی علاقوں میں تاریخ جامد ہے اور حیوان کی طرح سے ایک مقام پر ٹھہری ہوئی ہے جبکہ اصل سوال تو اپنی جگہ پھر بھی قائم ہے مثلاً شہد کی مکھیاں اور دوسرے اجتماعیت پسند جان دار مختلف ممالک میں موجود ہیں آخر ان کی تاریخ متحرک کیوں نہیں ہے لہٰذا اس نظریے کے مطابق یہ وضاحت کی جائے کہ دو قسم کے اجتماعیت پسند جان داروں میں سے ایک کی تاریخ ایک ہی مقام پر رکی ہوئی ہے جبکہ دوسرے کی تاریخ لحہ بہ لحہ حرکت کر رہی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

"الٰہی نظریہ" تمام نظریات میں سے انتہائی بودا نظریہ ہے۔ کیا صرف تاریخ ہی مشیت الٰہی کی جلوہ گاہ ہے؟ جبکہ پوری کائنات آغاز سے انجام تک اسباب، موجبات اور موانع سمیت مشیت الٰہی کی جلوہ گاہ ہے۔ مشیت الٰہی کی نسبت کائنات کے تمام اسباب کی طرف یکساں ہے۔ جس طرح انسان کی لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی زندگی مشیت الٰہی کی جلوہ گاہ ہے اسی طرح شہد کی مکھیوں کی ایک جگہ پر رکی ہوئی زندگی بھی مشیت الٰہی کی مظہر ہے۔

سوال یہ ہے کہ مشیت الٰہی نے انسان کی زندگی کو کس نظام سے پیدا کیا ہے؟ اور اس میں ایسا کون سا راز پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے وہ لحہ بہ لحہ تبدیل ہو رہی ہے جبکہ دوسرے جان داروں کی زندگی اس راز سے محروم ہے؟

تاریخ کی حرکت کے بارے میں مارکسسٹوں کا ''اقتصادی نظریہ'' بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس میں فنی اور اصولی پہلو نظر کو انداز کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اسے ایک اصول کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اقتصادی نظریے کو جس طرح سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے مادی تاریخ کی ماہیت و حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے مگر دوسرے معاملات اس جوہر تاریخی کے لیے ''اعراض'' کی مانند ہیں۔

اقتصادی نظریے کے مطابق ''اگر'' معاشرے کی اقتصادی بنیادوں میں تبدیلی پیدا ہو تو معاشرے کے دوسرے امور میں بھی لازمی طور پر تبدیلی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ تمام باتیں ''اگر'' کے ساتھ مشروط ہیں۔ اصل سوال پھر بھی اپنی جگہ باقی ہے کہ اگر اقتصادیات معاشرے کی بنیاد ہیں اور بنیاد کے بدل جانے سے پورا معاشرہ بدل جائے گا تو سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جو معاشرے کی بنیاد میں تبدیلی لاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ''بنیاد'' پر کھڑی ''عمارت'' میں تبدیلی واقع ہوتی ہے؟

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقتصادیات کا بنیاد ہونا اس کے عامل محرک ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جی ہاں! اس نظریے کے حامی جب اقتصادیات کو جو کہ معاشرے کی بنیاد ہے، تاریخ کے عامل محرک کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور مادیت تاریخ کو حرکت تاریخ کے لیے کافی سمجھتے ہیں تو درحقیقت وہ بنیاد اور اس پر قائم عمارت کے اندرونی تضاد کو بیان کر رہے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تاریخ کا عامل محرک اندرونی اور بیرونی تضاد ہے یعنی بنیاد اور بنیاد پر قائم عمارت کا تضاد ہی عامل محرک ہے یعنی ''سامان تجارت اور تجارتی تعلقات'' کا اختلاف تاریخ کے لیے عامل محرک کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر مارکسسٹ اس مسئلے کو اس طرح سے بیان کریں تو مسئلہ صحیح صورت میں پیش ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ''اقتصادیات تاریخ کو حرکت دیتی ہے'' کا مقصد یہ ہے کہ تمام حرکات کی اصل علت اندرونی تضاد ہوتا ہے اور ذرائع پیداوار اور پیداواری روابط کا اندرونی تضاد تاریخ کو حرکت دیتا ہے۔

واضح رہے کہ ہماری گفتگو کا مقصد اصلاح ہے۔ ہمارا مقصد مذکورہ نظریات پیش کرنے والوں کا مافی الضمیر کا بیان کرنا نہیں ہے۔ ہیروز کا نظریہ'' خواہ صحیح ہو یا غلط ''فلسفہ تاریخ'' سے براہ راست تعلق رکھتا ہے یعنی عامل محرک تاریخ سے یہ مسئلہ مربوط ہے۔[1]

(۳) تاریخ کی اہمیت

(۱) تاریخ شناخت کا سرچشمہ ہے

تاریخ، انسان کی شناخت کا اہم ترین سرچشمہ ہے۔ معاصر دنیا اسے بہت زیادہ اہمیت دے رہی ہے

۱۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۳۸۸، ۳۹۳۔ جامعہ و تاریخ ص ۲۳۸، ۲۳۵

اور قرآن کریم نے بھی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ طبیعت [۱] اور عقل و دل کے علاوہ قرآن کریم شناخت کے ایک اور منبع کا بھی قائل ہے جسے تاریخ کہا جاتا ہے۔ [۲]

قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں لوگوں کو گزشتہ اقوام کی زندگی کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اسے حصول علم کا ایک ذریعہ بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق سلسلہ واقعات و حوادث کی وجہ سے تاریخ بشر میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

عزت ہو یا ذلت، کامیابی ہو یا ناکامی، فتح ہو یا شکست، خوش بختی ہو یا بدبختی ان سب کے لیے دقیق اور منظم سبب موجود ہوتا ہے اور ان کی پہچان کے ذریعے زمانے کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔ اس طرح اپنی اور دوسرے لوگوں کی سعادت کا سامان فراہم کیا جا سکتا ہے۔ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ [۳] تم سے پہلے بہت سے واقعات گزر چکے ہیں لہٰذا تم زمین میں چل پھر کر اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھو جنھوں نے وحی کی تکذیب کی تھی کہ ان کا کیا انجام ہوا۔ [۴]

(سورۂ آل عمران: آیت ۱۳۷)

حضرت علیؑ، امام حسن مجتبیٰؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے فرزند! قوموں کے واقعات اور اُن کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرو اور ان سے سبق حاصل کرو...

"اے فرزند! اگرچہ میں نے اتنی عمر نہیں پائی جتنی اگلے لوگوں کی ہوا کرتی تھیں پھر بھی میں نے اُن کی کارگزاریوں کو دیکھا، اُن کے حالات و واقعات میں غور کیا اور اُن کے چھوڑے ہوئے نشانات میں سیر و سیاحت کی، یہاں تک کہ گویا میں بھی انہی میں ایک ہو چکا ہوں بلکہ ان سب کے حالات و واقعات جو مجھ تک پہنچ گئے ہیں اُن کی وجہ سے ایسا ہے کہ گویا میں نے اُن کے اول سے لے کر آخر تک کے ساتھ زندگی گزاری ہے...

۱۔ استاد شہید نے مجموعہ آثار ج ۱۳، ص ۳۷۲۔ ۳۷۳ میں طبیعت کو "شناخت" کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔

۲۔ مجموعہ آثار ج ۱۳، ص ۳۸۳۔ مسئلہ شناخت ص ۷۷، ۷۸

اس مسئلے میں علامہ اقبال کی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ انھوں نے تجدید فکریات اسلام پر سیر حاصل گفتگو کی ہے البتہ دوسروں نے بھی اس مسئلے کو بیان کیا ہے مگر میں نے "تاریخ شناخت کا ایک منبع ہے" کو پہلی بار علامہ کی کتاب میں دیکھا تھا۔

☆ (ڈاکٹر وحید عشرت نے The Reconstruction of Religious Thought in Islam کا "تجدید فکریات اسلام" کے نام سے اردو ترجمہ کیا ہے اور یہ کتاب کراچی یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کے نصاب میں شامل ہے)۔ رضوانی

۳۔ اس مفہوم کو حسب ذیل مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ انعام: آیت ۱۱۔ سورۂ نمل: ۶۹۔ سورۂ عنکبوت: ۲۰۔ سورۂ روم: ۴۲۔ سورۂ مومن: ۸۲۔ سورۂ محمد: ۱۰

۴۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۷۰۔ انسان و ایمان ص ۴۳۔ ۴۷

تم تاریخ کا مطالعہ کرو اور قوموں کے حالات اور معاشروں میں آنے والی تبدیلیوں پر اچھی طرح اتنا غور کرو کہ تم اس آنکھ کی مانند بن جاؤ جس نے دنیا کے آغاز سے لے کر دنیا کے انجام تک کا مشاہدہ کیا ہو۔[۱]

(۲) مطالعہ تاریخ

علم تاریخ ان تینوں معانی کے لحاظ سے انتہائی فائدہ مند ہے کیونکہ لوگوں کے حالات زندگی سے انسان عبرت حاصل کرتا ہے۔ تاریخ کے واقعات کا مطالعہ حرکت آفریں، جہت بخش اور تربیت کا موجب بن سکتا ہے البتہ اس کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ تاریخ کن لوگوں کی ہے اور ان کی زندگی کے مطالعے سے کون سی نئی اور مفید باتیں سامنے آسکتی ہیں۔

ہر شخص دوسرے کی عادات و اطوار سے متاثر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک انسان اپنے جیسے انسانوں کی عادات و اطوار سے متاثر ہوتا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ تاریخی کرداروں سے بھی اتنا ہی متاثر ہوجائے اور اگر کوئی حکیم لقمان کی طرح صاحب نظر ہو تو وہ بے ادبوں سے بھی ادب سیکھ سکتا ہے تاکہ اُن کی طرح نہ بن جائے۔ اسی طرح انسان لوگوں کے برے انجام سے عبرت حاصل کر کے بھلائی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔

تاریخ اس فلم کی مانند ہے جو ماضی کو حال میں بدل کر پیش کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے ان لوگوں کے حالات بیان کئے ہیں جن کی زندگی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے اور کئی مقامات پر قرآن کریم نے انسانوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان شخصیات کو اپنے لیے ''اسوہ'' قرار دیں۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ... رسول خدا ﷺ کی شخصیت میں تمہارے لیے بہترین نمونہ عمل موجود ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۲۱)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ عمل ہے۔[۲] (سورۂ ممتحنہ: آیت ۴)

اخلاقی عوامل اتنے موثر ہیں کہ قرآن کریم نے درس عبرت کے لیے تاریخ کو شناخت کا منبع قرار دیا ہے۔[۳]

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۳، ص ۳۸۳۔ مسئلہ شناخت ص ۷۷، ۷۹
۲۔ مجموعہ آثار ج ۲ ص ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ جامعہ و تاریخ ص ۷۷۔ ۷۸
۳۔ قیام و انقلاب مہدی از دیدگاہ فلسفۂ تاریخ ص ۴۹

تاریخ نگاری اور چند مسلمان مؤرخین کا تعارف

اسلامی تاریخ کی تدوین میں بہت سی قوموں نے حصہ لیا ہے۔ اس میں اندلسی (مثلاً ابن عبدالبر، ابن بشکوال اور ابن آبار) مصری (مثلاً مقریزی اور جمال الدین قفطی) دمشقی (مثلاً ابن عساکر اور صفدی) عراقی (مثلاً خطیب بغدادی، عبدالرحمن ابن جوزی، سبط ابن جوزی، ایرانی الاصل (ابن خلکان اربلی) اور تیونسی (مثلاً ابن خلدون)[1] شامل ہیں۔ مسلمان مؤرخین میں ابو حنیفہ دینوری متوفی ۲۸۲ھ ... ابن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ ... ابن جریر طبری ۳۱۰ھ ... بلاذری متوفی ۲۷۹ھ ابو الفرج اصفہانی اموی الاصل متوفی ۳۵۶ھ اور حمزہ اصفہانی متوفی ۳۵۰ھ بھی دکھائی دیتے ہیں۔[2]

ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں اسلام کے قرون اولیٰ کے ان مؤرخین کا ذکر کیا ہے جنھیں اصطلاح میں "موالی" کہا جاتا تھا... کچھ افراد کے متعلق اُس نے تصریح کی ہے کہ اُن کا تعلق ایران سے تھا من جملہ مشہور مؤرخ واقدی متوفی ۲۰۷ھ، ابو القاسم حماد بن سابور دیلمی متوفی ۱۵۶ھ، ابو جناد بن واصل کوفی، ابو الفضل محمد بن احمد بن عبدالحمید کاتب اور علان شعوبی کلینی رازی وغیرہ کے۔[3]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مسلمان مؤرخین گزرے ہیں۔ شاید تاریخ کے موضوع پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے اتنا کسی اور موضوع پر نہیں لکھا گیا۔[4]

تاریخ نگاری کی اقسام

اسلام میں تاریخ نگاری کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں۔ تاریخ نگاری کی ایک قسم کسی خاص شخصیت کی سیرت و تاریخ نویسی ہے (مثلاً سیرت نبوی اور بعض سلاطین کے حالات پر لکھی جانے والی کتابیں) شہروں کی تاریخ نویسی بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے (مثلاً تاریخ قم) اور ملکوں کی تاریخ (مثلاً تاریخ مصر) اور تاریخ دمشق وغیرہ۔ مختلف علوم کی تاریخ یعنی کسی ایک فن سے تعلق رکھنے والے افراد کی تاریخ بھی اسی قسم سے ہے۔

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۴۵۱
۲۔ ایضاً ص ۴۵۰
۳۔ ایضاً ص ۴۵۲
۴۔ ایضاً ص ۴۵۰

(مثلاً طبقات الحکماء، طبقات الاطباء اور طبقات الحفاظ)۔ کچھ تواریخ عمومی نوعیت کی ہیں (مثلاً تاریخ یعقوبی اور تاریخ طبری)۔ ان کے علاوہ کچھ جغرافیہ نویس بھی تھے جیسا کہ المقدسی جس نے **احسن التقاسیم** لکھی ہے اور ابراہیم بن محمد الفارسی المعروف اصطخری جس نے **صور الاقالیم و مسالک الممالک** لکھی ہے۔

پہلا مسلمان مؤرخ

جرجی زیدان نے جلال الدین سیوطی سے نقل کیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دو مؤرخ ایک دوسرے کے ہم عصر تھے۔ ان میں سے ایک محمد بن اسحاق مطلبی ہے جو یمن التمر کا رہنے والا شیعہ تھا اور دوسرا عروہ بن زبیر ہے جو مشہور صحابی زبیر بن العوام کا بیٹا تھا مگر علامہ سید حسن صدر نے ثابت کیا ہے کہ حضرت امیرالمومنینؑ کا کاتب عبید اللہ بن ابی رافع اسلام کا پہلا مؤرخ تھا۔ اُس کا تعلق مصر کے قبطی خاندان سے تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میں اُن صحابہ کا تعارف کرایا ہے جو امیرالمومنینؑ کے زمانۂ خلافت میں اُن کے حامی تھے۔ اگر محمد بن اسحاق کو (جس نے "سیرت النبیؐ" لکھی ہے اور "سیرت ابن ہشام" اسی ابن اسحاق کی سیرت النبیؐ کا چربہ ہے) پہلا مؤرخ مان لیا جائے تو وہ ایرانی تھا کیونکہ لفظ موئی اُس پر صادق آتا ہے۔ اس صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابن ابی رافع قبطی مصری کے بعد دو افراد نے تاریخ نویسی کے میدان میں قدم رکھا جن میں سے ایک ایرانی اور دوسرا قریشی عرب تھا البتہ ان تینوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ محمد بن اسحاق کی کتاب اس وقت بھی موجود ہے جبکہ ابن ابی رافع اور عروہ بن زبیر کی کتابیں بظاہر ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔[1]

چند مؤرخین کا تعارف

یعقوبی

تاریخ یعقوبی اسلام کی عمومی تاریخ کی قدیم ترین کتاب ہے۔ یہ تاریخ اسلام کی معتبر ترین کتاب ہے اور شیعہ و سنی دونوں ہی اس کو معتبر مانتے ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر ابراہیم آیتی نے اس کتاب کی دونوں جلدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ انتہائی قابل اعتماد کتاب ہے جو تیسری صدی ہجری کے اوائل میں لکھی گئی تھی۔

یہ کتاب مامون کے زمانے کے بعد، متوکل کے زمانے کی تالیف لگتی ہے۔ یہ صرف تاریخ کی کتاب ہے، حدیث کی نہیں۔[2]

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۳۵۱

۲۔ مجموعہ آثار ج ۳، ص ۸۹۶۔۸۹۷۔ امامت و رہبری ص ۱۳۰

ابن ہشام

سیرت ابن ہشام دوسری صدی کی تالیف ہے۔ اگرچہ ابن ہشام تیسری صدی ہجری کے آدمی تھے مگر اس کتاب کی بنیاد سیرت ابن اسحاق پر ہے اور ابن اسحاق دوسری صدی میں گزرے ہیں۔ ابن ہشام نے اُن کی کتاب کی تلخیص و تہذیب کی ہے۔ یہ کتاب اہلسنت کے ہاں معتبر مانی جاتی ہے۔[1]

ابن اثیر

ابن اثیر نام کے تین بھائی گزرے ہیں اور تینوں ہی اسلام کے محقق علماء میں سے تھے۔ ان میں سے ایک کا لقب عز الدین، دوسرے کا مجد الدین اور تیسرے کا ضیاء الدین ہے۔ کامل التواریخ اور اُسد الغابہ عز الدین کی تالیفات ہیں جبکہ لغت کی بہترین اور دقیق کتاب النہایہ اور حدیث کی کتاب جامع الاصول مجد الدین کی تالیفات ہیں۔ واضح رہے کہ النہایہ میں لغت حدیث پر بحث کی گئی ہے۔[2]

طبری

طبری مشہور مورخ، محدث اور فقیہ تھے۔ طبری کو اہل سنت کے درجۂ اول کے علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھیں اُس زمانے کے بہت سے علوم میں امام اور پیشوا کا درجہ دیا جاتا ہے... ابن ندیم نے الفہرست میں ایسے بہت سے فقہاء کے نام لکھے ہیں جو طبری کے فقہی مذہب کے پیروکار تھے۔ طبری آل مازندران کے رہنے والے تھے۔ وہ ۲۲۴ھ میں آمل میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۳۱۰ھ میں بغداد میں وفات پائی۔[3]

ابوالفرج اصفہانی

یہ اسلام کے بلند پایہ مورخین میں سے ہیں۔ یہ مسلمات میں سے ہے کہ وہ بنی امیہ کی نسل سے تھے۔ وہ آل بویہ کے زمانے میں تھے اور اصفہان میں رہتے تھے اسی لیے انھیں ابوالفرج اصفہانی کہا جاتا ہے۔ وہ شیعہ نہیں تھے... ان کا سنی ہونا مسلم ہے... وہ مشہور کتاب الاغانی کے مولف ہیں۔ ابوالفرج کی ایک کتاب کو تاریخ اسلام کی معتبر کتاب مانا جاتا ہے جس کا نام مقاتل الطالبین ہے۔ اس کا موضوع اولاد ابو طالبؑ کے مقتولین کی تاریخ ہے۔[4]

۱۔ مجموعہ آثار ج ۳، ص ۸۷۸۔ امامت و رہبری ص ۱۳۰

۲۔ مجموعہ آثار ج ۳ حاشیہ، ص ۳۵۶۔ فطرت حاشیہ ص ۲۰

۳۔ مجموعہ آثار ج ۱۳، ص ۴۰۷

۴۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۱۹۹

اسلام کی جنم بھومی

انسان کی زندگی میں بہت سی غیبی امداد شامل ہوتی ہے۔ کبھی وہ مدد دل اور ارادے کی تقویت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور کبھی مادی اسباب و وسائل کی فراہمی کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی ہدایت، روشن فکری اور کبھی بلند علمی افکار کے الہام کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اُس کی ذات کے سپرد نہیں کیا گیا۔ مخصوص حالات میں دست پروردگار اُس کی دستگیری کرتا ہے اور اسے گمراہی، پریشانی اور کمزوری سے بچاتا ہے... جب دست پروردگار کسی ایک آدمی پر اتنی عنایت کرتا ہے تو پورے انسانی معاشرے پر اُس کی عنایت کتنی ہوگی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ غیبی مدد کبھی معاشرے کی مدد کے لیے بھی آئے اور اُس کی نجات کا سامان پیدا کرے؟

ہمیشہ سے نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور قدرت کی طرف سے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہم السلام جیسی عظیم شخصیات دنیا میں آئیں اور ان شخصیات کا اس وقت ظہور ہوا جب انسانی معاشرے کو اُن کی اشد ضرورت تھی۔ یہ ہستیاں کسی غیبی ہاتھ کی طرح سے نمودار ہوئی تھیں اور انھوں نے انسانیت کو نجات دلائی تھی۔ ان ہستیوں کی مثال خشک صحرا میں باران رحمت کی سی تھی اور یہ ہستیاں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مصداق تھیں: وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ○ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا دیا گیا ہے ان پر احسان کریں اور انھیں (لوگوں کا) پیشوا اور (زمین کا) وارث بنائیں۔ (سورۂ قصص: آیت ۵)

حضرت علیؑ نے آنحضرت ﷺ کے زمانۂ بعثت کی اس طرح سے تصویر کشی کی ہے: اللہ نے آپ کو اُس وقت رسول بنا کر بھیجا جبکہ رسولوں کا سلسلہ رکا ہوا تھا اور امتیں مدت سے پڑی سو رہی تھیں...! [1] معاملات کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، دنیا بے رونق و بے نور تھی اور اُس کی فریب کاریاں کھلی ہوئی تھیں۔ اُس وقت اُس کے پتوں میں زردی دوڑی ہوئی تھی اور انسانیت کا درخت پھلوں سے ناامید ہو چکا تھا۔ [2]

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۶

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۸۷

عام طور پر انبیاءؑ کا ظہور ایسے مواقع پر ہوا جب انسانیت کے اُس وقت کا ماحول سخت خطرناک تھا اور ایسے حالات میں انبیاء نجات اور سماجی اصلاح کا ذریعہ ثابت ہوتے تھے۔[1] قرآن کریم عصر پیغمبر ﷺ کے لوگوں سے خطاب کرکے یہ فرماتا ہے: ...وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے (رسول اکرم ﷺ کے ذریعے سے) تمھیں اس سے نجات دی۔[2]
(سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۳)

عرب کے سماجی، اعتقادی اور ثقافتی حالات

ایسے عقائد جو آباء و اجداد کی اندھی تقلید کی وجہ سے انسانی روح میں رچ بس گئے ہوں ان کی حیثیت ایسی زنجیروں کی سی ہوتی ہے جو انسانی فکر اور روح کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔ جس طرح طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا انسان خود کو زنجیروں سے آزاد نہیں کراسکتا اور ان کو کھولنے کے لیے کسی دوسرے انسان کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ایسی اقوام جو بلا سوچے سمجھے دوسروں کی اندھی تقلید سے عقائد اپنالیں ان کی فکر بھی زنجیروں میں جکڑ جاتی ہے اور وہ خود اپنے آپ کو ان زنجیروں سے چھڑانے کے قابل نہیں ہوتیں۔ انھیں کسی اور شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں فکری زنجیروں سے آزادی دلائے... تاکہ وہ فکری آزادی کے ساتھ اپنے عقیدے کا انتخاب کرسکیں۔ یہ ایک عظیم خدمت ہے جو ایک انسان کسی انسان کے لیے کرسکتا ہے۔

انبیاءؑ کی ایک ذمے داری یہ بھی تھی کہ وہ اندھی تقلید پر قائم اعتقادی نظام کو ختم کرڈالیں تاکہ انسان آزادی سے اپنے متعلق اور اپنے عقیدے کے متعلق غور و فکر کرسکے۔ (لفظ جاہلیت جہل سے بنا ہے جو علم کی ضد ہے لیکن اس سے صرف لاعلمی مراد نہیں بلکہ اس کے مفہوم میں حماقت اور بے عقلی بھی شامل ہے۔[3] گفتگو کے اس حصے میں جاہلیت کے چند تصورات کی طرف اشارہ کیا جائے گا)۔

(۱) ایک معروف صحابی، رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

یا رسول اللہؐ! میں سوچتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے خدا نے ہم کو جن عظیم نعمتوں سے نوازا ہے وہ ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہیں... میں ان لوگوں میں سے تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ بیٹی کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ بیٹی سراپا ننگ و عار ہے لہٰذا اس ننگ و عار کے وجود سے زمین پاک ہونی چاہیے۔[4]

(۲) زمانۂ جاہلیت میں باپ اور باپ کی عدم موجودگی میں ان کے بیٹے، اپنی بیٹیوں اور بہنوں پر حق

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۳۱

۲۔ مجموعہ آثار ج ۳، ص ۳۵۴ ـ ۳۵۵

۳۔ محمد نصیری، تاریخ تحلیلی اسلام ص ۷۰ (معمولی تلخیص کے ساتھ)

۴۔ پیرامون جمہوری اسلامی ص ۱۱۶ ـ ۱۱۷

ولایت رکھتے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے بہن اور بیٹی کا نکاح کردیا کرتے تھے اس میں عورت کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔[1]

(۳) زمانہ جاہلیت میں لڑکی کا مہر والدین کھا جاتے تھے اور اسے حق زحمت یا شیر بہا کا نام دیتے تھے۔[2]

(۴) زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم یہ بھی تھی کہ مرد کسی عورت سے شادی کرتا تو کبھی اس کے لیے بہت زیادہ حق مہر مقرر کرتا تھا اور جب اس سے سیر ہو جاتا اور نئی بیوی لانے کا ارادہ کرتا تو پہلی بیوی پر زنا کاری کی تہمت لگا کر اسے عیب دار کر دیتا تھا...قرآن کریم[3] نے اس رسم کو نہ صرف منسوخ کیا بلکہ اس کا راستہ بھی روکا۔[4]

(۵) زمانہ جاہلیت میں ایسی بہت سی رسوم تھیں جن کے ذریعے عورت کو حق مہر سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ ان میں ایک رسم یہ تھی کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جاتا تو اس کے مال ترکہ کی طرح عورت کو بھی میراث کا مال سمجھا جاتا تھا۔ مرنے والے کی اولاد اور بھائی جس طرح مال میں ترکہ پاتے تھے، اسی طرح عورت بھی میراث میں چلی جاتی تھی۔

کسی بھی شخص کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اور بھائی کو اس کی بیوہ بطور میراث لینے کا حق ہوتا تھا اور وہ بیوہ کا کسی سے نکاح کر دیتے تھے اور اس کا حق مہر خود لے لیتے تھے یا کسی مہر کے بغیر اسے اپنی بیوی بنا لیتے تھے[5] قرآن کریم[6] نے ارث زوجیت کو منسوخ کیا۔[7]

(۶) عربوں کی غلط رسوم میں سے ایک رسم "نکاح شغار" بھی تھا۔ یہ نکاح دراصل والد کے صوابدیدی اور بے جا اختیارات کا مظہر تھا۔ نکاح شغار کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرد دوسرے سے یہ کہتا تھا کہ میں اپنی بہن یا بیٹی کی شادی تجھ سے کردیتا ہوں اس کے بدلے مہر کی بجائے تو اپنی بہن یا بیٹی میرے عقد میں دے گا اور وہ اسے قبول کرلیتا تھا اور یوں عورت کا مہر عورت ہی کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا...

اسلام نے اس رسم بد کو بھی منسوخ کیا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: لَا شِغَارَ فِي الْاِسْلَامِ[8] یعنی

۱۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۲۳۹

۲۔ ایضاً

۳۔ سورۂ نساء: آیت ۱۹

۴۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۲۴۲

۵۔ یہ رسم بد عربوں کے علاوہ ہندوستان، جاپان، روم، یونان اور ایران میں بھی موجود تھی۔

۶۔ سورۂ نساء کی آیت ۲۲ میں باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کی ممانعت کی گئی۔

۷۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۲۴۱۔ نیز ص ۲۸۰۔۲۸۱

۸۔ بحار الانوار ج ۱۰۰، ص ۱۹۰، ح ۳۷

اسلام میں بہن بیٹی کے عوض بہن، بیٹی سے شادی کرنا حرام ہے۔[۱]

(۷) سورۂ مبارکہ احزاب کی چالیسویں آیت میں ایک پرانی رسم کو منسوخ کیا گیا ہے اور یہ رسم عربوں اور غیر عربوں میں یکساں طور پر رائج تھی۔ یہ رسم اُس زمانے میں ایران اور روم[۲] سمیت ہر جگہ پائی جاتی تھی اور وہ متبنیٰ گیری کی رسم تھی۔ اگر کوئی شخص کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیتا تھا تو اس منہ بولے بیٹے کو وہ تمام حقوق حاصل ہوتے تھے جو صلبی بیٹے کو حاصل ہوتے تھے... اسلام نے اس قانون کو منسوخ کیا۔[۳]

(۸) میراث کے متعلق عربوں میں ایک اور رسم رائج تھی۔ اسے بھی قرآن کریم نے منسوخ کیا تھا۔ یہ "معاھدے" کی رسم تھی یعنی دو آدمی ایک دوسرے کے ساتھ عہد و پیمان کرتے تھے کہ "میرا خون، تیرا خون ہے اور مجھ پر حملہ تجھ پر حملہ متصور ہوگا۔ تو مر گیا تو میں تیری میراث حاصل کروں گا اور اگر میں مر گیا تو تم میری میراث حاصل کرو گے۔" اس معاھدے کے بعد دونوں افراد زندگی میں ایک دوسرے کا دفاع کرتے تھے اور ان میں سے جو پہلے مرتا وہ دوسرے کی میراث پاتا تھا۔[۴]

(۹) جب اسلام کا ظہور ہوا اُس وقت عربوں میں اقربا پروری اور اپنی قوم و نسل کا فخر انتہائی عروج پر تھا۔ اُس زمانے میں عرب اپنی عربیت پر ناز نہیں کرتے تھے کیونکہ اس وقت "عرب قومیت" کا نظریہ وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس کی بجائے عرب اپنے اپنے قبیلے پر فخر کیا کرتے تھے۔ اسلام[۵] نے اس طرح کے بے جا تفاخر کا قلع قمع کیا۔[۶]

ایران کا رُو بہ زوال تمدن

(یہ بات مسلمات تاریخ میں سے ہے کہ) اسلام سے قبل ایران تمدن کا گہوارہ تھا اور یہ تمدن اسلام کے

۱۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۲۳۹

☆ وٹہ سٹہ کی شادی میں ایک دوسرے کی بہن یا بیٹی سے شادی ہوتی ہے مگر دونوں لڑکیوں کا مہر معین ہوتا ہے اس لیے یہ حرام تو نہیں مگر عورت کا بدترین استحصال ہے۔ اس شادی کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کم سے کم حق مہر رکھا جائے اور کوئی بھی غیرت مند مرد عورت کا حق نہیں کھاتا۔ ہمارے علماء و خطباء، واعظین و ذاکرین اور دینی سیاسی جماعتوں کو اس معاشرتی برائی کے خلاف اور عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے۔ (رضوانی)

۲۔ استاد مرتضیٰ مطہری نے "نظام حقوق زن در اسلام" میں روم کا نام بھی لیا تھا۔

۳۔ خاتمیت ص ۱۴۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۲۸۰

۴۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۲۸۰

۵۔ سورۂ حجرات: آیت ۱۳۔ تحف العقول ص ۳۴۔ سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۴۱۲۔ روضۂ کافی ج ۸، روایت ۲۰۳

۶۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۷۲

تمدن کے لیے ایک ذخیرے کی حیثیت رکھتا تھا (لیکن آہستہ آہستہ وہ تمدن رو بہ زوال ہو گیا تھا)۔ اسلام نے ایران کو حیاتِ نو عطا کی اور اسلام نے ایران کے رو بہ زوال تمدن کے قالب میں نئی روح پھونک دی اور اسے حیاتِ نو بخشی۔ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔[1]

جناب زین العابدین رہنما "ترجمہ و تفسیر قرآن"[2] میں رقمطراز ہیں:

سرزمین مکہ میں اسلام کا ظہور تاریخ انسانیت کا بہت بڑا انقلاب تھا... جو ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں پورے جزیرۂ عرب پر چھا گیا۔ اس کے بعد وہ قریبی ممالک میں داخل ہوا جن کے پاس اس دور کی بہترین تہذیب و ثقافت تھی... اس انقلاب نے جدید تمدن کے نام سے صرف جزیرۃ العرب اور بے آب و گیاہ صحرا اور بے سر و صدا علاقوں کو ہی متاثر نہیں کیا جن کے رہنے والے انگشت شماری کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے بلکہ اس نے بے سر و صدا علاقوں کو صدا سے پُر علاقوں میں بدل دیا اور وہاں کے رہنے والے ہزاروں گمنام لوگوں کو نہ صرف شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا بلکہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے نمونوں کے طور پر ان کا نام لیا جانے لگا (اسلام نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی) بلکہ لوگوں کے سامنے نئے فلسفے اور نئے افکار بھی پیش کیے۔ اگرچہ (ایران اور روم) جیسے ہمسایہ ممالک پہلے بھی تمدن آشنا تھے پھر بھی اسلام نے ان دونوں ملکوں کے تمدن کو حیاتِ نو عطا کی اور یہ فکر و احساس ان دو ممالک کے عوام میں اتنا پختہ ہو گیا کہ وہ آئین اسلامی کے رہنماؤں کے ساتھ مل کر اپنی حکومتوں کو گرانے کے درپے ہو گئے اور اس معنوی غلبے کے آثار آج بھی برقرار ہیں جبکہ عرب فاتحین کی جنگی کامیابیوں کا ان ممالک میں کہیں نشان تک باقی نہیں ہے۔[3]

بحث کے چیدہ نکات

(۱) تاریخ کی تعریف تین طرح سے کی جا سکتی ہے:

الف۔ دور حاضر کے مقابلے میں ماضی کے انسانوں کے واقعات، حوادث اور احوال کا علم تاریخ کہلاتا ہے۔ اس کو "نقلی تاریخ" کہتے ہیں۔

ب۔ گزشتہ دور کے واقعات کے تجزیے کے ذریعے یہ معلوم کرنا کہ اُس دور کے لوگوں کی زندگی پر کون سے قوانین کار فرما تھے۔ ایسی تاریخ کو "علمی تاریخ" کہا جاتا ہے۔

ج۔ معاشرتی تبدیلیوں یعنی معاشرہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں کیونکر داخل ہوتا ہے اور تبدیلی لانے والے قوانین کا علم حاصل کرنا۔ بالفاظ دیگر معاشروں کے ہونے کا علم نہ کہ اُن کے ماضی کا علم، اس علم کو

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۳۳۸۔ تمدن ایرانی، تالیف جمعیت مستشرقین ترجمہ عیسیٰ بہنام ص ۲۴۷

۲۔ تمدن ایرانی ص ۷۵

۳۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۱۳۹۔۱۴۰

"فلسفۂ تاریخ" کہا جاتا ہے۔

(۲) نقلی تاریخ کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

الف۔ تاریخ جزئی ہوتی ہے۔

ب۔ (وہ نقل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے) نقلی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ دور حاضر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اور علمی تاریخ کی خصوصیات یہ ہیں:

الف۔ علمی تاریخ بھی نقلی تاریخ کی طرح گزشتہ زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

ب۔ اس کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔

ج۔ وہ کلی ہوتی ہے۔

د۔ وہ عقلی ہوتی ہے۔ علمی تاریخ دراصل معاشرہ شناسی کا ایک حصہ ہے۔

فلسفۂ تاریخ بھی علمی تاریخ کی طرح کلی اور عقلی ہوتا ہے لیکن علمی تاریخ کے برعکس وہ معاشروں کے جنم لینے یعنی "شدن" کا علم ہوتا ہے بودن (ماضی) کا علم نہیں ہوتا۔

(۳) علم تاریخ کے تینوں معانی فائدہ مند ہیں۔ تاریخ ایک زندہ فلم کی طرح ماضی کو حال میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو افراد نمونہ عمل یعنی "اسوہ" بننے کے لائق تھے، قرآن کریم نے ان کے حالات بیان کئے ہیں اور اس سے مفید نکات نکالے ہیں۔

(۴) انسانوں کی طرح کچھ جانور بھی اجتماعی زندگی گزارتے ہیں مگر انسانوں اور اُن کی زندگی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی ایک ہی حالت اور ایک ہی ڈگر پر چلتی ہے جبکہ انسانی زندگی ہر لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

(۵) عام طور پر تاریخ کے پہیے کو گردش دینے والے عوامل کے متعلق یہ نظریات پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) نسلی برتری کا نظریہ (۲) جغرافیائی نظریہ (۳) ہیروز کا نظریہ

(۴) اقتصادی نظریہ (۵) الٰہی نظریہ

مذکورہ نظریات میں سے کسی کو بھی مکمل طور پر صحیح نہیں کہا جا سکتا اور یہ نظریات "خلط مبحث" پر مبنی ہیں۔

ہم تاریخ کے پہیے کو حرکت دینے والے جن عوامل کو دریافت کرنا چاہتے ہیں یہ نظریات ان سے مربوط نہیں ہیں۔

(۶) نسلی برتری کے نظریے کے مطابق حرکت تاریخ کا ذریعہ چند نسلیں ہیں اور "کاؤنٹ گوبینو" اسی نظریے کا حامی تھا۔ جغرافیائی نظریے کے مطابق ثقافت اور صنعت کا فروغ طبیعی ماحول کا مرہون منت ہے چنانچہ "مونٹسکیو" اسی نظریے کا حامی تھا۔ ہیروز کے نظریے کے مطابق نابغۂ روزگار افراد علمی، سیاسی، اقتصادی، فنی اور اخلاقی تاریخ کے بانی ہیں اور تاریخ کو یہ نابغہ افراد ہی حرکت میں لاتے ہیں۔ "تھامس کارلائل" کا یہی نظریہ تھا

اقتصادی نظریے کے مطابق اقتصادیات ہی تاریخ کو حرکت دیتی ہیں اور اقتصادیات کی بنیاد پر ہی معاشروں میں تبدیلیاں جنم لیتی ہیں۔ اسی سے ہی معاشرے زیر و زبر ہوتے ہیں اور معاشیات کی بہتری معاشرے کی ترقی کی ضامن ہے۔ کارل مارکس اس نظریے کا طرف دار تھا۔ الٰہی نظریے کے مطابق خدا کی مشیت اور حکمت بالغہ سے تاریخ میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ خدا کا ارادہ تاریخ کو حرکت دیتا ہے جیسا کہ بوسوئہ کہتا تھا۔

(۷) نسلی نظریہ، معاشرے کی شناخت کا نظریہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ اس مسئلے کا صحیح جواب فراہم کرتا ہے مگر فلسفۂ تاریخ کا راز پھر بھی مخفی رہتا ہے اور اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے کہ ایک نسل ہی تاریخ کو حرکت دیتی ہے یا بہت سی نسلیں اسے حرکت میں لاتی ہیں۔ جغرافیائی نظریہ معاشرہ شناسی سے مربوط ہے کہ کچھ علاقوں کی آب و ہوا عقلی، فکری، ذوقی اور جسمانی صحت کی افزائش کے لیے موثر ہے۔

مذکورہ نظریات میں سے الٰہی نظریہ انتہائی بے ربط ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا صرف تاریخ ہی مشیت الٰہی کی جلوہ گاہ ہے یا پوری کائنات اپنے آغاز سے انجام تک اپنے اسباب و موجبات و موانع کے ساتھ مشیت الٰہی کی جلوہ گاہ ہے؟

تاریخ کے متعلق، اقتصادی نظریہ فنی اور اصولی پہلوؤں سے عاری ہے۔ یہ نظریہ تاریخ کی ماہیت اور ہویت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ مادی و اقتصادی ہے اور معاشرے کے دوسرے مسائل اس ''جوہر تاریخی'' کے اعراض دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک حرکت تاریخ کے متعلق ہیروز کے نظریے کا تعلق ہے تو اس کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فلسفۂ تاریخ سے براہ راست مربوط ہے۔

(۸) قرآن کی نظر میں طبیعت کے علاوہ عقل اور دل بھی تاریخ کی شناخت کا منبع ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں گزشتہ اقوام کے حالات و واقعات کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے۔

(۹) تاریخ اسلامی کی تدوین میں اندلس، مصر، دمشق، عراق، تیونس اور ایران کے مؤرخین کا بڑا حصہ ہے۔

(۱۰) اسلام میں مختلف قسم کی تاریخ نگاری پائی جاتی ہے۔ معین اور مخصوص افراد کی سیرت و تاریخ بھی ہے، مختلف شہروں اور ممالک کی تاریخ بھی ہے، علوم کی تاریخ بھی ہے اور عمومی تاریخ اور جغرافیہ نویسی بھی ہے۔

(۱۱) جرجی زیدان اور سیوطی کے مطابق اسلام کا پہلا مؤرخ محمد بن اسحاق اور دوسرا مؤرخ عروہ بن زبیر تھا لیکن علامہ سید حسن صدر نے ثابت کیا ہے کہ اسلامی دنیا کا پہلا مؤرخ حضرت علیؑ کے کاتب عبیداللہ بن رافع تھا۔

(۱۲) اسلامی تواریخ میں سے تاریخ یعقوبی ایسی کتاب ہے جسے شیعہ اور سنی دونوں معتبر سمجھتے ہیں۔

(۱۳) عزالدین، ضیاءالدین اور مجدالدین تینوں بھائی اسلام کے محقق علماء تھے۔

(۱۴) طبری ایک مشہور مؤرخ، محدث اور فقیہ تھے اور ان کا شمار اہلسنت کے صف اول کے علماء میں ہوتا ہے۔ وہ ۲۲۴ھ میں آمل میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ھ میں بغداد میں فوت ہوئے۔

(۱۵) ابو الفرج اصفہانی ایک مشہور مسلمان مؤرخ تھے اور وہ بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے آل بویہ کے دور حکومت میں زندگی گزاری تھی۔

(۱۶) عظیم الشان انبیاء اور نابغہ روزگار ہستیوں نے عام طور پر اس وقت ظہور کیا جب انسانی معاشرے کو ان کی اشد ضرورت تھی اور انھوں نے لوگوں کو گمراہی اور جہالت سے نجات دلائی۔

(۱۷) منہ بولے بیٹے کو عربوں، ایرانیوں اور قدیم روم میں وارث سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ہم پیمانی کی رسم بھی میراث کے حصول کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ قرآن کریم نے ان دونوں رسموں کو منسوخ کر دیا۔

(۱۸) زمانہ جاہلیت میں باپ یا بھائی اپنی مرضی سے بہن یا بیٹی کا نکاح کر دیتے تھے اور حق مہر کو شیر بہا قرار دے کر اپنا حق سمجھتے تھے۔ اگر کوئی مرد بھاری حق مہر دے کر کسی عورت سے نکاح کرتا اور اس کا دل اس سے بھر جاتا تو وہ اس عورت پر زنا کی تہمت لگا کر اس سے حق مہر واپس لے لیتا تھا۔ قرآن کریم نے حق مہر ضائع کرنے والی ہر رسم کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح سے بیوہ کو میراث میں حاصل کرنے کی رسم کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دیا۔

(۱۹) نکاح شغار بیٹیوں پر والد کے زیادہ اختیارات کا مظہر تھا۔ (اسلام نے اسے بھی ممنوع قرار دیا ہے)۔

(۲۰) ظہور اسلام کے زمانے میں عرب اپنے قبیلے پر فخر کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اس طرح کے بے جا تفاخر کی کھلی مذمت کی۔

(۲۱) ایران کے تمدن کے متعلق دو باتیں قطعی طور پر کہی جا سکتی ہیں

(۱) اسلام سے پہلے ایران میں شان دار تمدن پایا تھا جو ایک طویل عرصے سے جاری تھا۔ وہ اسلامی تمدن کا سرمایہ شمار ہوتا ہے۔

(۲) اسلام نے ایران کو حیات نو عطا کی اور ایران کے رو بہ زوال تمدن میں نئی روح پھونک دی۔

دوسرا باب

تاریخ زندگی وسیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے آشنائی

اسلام کی کامیابی اور فروغ کے اسباب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے آشنائی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور اَخلاق و کردار

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچپن اور جوانی۔ شیعہ اور سنی اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت (عام الفیل ۵۷۰ء) ماہ ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ اہلسنت کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت (بروز پیر) بارہ ربیع الاول کو اور شیعہ کہتے ہیں کہ بروز جمعہ سترہ ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شاید آپ کی ولادت طلوع فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے (مکہ مکرمہ میں) ہوئی تھی۔[1]

آپ کے والد ماجد جناب عبداللہ نے وہب کی صاجزادی حضرت آمنہ سے شادی کی تھی اور حضرت آمنہ کا خاندان جناب عبداللہ کا قریبی رشتے دار تھا۔ شادی کے بعد ابھی چالیس دن ہی گزرے تھے کہ انھوں نے شام جانے کے لیے رخت سفر باندھا... شام سے واپسی پر مدینہ چلے گئے جہاں ان کی والدہ کے رشتے دار رہتے تھے۔[2] چنانچہ مدینہ میں ہی ان کی وفات ہوگئی۔ (مشہور ہے کہ) جناب عبداللہ کی وفات کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شکم مادر میں تھے ...[3]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار سال تک کا عرصہ اپنی والدہ، دادا، رشتے داروں اور شہر مکہ سے دور ایک گاؤں میں وہاں کے لوگوں کے ساتھ گزارا اپنی آیا کے ہاں رہے۔ چار برس کے بعد آیا نے انھیں واپس کیا... حضرت آمنہ کے علاوہ آپ کے حضرت دادا عبدالمطلب اس چھوٹے بچے کے کفیل تھے... حضرت آمنہ نے حضرت عبدالمطلب سے اجازت مانگی کہ وہ (جناب عبداللہ کی قبر کی زیارت) اور رشتے داروں سے ملاقات کے

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۱۳۹۔ ۱۴۰

۲۔ آپ کی دادی کے رشتے دار مدینہ میں رہتے تھے کیونکہ ہاشم بن عبد مناف نے سلمٰی بنت عمر بن زید خزرجی سے شادی کی تھی اور حضرت عبدالمطلبؑ ان سے پیدا ہوئے تھے۔ (حاشیہ علامہ سید مرتضیٰ عسکری)

۳۔ ابن اثیر، اُسد الغابہ ج ۱، ص ۱۳۔ ۱۴

لیے مدینہ جانا چاہتی ہیں اور حضرت محمدؐ کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔ (حضرت عبدالمطلب نے اجازت دی تو) اُن کی کنیز ام ایمن بھی ان کی ہمسفر ہوئیں۔ پھر مدینہ سے حضرت محمدؐ اپنی والدہ اور اُن کی کنیز کے ساتھ واپس ہوئے تو مکہ و مدینہ کے درمیان ابواء کے مقام پر آپ کی والدہ بیمار ہوگئیں ... اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ والدہ کو وہاں دفن کر کے آپ ام ایمن کے ساتھ مکہ واپس آگئے۔

حضرت عبدالمطلب ... جناب عبداللہ اور حضرت آمنہ کی وفات کے بعد اس بچے کا خاص خیال رکھتے تھے۔[1] آپ آٹھ سال کے ہوئے تو حضرت عبدالمطلب بھی انتقال کر گئے اور ان کی وصیت کے مطابق آپ کے بڑے چچا حضرت ابو طالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات

دنیا میں آنے والے تمام انبیاءؑ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ واحد نبی ہیں جن کی زندگی کی تاریخ مکمل طور پر محفوظ ہے (آپ کی چند خصوصیات یہ ہیں)

(۱) بت پرستی سے اجتناب۔

آپ نے بت پرستی کے ماحول میں چالیس سال گزارے مگر اس پورے عرصے میں آپ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔[3]

(۲) حلف الفضول میں شرکت۔

زمانۂ جاہلیت میں کچھ لوگوں نے ظلم و ستم کو ناپسند کرتے ہوئے مظلوم افراد کی مدد کے لیے ایک معاہدہ کیا تھا۔ یہ معاہدہ مکہ کی اہم شخصیت عبداللہ بن جدعان کے گھر طے پایا تھا اور اسے حلف الفضول کا نام دیا گیا۔[4]

(۳) الٰہی تائید۔

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے زمانۂ نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے بچپن میں کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی غیبی طاقت میری مدد کر رہی ہے۔[5]

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۲۶۵، ۲۶۷۔ وحی و نبوت ص ۱۲۸، ۱۳۰

۲۔ وحی و نبوت ص ۱۲۹

۳۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۶۹

۴۔ وحی و نبوت ص ۱۳۱

۵۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۷۱ کے علاوہ نہج البلاغہ میں حضرت امیرالمومنینؑ کے "خطبہ قاصعہ" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ امام محمد باقرؑ سے بھی اس مفہوم کی کچھ روایات مروی ہیں۔

(۴) امین۔

آپ کو اپنی دیانت و امانت کی وجہ سے مکہ میں "امین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

(۵) حضرت علیؑ کی تربیت و پرورش۔

تیس برس کی عمر میں جب آپ حضرت خدیجہؑ کے ساتھ عائلی زندگی بسر کر رہے تھے تو اس دوران آپ ایک دو سالہ بچے کو اس کے والد سے لے کر اپنے گھر لے آئے۔ وہ حضرت علی بن ابی طالبؑ تھے۔[1]

(۶) عبادت۔

آپ کبھی رات کا ایک حصہ، کبھی آدھی رات، کبھی ایک تہائی اور کبھی دو تہائی رات عبادت میں بسر کرتے تھے۔ پورے ماہِ رمضان اور ماہِ شعبان کے کچھ مسلسل روزوں کے علاوہ آپ کا معمول تھا کہ ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔ ماہِ رمضان کے آخری عشرے میں آپ کا بستر لپیٹ دیا جاتا تھا اور آپ مسجد میں اعتکاف بیٹھ جاتے اور عبادت کرتے تھے۔ آپ دوسروں سے فرماتے تھے کہ تمہارے لیے ہر مہینے کے تین روزے کافی ہیں... آپ تنہا ہوتے تو عبادت کو بہت طول دیتے اور کبھی نماز تہجد میں کئی گھنٹے مشغول رہتے مگر جب آپ جماعت کراتے تو اختصار سے کام لیتے تھے۔[2]

(۷) ارہاصات رسولؐ۔

قبل از رسالت کے کچھ واقعات کو متکلمین کی اصطلاح میں ارہاصات کہا جاتا ہے۔[3] فرشتوں کے قصوں کو بھی ارہاصات کا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ کو رسالت سے قبل عجیب قسم کے خواب دکھائی دیتے تھے۔[4]

(۸) رسول اُمی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ "اُمی" تھے۔ آپ نے کسی مکتب میں قدم نہیں

۱۔ وحی و نبوت ص ۱۳۰۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۷۰۔۲۷۱۔ حضرت علیؑ ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل یعنی ہجرت سے ۲۳ برس قبل پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد حضرت ابو طالبؑ اور والدہ حضرت فاطمہ بنت اسدؑ تھیں۔

(بحار الانوار ج ۳۵، ص ۳۰۔۴۳)

صحیح ترین روایات و نصوص کے مطابق آپ نے سب سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کی دوسرے لوگوں کے اسلام قبول کرنے سے سات برس پہلے آپ نے اعلان اسلام کیا تھا۔

(بحار الانوار ج ۳۸، ص ۲۰۹، ۲۶۸، ۲۹۹۔ الغدیر ج ۳، ص ۲۲۲۔۲۲۳)

۲۔ وحی و نبوت ص ۱۳۵۔۱۳۶

۳۔ ارہاص کا لغوی معنی ہے تیار ہونا۔ لفظ ارہاصات کا اطلاق اُن خارق العادات اتفاقات اور معجزات پر ہوتا ہے جو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے قریب وقوع پذیر ہوئے تھے مثلاً آپ کی ولادت کے موقع پر دریائے ساوہ کا خشک ہو جانا، آتش کدۂ فارس کا بجھ جانا، ایوان کسریٰ کے چار کنگروں کا گر جانا وغیرہ۔

سید ہاشم رسولی محلاتی، تاریخ تحلیلی اسلام ج ۱، ص ۱۳۵۔۱۳۶ (معمولی تلخیص کے ساتھ)

۴۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۷۲۔۲۷۶۔ نیز ص ۲۶۸۔۲۶۹

رکھا تھا اور نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔[۱] قرآن کریم میں اس نکتے کو بیان کیا گیا ہے۔[۲]

(۹) اہل خانہ سے حسن سلوک۔

آپ اپنے اہل خانہ سے بہترین سلوک روا رکھتے تھے اور اپنی ازواج پر سختی نہیں کیا کرتے تھے۔ اپنی کچھ ازواج کی بدزبانی پر صبر کرتے تھے... اپنے بیٹوں اور نواسوں سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں اپنے کاندھے پر سوار کرتے اور بوسہ دیتے تھے حالانکہ اُس زمانے میں یہ اچنبھے کی بات تھی۔[۳]

(۱۰) غلاموں سے سلوک۔

آپ غلاموں پر بے حد شفیق تھے اور لوگوں سے بھی فرماتے تھے کہ یہ تمہارے بھائی ہیں۔ تم جو کھانا خود کھاؤ انھیں بھی کھلاؤ اور ان سے سخت کام نہ لو۔ ان کے کاموں میں ان کی مدد کرو۔ انھیں (غلام یا کنیز کہنے کی بجائے) لڑکے (فتیٰ) یا لڑکی (فتاہ) کہہ کر پکارو۔[۴]

(۱۱) کشادہ روئی۔

آپ لوگوں کے ساتھ مہربانی اور کشادہ روئی سے پیش آتے تھے۔

(۱۲) بچوں کو سلام کرنا۔

آپ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے حتیٰ کہ بچوں اور غلاموں کو بھی پہلے سلام کرتے تھے۔[۵]

(۱۳) دوستوں کی احوال پرسی۔

آپ اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اگر تین دن تک کوئی صحابی دکھائی نہ دیتا تو آپ لوگوں سے اس کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ اگر پتا چلتا کہ وہ بیمار ہے تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے اور اگر کوئی کسی مشکل میں ہوتا تو اس کی مدد کرتے تھے۔

(۱۴) بیٹھنے کا انداز۔

آپ[۶] کسی کے سامنے پاؤں نہیں پھیلاتے تھے اور جب کوئی موجود ہوتا تو تکیہ پر ٹیک نہیں لگاتے تھے۔ عام طور پر دوزانو ہو کر بیٹھا کرتے تھے۔ آپ کی محفل دائرے کی شکل میں ہوتی تھی تاکہ اوپر اور نیچے بیٹھنے

۱۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۵۶۔۱۵۷۔ سورۂ عنکبوت: آیت ۴۸۔ سورۂ شوریٰ: آیت ۵۲

۲۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۶۹۔ مجموعہ آثار ج ۳، ص ۲۰۵۔۲۰۷۔ پیامبر اُمّی ﷺ ص ۹۔۱۲

۳۔ وحی و نبوت ص ۱۳۱۔۱۳۲

۴۔ وحی و نبوت ص ۱۳۲۔۱۳۳

۵۔ وحی و نبوت ص ۱۳۳

۶۔ وحی و نبوت ص ۱۳۴

کا معاملہ ہی نہ ہو۔[۱] آپ اپنے ساتھیوں کو تاکید کرتے تھے کہ وہ محفل میں جہاں جگہ مل جائے وہاں بیٹھ جایا کریں۔ جب محفل میں تشریف لاتے تو یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ آپ کے احترام میں کھڑے ہوجائیں اور اگر لوگ کھڑے ہوجاتے تو آپ انھیں منع کرتے ہوئے فرماتے کہ آرام سے بیٹھے رہو۔[۲] یہ اہل ایران کا طریقہ ہے۔[۳]

(۱۵) بیکاری اور کام چوری سے نفرت۔

آپ بیکاری اور کام چوری کو انتہائی ناپسند کرتے تھے... آپ مسلمانوں کو کام کرنے کی تلقین کیا کرتے اور فرمایا کرتے کہ "عبادت کے ستر حصے ہیں، اس کا بہترین حصہ رزق حلال کمانا ہے۔"

(۱۶) مسواک اور صفائی کی اہمیت۔

آپ کا معمول تھا کہ روزانہ رات کو سونے سے قبل اور صبح اٹھ کر "اراک" کی لکڑی سے مسواک کیا کرتے تھے۔ (اراک کی مسواک) مسوڑھوں کو مضبوط بناتی ہے اور غذا کے پھنسے ہوئے ذرات کو باہر نکال دیتی ہے۔ آپ[۴] کو صفائی اور خوشبو سے دلی لگاؤ تھا... آپ اپنے ماننے والوں کو نصیحت کرتے تھے کہ وہ اپنے جسم اور گھر کو صاف ستھرا اور معطر رکھیں اور جمعہ کے دن خاص طور پر غسل کریں اور خوشبو لگائیں تاکہ دوسروں کو ان کے بدن کی بدبو سے اذیت نہ پہنچے۔ صاف ستھرے ہو کر نماز جمعہ میں شرکت کریں۔[۵]

(۱۷) حصول علم کی ترغیب۔

آپ ہمیشہ لوگوں کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دیتے تھے اور صحابہ کے بچوں کو پڑھائی کا شوق دلاتے تھے۔ آپ نے اپنے کچھ صحابہ کو سریانی زبان سیکھنے کا بھی حکم دیا تھا...[۶] آپ فرمایا کرتے تھے کہ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے، جہاں بھی ملے خواہ مشرک و منافق کے پاس ہی کیوں نہ ہو اسے حاصل کرنا چاہیے۔[۷]

(۱۸) تبلیغ کا انداز۔

تبلیغ اسلام میں آپ ہمیشہ نرمی سے کام لیتے تھے اور سختی سے پرہیز کرتے تھے۔ آپ لوگوں کو زیادہ

۱۔ وحی و نبوت ص ۱۳۳

۲۔ بیست گفتار ص ۱۴۱

۳۔ حماسہ حسینی ج ۱، ص ۲۵۳۔ داستان راستان ج ۱۔۲، شمارہ ۱۷، ص ۶۹۔۷۰

۴۔ وحی و نبوت ص ۱۳۲

۵۔ وحی و نبوت ص ۱۳۰

۶۔ بلاذری، فتوح البلدان ص ۳۶۰

۷۔ وحی و نبوت ص ۱۳۲۔ داستان راستان ج ۲۔۱، شمارہ ۱ ص ۲۵۔۲۶۔ بحار الانوار ج ۲، ص ۹۷، ۹۹ (الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ) ج ۱، ص ۱۷۷

بشارت اور امید دلاتے تھے۔ ڈرانے اور خوف زدہ کرنے سے حتی المقدور پرہیز کیا کرتے تھے۔[۱]

تاریخ بتاتی ہے[۲] کہ جب رسول اکرم ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو دعوت و تبلیغ کے لیے یمن روانہ کیا[۳] تو سیرت ابن ہشام کے مطابق آپ نے اُن سے فرمایا: یَا مُعَاذُ! بَشِّرْ وَلَا تُنَفِّرْ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ[۴] اے معاذ، تمہاری تبلیغ کی بنیاد بشارت و ترغیب ہونی چاہیے۔ تم لوگوں کو اسلام کی طرف اس طرح بلاؤ کہ وہ پورے شوق سے اسلام قبول کریں... ایسا انداز اختیار نہ کرو کہ لوگ اسلام سے بھاگنے اور نفرت کرنے لگیں۔[۵]

(۱۹) مضبوط کام کی سفارش۔

آپ چاہتے تھے کہ ہر کام پختہ بنیادوں پر استوار ہو۔ جب آپ کے ایک مخلص صحابی سعد بن معاذ کی وفات ہوئی اور انھیں قبر میں اتارا گیا تو آپ نے اپنے دست مبارک سے قبر کی اینٹوں کو برابر کیا اور فرمایا... اللہ چاہتا ہے کہ بندہ جو بھی کام کرے پختہ اور مضبوط طریقے سے کرے۔[۶]

(۲۰) پیمان اخوت۔

جب مکہ کے مہاجرین مدینہ پہنچے تو رسول اکرم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کی... اس موقع پر آپ نے حضرت علیؑ کو اپنا بھائی قرار دیا تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اہل سنت بھی مانتے ہیں حالانکہ حضرت علیؑ کا تعلق مہاجرین کی جماعت سے تھا اور قاعدے کے مطابق کسی انصاری کو ان کا بھائی بنانا چاہیے تھا لیکن آپ نے انھیں کسی انصاری کا بھائی نہیں بنایا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔[۷] یہ اخوت حضرت علیؑ کا عظیم افتخار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو صحابہ میں منفرد مقام حاصل تھا۔[۸]

(۲۱) معاشرتی ناہمواریوں کی اصلاح

معاشرے میں تدریجی طور پر جو اختلاف پیدا ہو چکا تھا اور لوگوں کے ذہنوں میں رچ بس گیا تھا...

۱۔ وحی و نبوت ص ۱۳۱

۲۔ ظاہراً یہ گفتگو دوبارہ پیش کی گئی ہے۔ مجھے جو یاد ہے وہی عرض کر رہا ہوں۔

۳۔ یمن وہ سرزمین ہے جہاں کے باشندوں نے لشکر کشی کے بغیر اسلام قبول کیا اور اس کا سبب آنحضرت ﷺ کا وہ مکتوب مبارک ہے جو آپ نے فارس کے بادشاہ خسرو پرویز کو لکھا تھا اور اسے اسلام کی دعوت تھی۔

۴۔ صحیح بخاری ج ۵، ص ۲۰۳ میں یہ الفاظ مذکور ہیں یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَبَشِّرْ وَلَا تُنَفِّرْ یعنی آسانی سے کام لو سختی نہ کرو۔ لوگوں کو خوش خبری دے کر انھیں اسلام کی طرف مائل کرو اور ان کو متنفر نہ کرو۔ (افعال صیغہ تثنیہ کی صورت میں ہیں)

۵۔ سیری در سیرۂ نبوی، باب پیغمبر اکرم ﷺ کا انداز تبلیغ، ص ۲۰۹، ۲۱۱۔ حماسہ حسینی ج ۱، ص ۲۵۱ ۔ ۲۵۴

۶۔ وحی و نبوت ص ۱۳۹۔ بحار الانوار ج ۲۲، ص ۱۰۷

۷۔ حاکم نیشاپوری، مستدرک علی الصحیحین ج ۳، ص ۱۴۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب ج ۳، ص ۵۳

۸۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۱۹۷۔۱۹۸۔ تفصیل کے لیے اسی کتاب کے صفحات ۱۸۸ تا ۱۹۰ کا مطالعہ فرمائیں۔

آنحضرت ﷺ نے اس اونچ نیچ کو ختم کیا۔ اس کے لیے ہم چند مثالیں بیان کرتے ہیں۔[1]

(۱) لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا۔ ایک سفر کے دوران یہ طے پایا کہ گوسفند ذبح کیا جائے اور اس سے دوپہر کا کھانا تیار کیا جائے۔ ایک صحابی نے کہا کہ اس کو ذبح کرنا میرے ذمے ہے، دوسرے نے کہا کہ کھال اتارنا میرے ذمے ہے، تیسرے نے کہا کہ اس کا پکانا میرے ذمے ہے۔ یہ سن کر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ صحرا سے لکڑیاں چننا میرے ذمے ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! آپ زحمت نہ کریں۔ آپ تشریف رکھیں ہم لکڑیاں جمع کرلیں گے... آپ نے فرمایا کہ خدا کو پسند نہیں کہ کوئی شخص اپنے دوستوں کے درمیان دوسروں سے الگ امتیاز جتا کر بیٹھے۔[2]

رسول اکرم ﷺ اور ائمہ اطہارؑ کی زندگی میں ہمیں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ یہ امتیازات اگرچہ ظاہری طور پر چھوٹے ہیں مگر انہی امتیازات کی وجہ سے معاشروں میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔[3]

(۲) زینب سے شادی۔ (معاشرتی اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لیے اس داستان کو ملاحظہ فرمائیں)۔ حضرت زید بن حارثؓ انتہائی عظیم القدر صحابی تھے... جنگ موتہ میں وہ حضرت جعفر بن ابی طالبؑ کے ساتھ شہید ہوئے۔ لوگ اس جوان کو رسول خدا ﷺ کا منہ بولا بیٹا کہتے تھے۔[4]

(رسول اکرم ﷺ نے قبائلی اونچ نیچ پر یوں کاری ضرب لگائی کہ) آپ نے اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب بنت جحش کے ساتھ ان کا نکاح کردیا لیکن زینب پہلے ہی دن سے زید کو ناپسند کرتی تھیں اور شادی کے بعد بھی زوجین میں محبت قائم نہ ہوسکی اور زینب ہر وقت اپنے شوہر کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتی تھیں... آخرکار زید نے انھیں طلاق دے دی۔[5] پھر رسول اکرم ﷺ نے ان سے عقد کرلیا۔ عیسائی پادری اس نکاح پر اعتراض کرتے رہتے ہیں... اُس وقت کے بہت سے اہل عرب کے لیے بھی یہ نئی بات تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے منہ بولے بیٹے کی سابقہ بیوی سے نکاح کیا ہے... قرآن مجید[6] نے اس رسم کو منسوخ کیا۔[7]

۱۔ بیست گفتار ص ۱۴۰، ۱۴۱ ۲۔ محدث قمی، کحل البصر ص ۶۸

۳۔ محدث قمی، کحل البصر ص ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ داستان راستان ج ۲۔ ا، شمارہ ۶، ص ۳۴۔ ۳۵

۴۔ ☆ جب آٹھ سالہ زید نے اپنے والد اور چچا کے ساتھ جانے سے انکار کیا اور اُن پر رسول اکرم ﷺ کو ترجیح دی تو آپ اسے اپنے ساتھ لے کر صحن کعبہ میں تشریف لائے اور فرمایا: اے لوگو! گواہ رہنا آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ یہ میری میراث پائے گا اور میں اس کی میراث پاؤں گا۔ اس اعلان کے بعد زید، رسول اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہوگئے اور انھیں زیدؓ بن محمدؐ کہا جانے لگا۔ حضرت زید کی سرگزشت کے لیے دیکھیے: علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب "اسلامی عقائد قرآن کی روشنی میں" نیز متبنّٰی گیری کی رسم کے خاتمہ کے لیے سورۂ احزاب کی آیت ۴ اور ۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (رضوانی)

۵۔ اس کے بعد زید نے ام ایمن سے نکاح کیا اور اُن سے اسامہ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔

۶۔ سورۂ احزاب: آیت ۴۰ ۷۔ خاتمیت ص ۱۵، ۱۷

(۳) جویبر و ذلفا۔ جویبر کا تعلق اصحاب صفہ سے تھا۔ ایک دن رسول اکرم ﷺ نے جویبر سے فرمایا:... تم زیاد بن لبید انصاری کے گھر جاؤ اور اس سے کہو کہ رسول خداؐ نے مجھے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپ اپنی بیٹی ذلفا سے میرا نکاح کردیں۔

جویبر رسول خدا ﷺ کا پیغام لے کر زیاد بن لبید کے گھر گئے۔ زیاد مدینہ کے ایک محترم اور معزز شخص تھے... جویبر نے زیاد سے کہا کہ رسول خدا ﷺ نے مجھے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپ اپنی بیٹی ذلفا کا میرے ساتھ نکاح کردیں...زیاد کہنے لگے کہ ہم اپنی بیٹیوں کی شادی اپنے خاندان سے باہر نہیں کرتے۔ تم جاؤ، میں رسول خدا ﷺ سے خود مل لوں گا... چنانچہ وہ رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کی طرف سے جویبر ہمارے پاس ہماری بیٹی کے لیے پیغام لایا ہے۔ ہماری رسم یہ ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں کے رشتے اپنی برادری میں ہی کرتے ہیں۔

آپ نے ارشاد فرمایا: يَا زِيَادُ! جُوَيْبِرٌ مُؤْمِنٌ وَ الْمُؤْمِنُ كُفْوٌ لِلْمُؤْمِنَةِ وَ الْمُسْلِمُ كُفْوٌ لِلْمُسْلِمَةِ

زیاد! جویبر مومن ہے اور مومن مرد ہی مومن عورت کا کفو ہے اور مسلمان مرد ہی مسلمان عورت کا ہمسر ہے۔[1]

زیاد واپس آیا اور اس نے اپنی بیٹی سے ماجرا بیان کیا۔ ذلفا نے کہا چونکہ اسے رسول خدا بھیجا ہے لہٰذا میں راضی ہوں۔ چنانچہ زیاد نے اپنی قوم کے سامنے سنت پیغمبرؐ کے مطابق اپنی بیٹی کا نکاح اس سیاہ فام مفلس سے کردیا۔[2] ان دونوں کی شادی کے بعد ایک جنگ میں جویبر نے شرکت کی اور کفار سے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔[3]

اسلام میں قیادت اور رہبری کے شرائط

پیغمبر اسلام ﷺ میں قیادت و رہبری کے تمام اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے مثلاً یقین، قطعی فیصلہ، شک سے دوری، شجاعت، اقدام اور ممکنہ نتائج سے بے خوف ہونا، پیش بینی اور دور اندیشی، تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ، لوگوں کی صحیح پہچان اور ان کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ اور صلاحیت کے مطابق اختیارات کی

۱۔ کافی ج ۵، ص ۳۴۱

۲۔ جویبر یمامہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے مدینہ آکر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ ٹھنگنی قد کا انتہائی بدصورت اور مفلس شخص تھا۔ اس کا مدینہ میں کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ وہ رات کے وقت مسجد میں سویا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ حکم نازل فرمایا کہ مسجد سونے کی جگہ نہیں ہے اس کے بعد مسجد میں جتنے دروازے کھلتے تھے وہ آنحضرت ﷺ نے بند کرا دیے البتہ حضرت علیؑ کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دیا۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ باہر سے آئے ہوئے صحابہ کے لیے ایک سائبان اور چبوترہ بنا دیا جائے۔ اس سائبان کو "صفہ" کہا جاتا تھا اور وہاں رہنے والے افراد کو "اصحاب صفہ" کہا جاتا تھا۔ (بیست گفتار ص ۱۳۶۔۱۳۷)

۳۔ داستان راستان ج ۱۔۲، شمارہ ۷۸، ص ۲۳۴۔۲۳۵۔ کافی ج ۵، ص ۳۴

سپردگی۔ ذاتی معاملات میں نرمی اور اصولی معاملات میں سختی، اپنے پیروکاروں کا احترام اور ان کی ذہنی، جذباتی اور عملی قوتوں کی پرورش، نظم اور اندھی تقلید سے دوری، تواضع، سادگی، درویشی، وقار و متانت اور اپنے مشن سے شدید محبت جیسی تمام صفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں درجۂ کمال پر پائی جاتی تھیں۔ آپ نظم و ضبط کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ فرمایا کرتے جب تین افراد مل کر سفر کر رہے ہوں تو انھیں چاہیے کہ ان میں سے ایک شخص کو اپنا امیر بنا لیں (رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قیادت و رہبری کی جو دوسری صفات پائی جاتی تھیں ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں)۔[۱]

(۱) زہد اور سادگی۔

زہد اور سادگی آپ کی زندگی کے اہم اصول تھے۔ آپ ہمیشہ سادہ غذا تناول فرماتے تھے، سادہ لباس پہنتے تھے اور سادہ انداز سے چلا کرتے تھے۔ آپ زیادہ تر چٹائی اور بوریے پر سوتے تھے۔ آپ خاک پر بیٹھتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے بکری کا دودھ دوہتے تھے اور جانور کی پیٹھ پر پالان اور زین کے بغیر سوار ہوتے تھے۔ اگر کوئی آپ کی سواری کی رکاب تھامتا تو آپ اسے سختی سے منع کر دیتے تھے۔[۲]

آپ کی غذا عام طور پر جو کی روٹی اور خرما ہوتی تھی۔ آپ اپنے جوتے کو خود گانٹھتے اور لباس کو اپنے ہاتھوں سے رفو کرتے تھے مگر اس سادگی کے باوجود "فلسفۂ فقر" کے حامی نہیں تھے۔[۳]

(۲) ارادہ و استقامت۔

آپ بے نظیر استقامت اور مصمم ارادے کے مالک تھے۔ آپ کی یہ صفت آپ کے اصحاب میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ آپ کا تیئیس سالہ دور نبوت آپ کے آہنی ارادے اور استقامت کا مظہر ہے۔ آپ کی زندگی

۱۔ وحی و نبوت ص ۱۳۰ ۔ ۱۳۱

۲۔ حضرت علیؑ کوفہ جاتے ہوئے جب انبار شہر پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے، جو ایرانی تھے، آپ کی سواری کے آگے دوڑنا شروع کر دیا۔ حضرت علیؑ نے ان سے فرمایا کہ یہ کام دنیا میں تمھیں تھکانے کا سبب ہے اور آخرت میں تمہارے لیے بدبختی کا باعث ہے۔ علاوہ ازیں اس سے تمہارے حاکم کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ (داستان راستان ج ۲۔۱، شمارہ ۹، ص ۳۰)

۳۔ وحی و نبوت ص ۱۳۶ ۔ ۱۳۷ ۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۱۱۰، ۱۱۳ ۔ ۱۱۴ ۔ بیست گفتار ص ۱۳۱

☆ دنیا سے بے رغبتی، ترک محنت اور خشک زندگی کا تصور "صوفیانہ زہد" ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بات ناممکن ہے کہ اسلام جیسا آفاقی اور ابدی دین ترک دنیا اور خشک زندگی نیز بھوک اور نفس کشی کی تعلیم دے۔ بغداد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کامل مصطفیٰ شیبی نے اپنی کتاب (الصلة بین التصوف والتشیع جو Sufism and Shi'ism کے نام سے ۱۹۹۱ء میں برطانیہ سے شائع ہوئی ہے) میں زہد کا غلط مفہوم بیان کیا ہے اور غلط لکھا ہے کہ اسلام فقر کی تعلیمات لے کر آیا تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دین کی بنیاد فقر اور زہد کو قرار دیا تھا۔ کسی نے امام علیؑ سے زہد کا مفہوم پوچھا تو آپ نے فرمایا: زہد فی الدنیا سے مراد امیدوں کا مختصر رکھنا، ہر نعمت کا شکر ادا کرنا اور محرمات سے پرہیز کرنا ہے۔ (رضوانی)

میں کئی ایسے مواقع آئے کہ ظاہری طور پر ہر طرف ناامیدی چھائی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود آپ کے ایمان میں ذرہ برابر بھی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

(۳) قیادت و مشاورت۔

آپ کے اصحاب اگرچہ فوراً ہی آپ کے فرمان پر عمل کرتے تھے... لیکن آپ نے بھی استبدادی طریقہ اختیار نہیں کیا۔ جن معاملات میں خدا کی طرف سے حکم نہیں ہوتا تھا، اُن معاملات میں آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کرتے تھے... اس طرح سے ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی تھی۔[۱]

(۴) نظم وضبط۔

آپ نظم وضبط کے سخت پابند تھے۔ آپ نے اپنے اوقات کو تقسیم کر رکھا تھا۔ صحابہ نے آپ سے یہ سبق سیکھا تھا اسی لیے ان کی زندگی میں بھی نظم وضبط پایا جاتا تھا اور وہ آپ کے فرمان کی تعمیل کرتے تھے۔

(۵) دشمن کو غافل رکھنا۔

جب آپ جنگ کے لیے کسی جماعت کو بھیجتے تو اُس کے امیر کو ایک خط لکھ کر دیتے اور کہتے کہ جب تم فلاں مقام پر پہنچو تو اس خط کو کھول کر پڑھ لینا اور اس میں موجود ہدایات پر عمل کرنا۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ مقررہ مقام پر پہنچنے سے قبل انھیں علم نہیں ہوتا تھا کہ اُن کو کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اس طرح دشمن اور دشمنوں کے جاسوس آپ کی حکمت عملی سے بے خبر اور آپ کے پروگرام سے غافل رہتے تھے۔[۲]

(۶) تنقید کا خیر مقدم اور چاپلوسی سے نفرت۔

آپ کو بعض اوقات اپنے صحابہ کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آپ اعتراض کرنے والے صحابہ سے ناراض نہیں ہوتے تھے بلکہ انھیں اپنے فیصلے کے مضمرات سے آگاہ کر کے اپنا ہمنوا بنایا کرتے تھے مگر آپ کو خوشامد اور چاپلوسی سے شدید نفرت تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ خوشامد کرنے والوں کے منہ پر خاک پھینکو۔[۳]

(۷) توہمات کا مقابلہ

آنحضرت ﷺ لوگوں کی کمزوریوں اور ان کی جہالت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ اس کے برعکس آپ لوگوں کو ان کی جہالت اور کمزوریوں سے آگاہ کرتے تھے۔[۴]

(اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں) ماریہ قبطیہ سے رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے ایک بیٹا عطا کیا تھا جس کا نام ابراہیم تھا... وہ آنحضرت ﷺ کو بہت پیارا تھا اور اٹھارہ ماہ کی عمر میں اس کی وفات ہوئی۔ آنحضرت ﷺ سراپا مہر ومحبت تھے لہٰذا آپ اپنے بیٹے کی موت سے سخت غمگین ہوئے۔ آنحضرت ﷺ کو مغموم دیکھ کر تمام

۱۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۴۳

۲۔ وحی ونبوت ص ۱۳۷، ۱۳۹۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ محمد بن عمر واقدی، المغازی ج ۱، ص ۱۳۔ ۱۴

۳۔ وحی ونبوت ص ۱۳۹

۴۔ وحی ونبوت ص ۱۴۰

مسلمان غم زدہ ہو گئے۔ اتفاق سے اس دن سورج کو گرہن لگا۔ مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے غم کی وجہ سے آسمانی مظاہر بھی غمگین ہوئے ہیں۔[۱] رسول اللہ ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھائیں بلکہ آپ کی خواہش تھی کہ لوگوں کی بیداری سے فائدہ اٹھایا جائے... چنانچہ آپ منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا کہ آج ہونے والے سورج گرہن کا میرے بیٹے کی موت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[۲]

(۸) جاہلانہ عقائد کا مقابلہ

تاریخ بیان کرتی ہے کہ جب ایرانی شہنشاہ کورش اعظم (سائرس) نے بابل فتح کیا تو اس نے لوگوں کو عقیدے کی آزادی دے دی یعنی بت پرستوں کو بت پرستی، حیوان پرستوں کو حیوان پرستی کی اجازت دی مگر کورش کے برعکس حضرت ابراہیم کا عقیدہ یہ تھا کہ ایسی جاہلانہ باتیں عقیدہ کہلانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ یہ عقائد نہیں بلکہ ایسی زنجیریں ہیں جنھوں نے لوگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسے عقائد کا احترام نہیں کیا بلکہ پہلی فرصت میں بتوں کو توڑ ڈالا اور بڑے بت کے کندھے پر کلہاڑا رکھ کر گھر چلے آئے۔ قرآن مجید کے مطابق اس کے بعد بت پرستوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ انھیں اپنی انسانیت کا ادراک ہونے لگا... حضرت رسول اکرم ﷺ کے کردار کو ملاحظہ کیجیے کہ کیا آپ نے فتح مکہ کے بعد وہی کام کیا تھا جو کورش نے بابل فتح کرنے کے بعد کیا تھا[۳] یا آپ نے سنت ابراہیمؑ پر عمل کیا تھا؟ آنحضرت ﷺ نے آزادیٔ عقیدہ کے نام پر بتوں کو باقی نہیں رہنے دیا تھا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ بت انسانوں کی فکری قید کا موجب ہیں... اسی لیے فتح مکہ کے بعد آپ نے تمام بتوں کو توڑ دیا اور لوگوں کو حقیقی آزادی دلا دی۔[۴]

(۹) نسلی اور قبائلی تعصبات کا مقابلہ

تمام مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بہت سے مواقع پر یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے:

اَیُّهَا النَّاسُ کُلُّکُمْ لِاٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰی اے لوگو! تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ خاک سے بنے تھے، کسی عرب کو غیر عرب پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے سوائے تقویٰ کے۔[۵]

ایک روایت کے مطابق اپنے گمراہ آباء و اجداد پر فخر کرنے کو آنحضرت ﷺ نے انتہائی مذموم قرار دیا اور اس طرح کے لوگوں کو آپ بھونرے سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔[۶]

۱۔ اس بات میں اپنی حد تک تو کوئی رکاوٹ نہیں۔ ممکن ہے کہ رسول خداؐ کے لیے دنیا زیر و زبر ہو جائے۔ یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے

۲۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۱۳۶۔۱۳۸

۳۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ۱۰۳۔۱۰۴۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۵۱۔ ۲۵۳

۴۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۱۵
اسلام کی نظر میں آزادی اور جمہوریت کی اہمیت کے لیے اسی کتاب کا صفحہ ۱۰۳ دیکھیے۔

۵۔ تحف العقول ص ۳۴۔ سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۴۱۴

۶۔ سنن ابی داؤد ج ۲، ص ۶۲۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمان فارسیؓ اور بلال حبشیؓ کو بھی اسی شفقت سے نوازا تھا جس سے آپ نے ابوذر غفاریؓ، مقداد بن اسود کندیؓ اور عمار بن یاسرؓ کو نوازا تھا۔ البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ سلمان فارسیؓ اپنے ایمان کی وجہ سے ان پر سبقت لے گئے اور انھوں نے سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ کا اعزاز حاصل کیا۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اس بات پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان قومی تعصبات پیدا نہ ہوں کیونکہ اس کا ردعمل ضرور ہوتا ہے ...

اسلام میں قومی و نسلی تعصبات کی کوئی گنجائش نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تعلیم کا مسلمانوں بالخصوص غیر عرب مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں (خواہ عرب ہوں یا غیر عرب) نے ہمیشہ اسلام کو اپنا اثاثہ سمجھا۔ انھوں نے کبھی اسلام کو اجنبی نظریہ نہیں سمجھا۔

اُموی خلفاء اگرچہ غیر عرب مسلمانوں کی تحقیر کیا کرتے تھے، اس کے باوجود غیر عرب مسلمان، اسلام سے متنفر نہیں ہوئے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خلفاء کے کردار کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ لوگوں کو ہمیشہ اس بات پر اعتراض تھا کہ خلفاء اسلامی قوانین پر عمل کیوں نہیں کرتے ؟[2]

(۱۰) اصولوں کی پاسداری

قبیلہ ثقیف کے کچھ افراد رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ... (اور بولے کہ) آپ ہماری تین شرطیں مان لیں تو ہم اسلام قبول کرنے کو تیار ہیں۔ ہماری پہلی شرط یہ ہے کہ ہمیں اجازت دیجئے کہ ایک سال تک ہم اپنے بتوں کی عبادت کریں ... دوسری شرط یہ ہے کہ ہمیں نماز پڑھنے سے معاف رکھیں کیونکہ نماز پڑھنا ہمارے لئے بہت گراں ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ہم اپنے بڑے بت کو خود اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں تمہاری تین شرائط میں سے صرف آخری شرط منظور ہے۔ کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے بت کو خود نہ توڑو۔ اس کے لیے ہم کسی شخص کو بھیج دیں گے جو یہ کام کر دے گا مگر تمہاری پہلی دو شرائط ہرگز قبول نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ رسول خداؐ اتنے اصول پرست تھے کہ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ یہ لوگ مدتوں سے بت پرستی کر رہے ہیں انھیں ایک سال کی مزید اجازت دے دی جائے تو ایک سال کے بعد پورا قبیلہ مسلمان ہوجائے گا۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر قبیلہ ثقیف ایک سال کی بجائے ایک دن کے لیے بھی بت پرستی کی اجازت مانگتے اور بعد میں مسلمان ہونے کا اعلان کرتے تب بھی آپ انھیں ہرگز اجازت نہ دیتے۔ آپ اصولوں پر سمجھوتہ ہرگز نہیں کرتے تھے۔[3]

۱۔ محدث قمی، سفینۃ البحار، مادہ مسلم۔ بحار الانوار ج ۱۰، ص ۱۲۱۔ ج ۱۱، ص ۱۳۸

۲۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۷۳۔ ۷۵

۳۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۱۳۳

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یوم ولادت اور یوم وفات کی طرح مورخین آپ کے روز بعثت پر بھی متفق نہیں ہیں۔ ایک حد تک شیعہ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ماہ رجب کی ستائیس تاریخ کو مبعوث ہوئے تھے جبکہ سنی مورخین کہتے ہیں کہ ماہ رمضان میں آپ اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے تھے۔[1]

بعثت کے ابتدائی ایام میں وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ یعنی آپ اپنے قریبی رشتے داروں کو خبردار کریں (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۴) کی آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نزول سے پہلے آپ نے دعوت عام کا آغاز نہیں کیا تھا۔

ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ آپ کھانے کا انتظام کریں اور بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو دعوت پر بلائیں۔ چنانچہ اُن لوگوں کو آپ کی جانب سے دعوت دی گئی ...جب سب جمع ہو گئے تو ابولہب نے مداخلت کی اور محفل درہم برہم کردی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ لوگوں کو دعوت پر بلائیں... اس بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جو سب سے پہلے میری دعوت قبول کرے گا وہ میرا وصی، وزیر اور جانشین ہوگا۔

حضرت علیؑ کے علاوہ کسی نے بھی مثبت جواب نہ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار اس اعلان کو دہرایا۔ ہر بار حضرت علیؑ ہی کھڑے ہوتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخر میں فرمایا کہ اے علیؑ! تم ہی میرے وزیر، وصی اور میرے بعد میرے جانشین ہوگے...[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین سال تک خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس عرصے میں آپ نے لوگوں کی شخصیت سازی پر توجہ دی اور کچھ لوگوں کو آئین توحید کی طرف راغب کر لیا جن میں حضرت خدیجہؑ، حضرت علیؑ، زید بن حارثہ، زبیر بن عوام، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبیداللہ، ابوعبیدہ بن جراح، ابوسلمہ، ارقم بن ابی ارقم، عثمان بن مظعون، قدامہ بن مظعون، عبداللہ بن مظعون، عبیدہ بن حارث، سعید بن زید، خباب بن اَرت، ابوبکر بن ابی قحافہ اور عثمان بن عفان ...شامل تھے۔

ان تین سالوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کچھ صحابہ کو ساتھ لے کر مکہ کے پہاڑی دروں میں تشریف جاتے اور قریش سے چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔

۱۔ بحار الانوار ج ۱۸، ص ۱۹۰۔ ابن کثیر، سیرۃ النبویہ ج ۱، ص ۳۹۳

۲۔ طبری، تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۱۷۔ ابن اثیر، تاریخ کامل ج ۲، ص ۶۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱۳، ص ۲۱۱

دعوت عام

جب تک رسول خدا ﷺ مکہ میں رہے قریش آپ کو تبلیغ کی اجازت نہیں دیتے تھے اور آپ کی تبلیغ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے۔ آپ کے لیے یہ صورت حال انتہائی ناخوش گوار اور کٹھن تھی، البتہ حرمت والے مہینوں میں وہ آپ کو تبلیغ سے نہیں روکتے تھے۔

آپ اس موقع سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ جب لوگ میدان عرفات میں لگنے والے بازار عکاظ[1] میں آتے ... تو آپ وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے مگر وہاں بھی ابولہب سائے کی طرح آپ کے پیچھے چلتا رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ ان کی باتوں پر دھیان مت دو۔ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

ایک ایسے ہی بازار میں ایک قبیلے کے باشعور سردار نے آنحضرت ﷺ کی گفتگو سنی تو اپنی قوم سے کہنے لگا: لَاَكَلْتُ بِهِ الْعَرَبَ یعنی مجھے اس شخص میں اتنی صلاحیت دکھائی دیتی ہے کہ اگر یہ میرا ساتھ دے تو میں سارے عرب کو نگل جاؤں۔ اُس نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ میں اور میری قوم آپ پر ایمان لانے کے لیے تیار ہے مگر اس کے لیے میری شرط یہ ہے کہ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ اپنے بعد مجھے یا ہم میں سے کسی آدمی کو اپنا جانشین مقرر کریں گے (یقیناً ان لوگوں کا ایمان حقیقی ایمان نہیں تھا)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرے جانشین کا فیصلہ میرے ہاتھ میں نہیں خدا کے ہاتھ میں ہے۔[2]

رسول اکرم ﷺ کی اہل مدینہ سے شناسائی

مدینہ کے دو قبیلے اوس و خزرج آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص اسعد بن زرارہ مکہ آیا تاکہ قریش سے مخالف قبیلے کے خلاف کمک حاصل کرے۔ چنانچہ وہ ایک قریشی سے ملا ... جب اُس نے کعبہ کی زیارت کے لیے جانے کا ارادہ کیا تو اُس کا میزبان کہنے لگا ... ہمارے ہاں ایک شخص ظاہر ہوا ہے۔ وہ بہت بڑا جادوگر ہے ... خیال رکھنا کہ اُس کی آواز تمہارے کانوں میں نہ پڑے ورنہ وہ تمھیں بے بس کر دے گا ... جب وہ طواف کعبہ کے لیے گیا تو رسول اکرم ﷺ حجر اسماعیل (حطیم) میں بیٹھے ہوئے بلند آواز سے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ اُس شخص نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی تھی تاکہ آپ کی آواز اُس کے کانوں میں نہ پڑے۔

۱۔ ☆ بازار عکاظ مجد کے بالائی حصے میں لگایا جاتا تھا۔ یہ جگہ طائف سے ایک دن اور مکہ سے تین دن کی مسافت پر واقع تھی۔ بازار ذوالمجاز میدان عرفات سے ایک فرسخ کے فاصلے پر لگتا تھا۔ ۸ ذی الحجہ تک لوگ وہاں رہتے اور نویں کو مناسک حج ادا کرنے عرفات چلے جاتے تھے۔ (دیکھیے: علامہ سید مرتضیٰ عسکری، احیائے دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار، جلد ۲ بحوالہ تاریخ یعقوبی، تاریخ طبری، مروج الذہب اور سیرت ابن ہشام) رضوانی

۲۔ مجموعہ آثار ج ۴، ص ۸۷۹۔۸۸۰۔ امامت و رہبری ص ۱۰۲، ۱۰۳

وہ شخص طواف میں مشغول تھا کہ اچانک آنحضرت ﷺ کے چہرۂ اقدس پر اُس کی نظر پڑ گئی (آپ بے حد حسین وجمیل تھے) اُس شخص نے دل میں کہا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ وہی آدمی ہو جس کے متعلق مجھے ڈرایا گیا ہے؟... چنانچہ اُس نے اپنے کانوں سے روئی نکالی تو قرآن کریم کے الفاظ اُس کے دل میں اتر گئے اور وہ آنحضرت ﷺ کی طرف مائل ہوا۔ یہی بات اہل مدینہ کی آنحضرت ﷺ سے آشنائی کا سبب بن گئی۔

اس کے بعد اہل مدینہ نے آنحضرت ﷺ سے کئی خفیہ ملاقاتیں کیں یہاں تک اہل مدینہ کی ایک جماعت (مکہ) آئی اور انھوں نے آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی۔[1]

بالآخر یہی بیعت آنحضرت ﷺ کے مدینہ ہجرت کرنے کا سبب بنی۔ پھر آنحضرت ﷺ نے مصعب بن عمیر کو مدینہ روانہ کیا... اس عظیم مبلغ کی وجہ سے لوگوں کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا اور مدینہ کی فضا آنحضرت ﷺ کی آمد کے لیے ہموار ہوگئی۔ دوسری جانب قریش کی سختی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ آنحضرت ﷺ کو اسلام کی تبلیغ نہیں کرنے دیں گے...

دارالندوہ میں مجلس مشاورت

عقبہ ثانی کے بعد قریش کے سرداروں کو خطرے کا احساس ہوا اور بعثت کے چودھویں سال ماہ صفر کے آخر میں انھوں نے دارالندوہ میں ایک اجلاس بلایا۔ دارالندوہ کو " مکہ کی سینیٹ " کا درجہ حاصل تھا... وہاں انھوں نے کئی تجاویز پر غور کیا... چنانچہ شیعہ اور سنی مورخین لکھتے ہیں کہ ایک بوڑھا اس اجتماع میں وارد ہوا اور بولا کہ میرا تعلق نجد سے ہے... اُس نے ایک تجویز پیش کی جسے قبول کرلیا گیا۔ وہ تجویز یہ تھی کہ قریش کے ہر قبیلے سے ایک آدمی پیغمبر اکرم ﷺ کے قتل میں شرکت کرے اور بنی ہاشم میں سے بھی ایک شخص شریک ہو اور سب مل کر پیغمبر اکرم ﷺ کو قتل کردیں۔ اس طرح سے اُن کا خون رائیگاں جائے گا...

رسول اکرم ﷺ کی ہجرت

بعثت کے دسویں سال دو اندوہناک واقعات پیش آئے جن سے مسلمان بالخصوص رسول اکرم ﷺ بہت متاثر ہوئے اور وہ آپ کے چچا حضرت ابو طالبؑ اور آپ کی وفادار زوجہ حضرت خدیجہؑ کی وفات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مکہ کو شہر امن " بلد امین " قرار دیا ہے لیکن اس شہر امن میں رسول اکرم ﷺ اور آپ کے رفقاء کو امن نہ مل سکا۔ ہر طرف سے انھیں دھمکیاں اور ایذائیں دی جانے لگیں۔ اسی لیے بعثت کے گیارہویں سال رسول اکرم ﷺ تبلیغ اور نئے ہم پیمان بنانے کے لیے اکیلے طائف تشریف لے گئے۔ آپ چاہتے تھے کہ قبیلۂ ثقیف کے سرداروں سے رابطہ کریں اور انھیں اسلام کی دعوت دیں لیکن یہ سفر آپ کے لیے

۱۔ یہ بیعت جو ۱۳ ذی الحجہ کی رات کو ہوئی تھی بیعت عقبہ ثانی کہلاتی ہے۔

بہت تکلیف کا باعث بنا۔ اس سفر کی تلخ یادیں آپ کو ہمیشہ ستاتی تھیں۔[۱]

ربیع الاول کی پہلی رات قریش نے آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو آپ پر وحی کے وہی الفاظ نازل ہوئے جو حضرت موسیٰؑ کے ایک بہی خواہ نے اُن سے کہے تھے ...اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ شہر کے سردار آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں لہٰذا آپ یہاں سے نکل جائیں۔ (سورۂ قصص: آیت ۲۰)

وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ (اس واقعے کا بھی ذکر کیجیے) جب کافر آپ کے خلاف منصوبہ بنا رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ (سورۂ انفال: آیت ۳۰)

قتل کے لیے جمع ہونے والوں نے رات کو اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا... ابولہب نے لوگوں کو منع کیا اور کہا کہ رات کے وقت کسی کے گھر میں جانا ٹھیک نہیں ہے... ہمیں صبح تک انتظار کرنا چاہیے (دشمن ہونے کے باوجود اُس میں اتنی غیرت موجود تھی)۔ بہر حال انھوں نے آنحضرت ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور پہرہ دینے لگے...

تمام محدثین اور مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے اُس رات حضرت علیؑ کو بلایا اور اُن سے فرمایا: اے علیؑ! تمھیں آج رات میرے لیے جاں نثاری کا مظاہرہ کرنا ہوگا...[۲] میں رات کے وقت جو چادر اوڑھ کر سوتا ہوں وہی تم اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ۔ حضرت علیؑ نے عرض کیا: بہت اچھا۔

اس سے پہلے حضرت علیؑ اور ہند بن ابی ہالہ نے رسول اکرم ﷺ کے چھپنے کے لیے غار ثور کا انتخاب کیا تھا۔ یہ بات طے پائی تھی کہ رسول اکرم ﷺ کچھ دن اس غار میں رہیں گے اور یہ دونوں آپ کو سواری فراہم کریں گے اور جتنے دن آپ وہاں رہیں گے آپ کو کھانا پہنچانے کا انتظام کریں گے۔ چنانچہ رات ہوئی تو حضرت علیؑ آپ کے بستر پر سو گئے اور رسول اکرم ﷺ گھر سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں حضرت ابوبکرؓ اُن سے ملے۔ آپ نے انھیں ساتھ لیا اور مکہ کے مغرب میں واقع غار ثور میں جا کر چھپ گئے۔[۳]

قریش کو یقین تھا کہ رسول اکرم ﷺ کہیں باہر نہیں گئے ہوں گے۔ اتنے میں اچانک ایک شخص بستر سے اٹھا۔ انھوں دیکھا کہ وہ حضرت علیؑ تھے...

۱۔ یاد ایام ج ۲، ص ۹۵۔۹۶

۲۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت علیؑ کی اس فداکاری کا یوں تذکرہ کیا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝ اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۷) شیخ مفید، الارشاد ج ۱، ص ۵۱

۳۔ یہ غار مکہ کے جنوب میں مدینہ کے راستے پر واقع ہے۔

پھر وہ لوگ آنحضرت ﷺ کے قدموں کے نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے غار ثور تک جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے محسوس کیا کہ اس غار میں کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ مکڑی نے وہاں جالا بُنا ہوا ہے اور ایک پرندہ ہے اور اُس کا گھونسلہ ہے۔

یہ منظر دیکھا تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ یہاں تو کوئی نہیں آیا۔ یہ لوگ غار کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اُن کی آوازیں سن رہے تھے لہٰذا حضرت ابوبکرؓ بے چین ہو گئے، اُن کا دل کی تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ خوفزدہ ہو گئے۔ یہ بات قرآن مجید[۱] میں بیان کی گئی ہے۔ یہ کوئی روایت نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ اسے شیعہ قبول کرتے ہیں اور سنی قبول نہیں کرتے۔ وہ آیت یہ ہے: إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا...

تم نے اگر نبی کی مدد نہ تو کچھ پروا نہیں، اللہ اُس کی مدد اُس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" (سورۂ توبہ: آیت ۴۰)

... تعاقب میں آنے والے وہاں سے واپس لوٹ آئے ... انھوں نے کئی دن آپ کی تلاش جاری رکھی مگر وہ آپ کو پا نہ سکے۔ تین شبانہ روز یا اس سے بھی زیادہ وقت آپ اس غار میں پوشیدہ رہے۔[۲]

حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے اُن کے بیٹے ہند بن ابی ہالہؓ[۳] ایک جلیل القدر شخص تھے۔ وہ خفیہ طور پر کھانا لے جاتے اور بچ بچا کے واپس آجاتے تھے۔ حضرت علیؑ اور ہند بن ابی ہالہ نے پہلے سے طے کیا تھا کہ وہ دو سواریاں روانہ کریں گے چنانچہ انھوں نے رات کے وقت سواریاں بھیجیں اور رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ ان پر سوار ہوئے اور مدینہ روانہ ہو گئے۔[۴]

آپ سوموار کے دن بارہ ربیع الاول کو قبا نامی بستی میں پہنچے (یہ مدینہ سے دو فرسخ کے فاصلے پر ہے) آپ وہاں حضرت علیؑ اور ان کے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگے۔ وہ بھی اسی ماہ کے وسط میں آپ کے پاس پہنچ گئے۔ پھر جمعہ کے دن سب مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آنحضرت ﷺ مدینہ پہنچے اور ابو ایوب انصاریؓ کے گھر میں قیام فرمایا۔ پھر آپ نے نماز جمعہ قائم کی۔ آنحضرت ﷺ نے إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ[۵] کے عموی

۱۔ ☆ قرآن مجید نے حضرت ابوبکرؓ کا نام نہیں لیا ہے بلکہ اُن کے "ساتھی" کہا ہے، تاریخ نے اُن کا نام لیا ہے۔ (رضوانی)

۲۔ یہ بات مسلم ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تین راتیں غار ثور میں گزاریں۔ چوتھی رات حضرت علیؑ نے اُرَیقط نامی ایک شخص کو غار میں بھیجا۔ آنحضرت ﷺ اس کے ساتھ ساحلی راستے سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ (رضوانی)

۳۔ ☆ تفسیر قمی اور تفسیر و حدیث کی کتابوں میں جناب ہند بن ابی ہالہؓ سے کئی روایات منقول ہیں۔

۴۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۲۴ ـ ۳۱

۵۔ سورۂ حجرات: آیت ۱۰۔ سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۳

قانون کی بنیاد پر اوس و خزرج اور مہاجرین مکہ کے درمیان مواخات قائم کی۔ اس طرح آپ نے مسلمان معاشرہ تشکیل دیا۔[۱] آپ کی ہجرت سے قریش دنگ رہ گئے۔ اسلام کے نو تشکیل معاشرے کو بہت سے بیرونی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ قریش اپنی دولت اور عربوں میں اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے بت پرستوں، صحرانشینوں، یہودیوں اور کسی حد تک عیسائیوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور اسلام کو مٹانے کے منصوبے بنانے لگے۔ رسول خدا ﷺ کسی حال میں بھی کشور کشائی، زور زبردستی اور جنگ کے ذریعے لوگوں کے اموال ہتھیانے کے قائل نہیں تھے۔ آپ صرف یہ چاہتے تھے کہ اسلام کی حفاظت کی جائے اور مسلمانوں کی زندگی محفوظ ہوجائے اور مشرکین کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا جائے۔ الغرض آپ کی پوری زندگی مظلوم اور کمزور لوگوں کی نجات کی فکر میں بسر ہوئی۔[۲]

تحویل قبلہ ۲ھ کا اہم واقعہ ہے۔ اس سے قبل آنحضرت ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش پر آپ کا رخ خانہ کعبہ کی طرف پھیر دیا تھا۔

رسول اکرم ﷺ کے غزوات

رسول اکرم ﷺ اعلان نبوت کے بعد تیرہ برس تک مکہ میں قیام پذیر رہے۔[۳] تیرہ برس کے عرصے میں آپ نے کسی کو جہاد کی اجازت نہیں دی یہاں تک کہ آپ کی طرف سے دفاع کی اجازت بھی نہیں تھی۔

مسلمان اہل مکہ سے تنگ آگئے تو ایک گروہ نے آپ کی اجازت سے (حضرت جعفر طیار کی قیادت میں) حبشہ ہجرت کی[۴] جبکہ باقی مسلمان مکہ میں سختیاں جھیلتے رہے۔ ہجرت کے دو برس بعد جہاد کی اجازت ملی۔

مکی زندگی میں مسلمان اسلامی تعلیمات سے آشنا ہوئے تھے اور انھوں نے روح اسلام کو اچھی طرح سے سمجھا تھا۔ اسلامی ثقافت ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ میں آنے کے بعد ان میں سے ہر مسلمان اسلام کا حقیقی مبلغ تھا۔ رسول اکرم انھیں تبلیغ دین کے لیے اطراف و اکناف میں بھیجتے تو وہ اس ذمے داری کو احسن طریقے سے سرانجام دیتے تھے اور جب وہ جہاد میں شریک ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس مقصد اور نظریے کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔[۵]

حضرت امیرالمومنینؑ نے صدر اسلام کی غزوات کو آئیڈیالوجی پر مبنی غزوات کہا تھا (اور فرمایا تھا)

۱۔ یاد ایام ج ۲، ص ۹۸۔۱۰۰
۲۔ محمد نصیری، تاریخ تحلیلی اسلام ص ۹۷۔۱۰۳
۳۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۲۱۲
۴۔ ہجرت حبشہ کے واقعات کی تفصیل کے لیے داستان راستان ج ۱۔۲، شمارہ ۵۵، ص ۱۵۷۔۱۶۳ کا مطالعہ فرمائیں۔
۵۔ جاذبہ و دافعہ علی ص ۱۵۲

حَمَلُوا بَصَائِرَهُمْ عَلَىٰ أَسْيَافِهِمْ انھوں نے اپنی بصیرتوں کو اپنی تلواروں پر اٹھا رکھا تھا۔[۱]

یعنی وہ یہ چاہتے تھے کہ ان تلواروں کے ذریعے لوگوں کو علم و آگاہی دی جائے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کامیاب ہوگئے تو اس سے فوجی کامیابی مراد نہیں ہوتی۔[۲]

(جی ہاں) انھی آب دار تلواروں اور تعلیم یافتہ انسانوں نے اسلام کے متعلق اپنی ذمے داریوں کو بخوبی ادا کیا تھا۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے کہ جو قوم شمشیر و شتر کے علاوہ اور کسی چیز سے واقف نہ تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے بلند افکار اور اسلامی ثقافت سے سرفراز ہوگئی۔ یہ ایک حیران کن بات ہے۔[۳]

بعثت کے تیرہ سال بعد رسول اکرم ﷺ مدینہ ہجرت کی۔ مدینہ میں ہی مسلمانوں کو بھرپور قوت اور طاقت حاصل ہوئی۔ اس دوران مدینہ کے مسلمانوں اور مکہ کے قریش مشرکین کے درمیان بدر، احد اور خندق کے علاوہ کچھ چھوٹی جھڑپیں بھی ہوئیں۔

غزوۂ بدر

جنگ بدر میں مسلمانوں کو عظیم الشان کامیابی ملی۔[۴]

(اس جنگ کے چیدہ چیدہ نکات یہ ہیں)

۱۔ یہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہونے والی پہلی باقاعدہ جنگ تھی۔

۲۔ یہ جنگ ہجرت کے دوسرے سال ۱۷ رمضان المبارک کے دن لڑی گئی۔

۳۔ اس جنگ کا مقصد قریش کی تجارتی اور اقتصادی شہ رگ کو کاٹنا تھا۔

۴۔ مشرکین کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی تھی۔

۵۔ جنگ کے نتیجے میں ستر مشرکین جنگی قیدی بنائے گئے۔

غزوۂ احد

یہ جنگ ہجرت کے تیسرے سال مدینہ میں لڑی گئی۔ رسول اکرم ﷺ کے چچا عباس نے آپ کو ایک خط کے ذریعے یہ خفیہ اطلاع دی کہ قریش مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ قریش کا لشکر ۵ شوال بروز جمعرات کوہ احد کے کنارے پہنچا اور یہ جگہ جنگی نقطہ نظر سے انتہائی مناسب تھی۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۸ ۲۔ مجموعہ آثار ج ۳، ص ۲۳۴

۳۔ جاذبہ و دافعہ علی ص ۱۵۲ ۴۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۲۱۲

☆ غزوۂ بدر سے مربوط آیات کے لیے دیکھیے: سورۂ آل عمران: آیت ۱۲ ـ ۱۳، ۱۲۳، ۱۲۷۔ سورۂ نساء: آیت ۷۷ ـ ۷۸۔ سورۂ انفال: آیت ۱ تا ۱۹، ۳۶ تا ۵۱، ۶۷ تا ۷۱۔ سورۂ حج: آیت ۱۹، ۱۲۴ تا ۱۲۷ (رضوانی)

رسول خدا ﷺ نے حکم الٰہی سے صحابہ سے دفاع کے لیے مشورہ طلب کیا۔ رسول خدا ﷺ کی ذاتی خواہش کے برعکس حضرت حمزہؓ اور دیگر مجاہدین کے مشورے سے شہر سے باہر لڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

رسول خدا ﷺ نماز جمعہ کے بعد ایک ہزار کا لشکر لے کر احد کی طرف روانہ ہوئے۔ مشہور منافق عبداللہ بن اُبَی اپنے تین سو ساتھیوں سمیت راستے سے ہی واپس ہو گیا۔

۱۷ شوال کی صبح اسلامی لشکر دشمن کے تین ہزار کے لشکر کے سامنے صف آراء ہوا۔ جنگ احد کے بعد مسلمان غم و اندوہ میں ڈوب گئے۔ اس جنگ میں ۷۰ مسلمان شہید ہوئے جن میں رسول خدا ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ بھی شامل تھے۔

اس جنگ کی ابتدا میں مسلمانوں کو کامیابی ملی تھی۔ بعد میں بدنظمی اور (پہاڑ کے درّے پر موجود پچاس تیر اندازوں کا) رسول خدا ﷺ کی حکم عدولی کر کے درّہ خالی کرنے کی وجہ سے (خالد بن ولید کی سربراہی میں) کفار کا لشکر عقب سے حملہ آور ہوا۔ اس حملے میں صحابہ کی ایک جماعت شہید ہو گئی اور باقی صحابہ بھاگ گئے البتہ (حضرت علیؑ اور) ایک چھوٹا سا گروہ ثابت قدم رہا جو رسول خدا ﷺ کے گرد سپر بنا رہا۔[۱]

بھاگنے والے کچھ صحابہ ثابت قدم رہنے والے اس چھوٹے سے گروہ میں واپس آ گئے اور انھوں نے مل کر دشمن کی پیش قدمی کو روکا۔ اس جنگ میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ رسول خدا ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ اس افواہ نے مسلمانوں کے انتشار میں اہم کردار ادا کیا مگر جب انھیں معلوم علم ہوا کہ رسول خدا ﷺ زندہ ہیں تو ان کی روحانی قوت لوٹ آئی۔[۲]

غزوۂ احزاب

جنگ احزاب ۱۷ شوال ۵ھ کو واقع ہوئی تھی۔ اس جنگ کو "احزاب" اس لیے کہا جاتا ہے کہ مشرکین مکہ کے بہت سے قبائل بشمول یہودی قبیلہ بنی نضیر اسلام اور مدینہ کی نو تشکیل شدہ اسلامی حکومت کو ختم کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے اور انھوں نے ایک اتحادی فوج تشکیل دی تھی۔

۱۔ ثابت قدم رہنے والوں میں اُمِ عُمارہ نُسیبہ بنت کعب بن عمرو بھی شامل تھیں جو اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے شانہ بشانہ آخر تک جنگ میں شریک رہیں اور رسول خدا ﷺ کا دفاع کرتی رہیں۔ داستان راستان ص ۱۶۹ ۔ ۱۷۱

☆ ابن اسحاق نے سیرۃ النبی ج ۳، ص ۱۲۱ ۔ ۱۷۹ پر لکھا ہے کہ سورۂ آل عمران کی ساٹھ آیتیں جنگ احد کے بارے میں اتری ہیں اور ابن ہشام نے روایت کی ہے کہ روز احد ہاتف غیبی نے ندا دی تھی: لَا سَيْفَ إِلَّا ذُو الْفَقَارِ وَلَا فَتَىٰ إِلَّا عَلِي

(محمد حسن مظفر، دلائل الصدق ج ۲، ص ۳۰۱ بحوالہ تاریخ طبری، تاریخ کامل اور شرح ابن ابی الحدید) رضوانی

۲۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۸۹

اس جنگ کو جنگِ خندق بھی کہا جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے دشمن کے دس ہزار کے لشکر جرار سے محفوظ رہنے کے لیے شہر کے گرد خندق کھودی تھی۔

آخرکار خدا کی غیبی مدد سے لشکر اسلام کو کامیابی ملی۔ سخت طوفانی ہوا چلی جس سے لشکر کفار کے خیمے اکھڑ گئے، اُن کے دلوں پر خوف طاری ہوگیا اور ملائکہ کے لشکر نے مسلمانوں کی مدد کی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کے ہاتھوں لشکر کفار پر آخری اور کاری ضرب لگائی۔ عرب کے پانچ مشہور سورما جو خندق پار کر کے اندر آگئے تھے۔ حضرت علیؑ نے اُن میں سے عمرو بن عبدوَدّ کو قتل کر دیا۔[2]

صلح حدیبیہ

پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں ایک صلح کی تھی جس کے شرائط اتنے سخت تھے کہ آپ کے اصحاب کو اس پر تعجب ہوا اور (کچھ) ناخوش ہوئے مگر دو سال بعد انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا یہ اقدام بالکل درست تھا۔

ہجرت کا چھٹا سال ہے... ماہ ذی قعدہ جسے اصطلاحی طور پر "ماہ حرام" کہا جاتا ہے اور جس میں جنگ کرنا حرام ہے... آیا تو پیغمبر اکرم ﷺ نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور مکہ جا کر عمرہ کریں اور واپس آجائیں۔ اس کے علاوہ آپ کا کوئی اور ارادہ نہیں تھا۔ آپ نے عمرہ کے لیے روانگی کا اعلان کیا تو سات سو اور ایک قول کے مطابق چودہ سو اصحاب کے ساتھ عازم مکہ ہوئے... اس سفر کو خفیہ نہیں رکھا گیا تھا۔ قریش کو آپ

۱۔ سورۂ احزاب کی آیت ۸ سے ۱۴ تک میں اس تاریخی نکتے کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ وہ پانچ افراد یہ تھے: (۱) عمرو بن عبدوَدّ (۲) عکرمہ بن ابی جہل مخزومی (۳) ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی (۴) ضرار بن خطاب (۵) مرداس فہری (شیخ مفید، الارشاد ج ۱، ص ۹۷)

☆ بعض مورخین نے ضرار بن خطاب مرداس فہری کو ایک آدمی شمار کیا ہے اور نوفل بن عبداللہ کو پانچواں آدمی لکھا ہے۔ جب حضرت علیؑ نے عمر بن عبدوَدّ اور نوفل بن عبداللہ کو قتل کر دیا تو رسول خدا ﷺ نے فرمایا تھا: لَضَرْبَةُ عَلِيٍّ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ (بحار الانوار ج ۳۹، ص ۱) ان غزوات کے علاوہ غزوۂ خیبر، غزوۂ موتہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک مشہور غزوات ہیں۔ غزوۂ تبوک آخری غزوہ ہے۔ غزوۂ خیبر میں جب قلعہ خیبر فتح نہیں ہو رہا تھا تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (صحیح بخاری، ج ۲، کتاب المغازی، حدیث رقم ۱۳۵۹، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور) غزوۂ تبوک میں لڑائی نہیں ہوئی تھی اس لیے مہم کو سر کرنا جس کا کام تھا اسے آنحضرت ﷺ اپنے ساتھ اس مہم میں نہیں لے گئے اور یہ تاریخی جملہ ان لا بد للمدینة منی او منک ارشاد فرما کر مدینے میں اپنا قائم مقام بنا گئے اور حضرت علیؑ سے فرمایا: اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰى إِلَّا أَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوۂ تبوک۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل علی ابن ابی طالبؑ۔ کافی ج ۸، ص ۱۰۶)

رضوانی

کی آمد کی خبر ہوئی۔ مکہ کے قریب پہنچ کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا کہ مکہ کے پیر و جواں، مرد و عورت سب آپ سے مقابلے کے لیے مکہ سے باہر آ چکے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم اس ماہ حرام میں بھی جنگ کریں گے... وہاں بیعت رضوان ہوئی... قریش کی طرف سے نمائندہ آیا اور کہا کہ ہم آپ سے معاہدہ کرنے پر تیار ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی معاہدہ کرنے پر آمادہ ہوں ... چنانچہ قرارداد صلح طے ہوئی[1] اس معاہدے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں بظاہر بہت سی رعایتیں دیں ... لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کے لیے انتہائی فائدہ مند تھا۔[2]

(اس معاہدے کی وجہ سے) مسلمانوں کو آزادی مل گئی اور وہ آزادانہ طور پر اسلام کی تبلیغ کرنے لگے ایک سال یا اس سے بھی کم عرصے میں قریش سے اتنے افراد مسلمان ہوئے جتنے گزشتہ بیس سال کے عرصے میں بھی نہیں ہوئے تھے۔ بعدازاں حالات نے مسلمانوں کے حق میں ایسا پلٹا کھایا کہ وہ معاہدہ قریش کے لیے فائدہ مند نہ رہا اور مکہ میں ایک عملی اور روحانی ہیجان پیدا ہو گیا۔[3]

اس معاہدے کی ایک شق یہ بھی تھی ... کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے گا تو قریش کو یہ حق

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۷۱، ۷۳۔ صلح حدیبیہ کی مزید تفصیل کے لیے کتاب "الارشاد" کا مطالعہ فرمائیں۔

۲۔ آشنائی با قرآن ج ۶، ص ۲۳۵

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۷۵۔۷۶ پر لکھا ہے کہ ابو بصیرؓ جو مکہ میں رہنے والے ایک انتہائی طاقتور اور بہادر مسلمان تھے وہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے۔ قریش نے معاہدے کی رو سے دو افراد بھیجے کہ انھیں واپس کیا جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بصیر سے فرمایا کہ اللہ تمھیں ان سے آزادی عطا فرمائے گا۔ یہ سن کر ابو بصیر اُن کے ساتھ چلے گئے۔ یہ دونوں انھیں اپنی حراست میں لے کر روانہ ہوئے۔ ابو بصیر نہتے تھے جبکہ وہ دونوں مسلح تھے۔ جب وہ "ذوالحلیفہ" پہنچے تو تھکاوٹ کے مارے ستانے لگے۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ ابو بصیر نے اُس سے کہا تمہاری تلوار بہت اچھی ہے، ذرا دکھاؤ کہ میں بھی اسے دیکھ لوں۔ اُس شخص نے کہا: یہ لو، دیکھ لو۔ ابو بصیر نے اُس کے ہاتھ سے تلوار لی اور اسے قتل کر دیا... دوسرا شخص بھاگ گیا۔ ابو بصیر مدینہ واپس آئے ... انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ نے معاہدے پر عمل کر دیا ہے ... یہ کہہ کر وہ مدینہ سے چلے گئے اور بحر احمر کے قریب بس گئے۔ جب مکہ میں مجبور و بے بس مسلمانوں کو اس واقعے کی اطلاع ملی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاہدے کی وجہ سے امان نہیں دیتے مگر ابو بصیر نے بحر احمر کے کنارے اپنا ٹھکانا بنا لیا ہے تو وہ بھی مکہ سے بھاگ کر ابو بصیر کے پاس جمع ہونے لگے۔ جب اُن کی تعداد ستر ہو گئی اور وہ ایک مضبوط جتھا بن گئے تو انھوں نے قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ روک دیا۔ چنانچہ قریش کے تجارتی قافلے وہاں سے گزر نہیں سکتے تھے۔ تجارت رک جانے کی وجہ سے قریش تنگ آ گئے اور انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خط لکھا کہ ہم اس معاہدے سے دستبردار ہوتے ہیں۔ آپ ابو بصیر اور اُن کے ساتھیوں کو خط لکھ کر اپنے پاس مدینہ بلا لیں۔

ہوگا کہ وہ اسے واپس لائیں [1] لیکن اگر کوئی مسلمان مرتد ہوکر مکہ آئے گا تو مسلمانوں کو اس کی واپسی کے مطالبے کا حق نہیں ہوگا ... پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر ہمارا کوئی ماننے والا مرتد ہوگیا تو ہم ہرگز اس کے پیچھے نہیں آئیں گے ایسے شخص کو واپس لانے کا ہمیں کوئی شوق نہیں ہے ... بہرحال جو مسلمان اس وقت مکہ میں موجود ہیں ان سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ صبر کریں گے کیونکہ معاہدے کے مطابق کفار قریش کو انھیں اذیت دینے کا کوئی حق نہیں۔ وہ مکہ میں آزادانہ زندگی بسر کرسکیں گے اور انھیں اپنے کاموں کی آزادی ہوگی۔ ان کا مکہ میں رہنا ہی فائدہ مند ہے لہٰذا وہ مکہ میں ہی رہیں۔ [2]

فتح مکہ

ہجرت کے آٹھویں سال آنحضرت ﷺ نے مکہ فتح کرلیا۔ [3] آپ نے مکہ شہر کو کچھ اس طرح فتح کیا کہ کوئی خوں ریزی نہ ہوئی البتہ ایک چھوٹا سا ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تھا جب خالد بن ولید نے اپنی حد سے کچھ تجاوز کیا تھا۔ رسول خدا ﷺ نے اُس کی حرکت سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کردیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد اسلام کے بدترین دشمن آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خواہ نخواہ اسلام قبول کرلیا۔ [4]

فتح مکہ مسلمانوں کے لیے عظیم کامیابی تھی۔ فوجی نقطہ نظر سے ہٹ کر مسلمانوں کے لیے معنوی لحاظ سے یہ کامیابی بہت اہم تھی۔ مکہ عرب میں ''ام القریٰ'' کا درجہ رکھتا تھا اور جزیرۃ العرب کا مرکز تھا... ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا تھا اور شکست کھائی تھی... اس واقعے کی وجہ سے عرب میں یہ عقیدہ عام ہوگیا تھا کہ یہ سرزمین خدا کی حفاظت میں ہے اور کوئی ظالم اس شہر پر مسلط نہیں ہوسکتا۔ جب رسول اعظم ﷺ نے آسانی سے مکہ فتح کرلیا تو لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمدؐ حق پر ہیں اور خدا ان سے راضی ہے۔

ہجرت کے نویں سال آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو مسلمانوں کا ''امیر حج'' بنا کر بھیجا لیکن ابھی وہ مدینہ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے [5] کہ جبرئیل امینؑ نازل ہوئے (اس واقعہ کو شیعہ اور سنی دونوں علماء نے لکھا ہے) اور انھوں نے آنحضرت ﷺ کو خدا کا یہ حکم پہنچایا کہ وہ (اُن کی جگہ) حضرت علیؑ کو امیر حج اور

۱۔ اس معاہدے کے بعد ایک مسلمان آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور مسلمانوں سے پناہ طلب کی لیکن آنحضرت ﷺ نے معاہدے کو قائم رکھنے کے لیے قریش کے مطالبے پر اسے قریش کے حوالے کردیا۔

۲۔ آشنائی با قرآن ج ۶، ص ۲۴۵ ۳۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۲۱۲

۴۔ آشنائی با قرآن ج ۶، ص ۲۵۴

۵۔ کچھ محدثین نے لکھا ہے کہ وہ ابھی ذوالحلیفہ ہی پہنچے تھے۔ یہ جگہ میقات مسجد شجرہ کے حدود میں اور مدینہ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے جبکہ کچھ دیگر محدثین نے لکھا ہے کہ وہ مقام ''عرج'' تک پہنچے تھے کہ خدا کا حکم نازل ہوا۔ مقام عرج بھی مدینہ کے قریب واقع ہے۔

سورۂ برأت کی آیات کا مبلغ بنا کر بھیجیں... چنانچہ حضرت علیؑ نے مراسم حج میں شرکت کی لیکن آپ نے سب سے پہلے مکہ میں کفار کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی منسوخی کا اعلان کیا۔ یہ اعلان ظاہراً (شک میری جانب سے) ۸ ذی الحجہ کو کیا گیا جب حجاج عرفات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ پھر مسجد الحرام میں ایک اجتماع عام میں سورۂ برأت کی آیات کی تبلیغ کی اور مشرکین کو چار نکاتی اعلامیہ سنایا...[1] آپ نے مختلف مقامات پر بار بار یہ اعلان دہرایا۔

سورۂ برأت کی تبلیغ کے متعلق شیعہ اور سنی میں یہ اختلاف ہے کہ اکثر سنی علماء کے مطابق جب اللہ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم ملا کہ اس سورۂ کی تبلیغ یا تو آپ خود کریں یا اسے بھیجیں جو آپ میں سے ہو، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو سورۂ برأت کی تبلیغ کے لیے بھیجا۔ حضرت علیؑ مکہ آئے تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ امیر بن کر آئے ہیں یا قاصد بن کر آئے ہیں؟

(یعنی امیر حج بن کر آئے ہیں یا کسی مخصوص کام کے لیے آئے ہیں؟)

حضرت علیؑ نے فرمایا: میں ایک مخصوص کام کے لیے آیا ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش یا معزول نہیں ہوئے تھے، وہ بدستور امیر حج رہے۔ انھوں نے اپنا کام کیا اور حضرت علیؑ نے اپنا کام سرانجام دیا لیکن صاحب مجمع البیان کے مطابق کچھ سنی اور تمام شیعہ علماء یہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علیؑ آئے تو اُن کے آتے ہی حضرت ابوبکرؓ معزول ہو گئے تھے اور وہ واپس مدینہ چلے گئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ پر یہ وحی کی تھی کہ ان آیات کی تبلیغ کے لیے آپ خود جائیں یا وہ جائے جو آپ میں سے ہو۔[2]

اہل تشیع رَجُلٌ مِنكَ "ایسا شخص جو آپ سے ہے" کے جملے پر انحصار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جملہ متعدد احادیث میں منقول ہے اور ایک خاص مفہوم کا حامل ہے۔[3]

حجۃ الوداع

حجۃ الوداع آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا آخری حج ہے۔ شاید آپ نے فتح مکہ کے بعد کوئی حج نہیں

۱۔ وہ چار نکات یہ تھے:

(۱) مشرکین سے کیا ہوا معاہدہ منسوخ ہے۔

(۲) آئندہ کوئی مشرک حج نہیں کرے گا۔

(۳) کوئی شخص برہنہ ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کرے گا۔

(۴) آئندہ مشرکین کے لیے مسجد الحرام میں داخل ہونا ممنوع ہوگا۔ (مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان حاشیہ ص ۹۲)

۲۔ محمود آلوسی بغدادی، روح المعانی در تفسیر سورۂ توبہ

۳۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۲۱۳ ۔ ۲۱۷

کیا تھا... آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو اس حج میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ہجرت کے دسویں سال یہ خبر بڑی تیزی سے جزیرۃ العرب میں پھیلی۔ آپ ہجرت کے دسویں سال ۲۵ ذی قعدہ کو مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مؤرخین نے اس سال حجاج کی تعداد ایک لاکھ سے ایک لاکھ بیس ہزار تک لکھی ہے۔[۱]

چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ کاروان دس دن کے سفر کے بعد ۴ ذی الحجہ کو مکہ پہنچا اور سب مناسک حج بجا لائے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے مسجد الحرام، عرفات، منیٰ اور غدیر خم میں مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماعات سے خطاب کیا...[۲]

غدیر خم

مناسک حج کی ادائیگی کے بعد آنحضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب مدینہ آتے ہوئے ۱۸ ذی الحجہ کو جحفہ پہنچے۔ وہاں جبریل امینؑ وحی لے کر نازل ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ نے قافلہ روک دیا اور لوگ غدیر (تالاب) کے اردگرد جمع ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ نے پالانوں کے منبر سے تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اور خطبے کے آخر میں آپ نے حضرت علیؑ کی جانشینی اور خلیفۃ اللہ ہونے کا اعلان کیا۔

میری نظر میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کی جانشینی کا اعلان سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ کے مطابق کیا تھا: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ... اے رسولؐ! اللہ کی طرف سے آپ پر جو حکم اتارا گیا ہے اسے پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا کچھ پیغام پہنچایا ہی نہیں۔

رسول اکرم ﷺ مسجد الحرام، عرفات اور منیٰ میں اسلام کے اصول و فروع بیان کرچکے تھے اور ان مقامات پر آپ نے اہم خطبات ارشاد فرمائے تھے، پھر غدیر خم میں فرمایا کہ اگر میں نے یہ بات نہ پہنچائی تو پھر میں نے کچھ بھی بیان نہیں کیا کیونکہ خدا نے مجھ سے کہا ہے فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ اگر آپؐ نے یہ بات نہیں پہنچائی تو پھر رسالت کی کچھ بھی تبلیغ نہیں کی۔ میری تمام تر تبلیغ بیکار جائے گی۔ پھر آپ نے پوچھا: أَلَسْتُ أَوْلَىٰ بِكُمْ مِنْ أَنفُسِكُمْ؟ کیا میں تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟[۳]

۱۔ حجۃ الوداع آنحضرت ﷺ کی وفات سے دو ماہ پہلے ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات ۲۸ صفر یا اہلسنت مؤرخین کے مطابق ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ ۱۸ ذی الحجہ کو غدیر خم پہنچے تھے۔ شیعہ مؤرخین کے مطابق غدیر کا واقعہ آنحضرت ﷺ کی وفات سے دو ماہ دس دن پہلے کا ہے جبکہ اہلسنت کے مطابق یہ واقعہ آپ کی وفات سے دو ماہ چوبیس دن پہلے پیش آیا تھا۔ (امامت و رہبری حاشیہ ص ۱۳۰)

۲۔ ☆ بیشتر کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قربانی کے روز "منیٰ" میں حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ دیا تھا۔ (رضوانی)

۳۔ آپ کے اس فرمان کا اشارہ سورۂ احزاب کی آیت ۶ کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ... نبی کریم ﷺ لوگوں کی جان و مال پر ان سے بھی زیادہ حق تصرف رکھتے ہیں۔ (امامت و رہبری ص ۱۰۶)

تمام حاضرین نے جواب دیا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہ جی ہاں! یا رسول اللہ۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔[1]

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی :... اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا... آج کافر لوگ تمہارے دین کی طرف سے ناامید ہوگئے ہیں تو اُن سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کرلیا۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۳)[2]

رسول اکرم ﷺ نے سوموار کے دن ماہ صفر کی ۲۸ تاریخ کو ظہر کے وقت ۱۱ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت آپ کا سر مبارک حضرت علیؑ کے سینے پر تھا۔[3]

اس دن سقیفہ کی کارروائی ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت عمل میں آئی۔ پھر منگل کے دن مسجد میں عام بیعت کی گئی۔ اس کے بعد منگل اور بدھ کی رات پیغمبر اکرم ﷺ کو دفن کیا گیا۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کو غسل و کفن اور حنوط حضرت علیؑ نے دیا تھا اور انھوں نے ہی آپ کو لحد میں اتارا تھا۔[4]

۱۔ مجموعہ آثار ج ۴، ص ۸۶۷۔۸۶۸۔ امامت و رہبری ص ۸۴۔۸۵۔ بحار الانوار ج ۲۱، ص ۳۸۷۔ ج ۲۷، ص ۲۴۳۔ حدیث ثقلین کی طرح یہ حدیث بھی بہت سے طرق سے مروی ہے۔ مجموعہ آثار ج ۴، ص ۸۶۸۔ امامت و رہبری ص ۳۴، ۴۰، ۸۵

۲۔ مجموعہ آثار ج ۴، ص ۸۹۷۔ امامت و رہبری ص ۱۳۱

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۵

☆ وفات سے چار دن پہلے رسول اکرم ﷺ شدید بیمار ہوئے تو آپ نے وصیت لکھوانی چاہی اور کاغذ قلم مانگا مگر حضرت عمرؓ نے کہا کہ بیماری کی شدت کی وجہ سے آنحضرت ﷺ ہذیان بول رہے ہیں چنانچہ وہ وصیت لکھوانے میں مزاحم ہوئے۔ اس المیے کو "رزیۃ الخمیس" (المیۂ جمعرات) کے عنوان سے کتب حدیث میں لکھا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: صحیح بخاری ج ۲، ص ۶۰۷، کتاب المغازی، باب مرض النبی ووفاتہ، حدیث رقم ۱۵۵۱ اور ۱۵۵۲ نیز اسی مکتبہ کی مطبوعہ صحیح مسلم ج ۲، ص ۶۰۲، کتاب الوصیۃ، حدیث رقم ۴۲۳۲، ۴۲۳۳، ۴۲۳۴ دیکھیے۔ (رضوانی)

۴۔ ابن اثیر، تاریخ کامل ج ۲، ص ۲۳۔ مسعودی، مروج الذہب ج ۱، ص ۶۵۷

مذکورہ بالا حوالہ جات یوسف غلامی کی کتاب "رحلت پیغمبرؐ تا کشتہ شدن عثمان" سے لیے گئے ہیں۔

حضرت ختمی مرتبت ﷺ کی حیات مبارکہ کے تفصیلی مطالعے کے لیے علامہ سید ہاشم معروف حسنی کی کتاب "سیرت مصطفیٰ" مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان دیکھیے۔ (رضوانی)

اسلام کی کامیابی اور فروغ کے اسباب

مقدمہ

کچھ یورپی مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ ابتدا میں صرف قریش کی ہدایت کے خواہش مند تھے مگر جب انھیں اپنے کام کی پیش رفت کا احساس ہوا تو انھوں نے تمام عرب وعجم کو اپنی دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک بزدلانہ تہمت ہے اور اس دعوے کی کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا یہ دعویٰ قرآن کریم کی ابتدائی آیات سے متصادم ہے۔ قرآن کریم کی مکہ میں اترنے والی ابتدائی آیات بھی تمام دنیا کے لیے تھیں...

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ یہ تمام دنیا والوں کے لیے نصیحت ہے۔ (سورۂ تکویر: آیت ۲۷)

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۂ سبا: آیت ۲۸)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ○ ہم ذکر (تورات) کے بعد زبور میں لکھ چکے ہیں کہ "زمین" کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ (سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۵)

يٰۤأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا... اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

(سورۂ اعراف: آیت ۱۵۸)

ان آیات میں یہ نکتہ موجود ہے کہ اسلام کی تعلیمات پوری دنیا کے لیے ہیں۔ قرآن کریم میں کئی ایسی آیات ہیں جن سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ اللہ نے عربوں سے ایک طرح کی بے نیازی اور بے اعتنائی کا اظہار کیا ہے۔ ان آیات کا ماحصل یہ ہے کہ اسلام تم عربوں کا محتاج نہیں ہے۔ اگر بالفرض تم نے اسلام قبول نہ کیا تو دنیا کی دوسری قومیں دل وجان سے اسے قبول کریں گی۔

اس طرح کی آیات کے مجموعے سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم نے غیر عرب اقوام کو اسلام کی قبولیت کے لیے زیادہ مناسب اور زیادہ آمادہ بتایا ہے۔ ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف

عرب کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ہے۔۔۔

۔۔۔فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۝ اگر یہ (عرب) قرآن کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔

(سورۂ انعام: آیت ۸۹)

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا ۝ اگر اللہ چاہے تو اے لوگو تمھیں ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔[1] اللہ اس پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (سورۂ نساء: ۱۳۳)

۔۔۔وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝ اگر تم (اعراب) قرآن کریم کو پشت دکھاؤ گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ (سورۂ محمدؐ: آیت ۳۸)

یہاں یہ نکتہ بیان کرنا انتہائی مناسب ہے کہ۔۔۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب جس سرزمین پر ظاہر ہوئے وہاں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے مگر جب وہ اُس سرزمین کی سرحدوں سے باہر نکل گئے تو دوسری جگہ کے لوگوں نے اُن کا شایانِ شان استقبال کیا مثلاً حضرت عیسیٰؑ فلسطین "مشرق وسطیٰ" میں پیدا ہوئے تھے جبکہ اُن کے پیروکار مشرق کی بجائے مغرب میں زیادہ ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش فلسطین میں یا مسلمان آباد ہیں یا یہودی۔۔۔ہم جانتے ہیں کہ گوتم بدھ برصغیر ہند میں پیدا ہوئے تھے جبکہ اُن کے پیروکار ہندوستان کی بجائے چین اور دیگر ممالک میں زیادہ ہیں۔[2] زرتشت اگرچہ اپنے مذہب کو زیادہ پھیلا نہ سکا اور یہ مذہب ایران کی سرحدوں سے باہر نہ نکل سکا مگر اس کے باوجود اس مذہب کو بلخ اور آذربائیجان میں زیادہ فروغ ملا۔ کہتے ہیں کہ آذربائیجان زرتشتی مذہب کا گہوارہ رہا ہے۔

مکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے پیدائش ہے لیکن ابتدا میں مکہ میں اسلام کو خاص پذیرائی نہیں ملی تھی جبکہ مدینہ میں اسلام کا والہانہ استقبال ہوا تھا۔[3]

۱۔ تفسیر المیزان میں تفسیر بیضاوی کے حوالے سے مرقوم ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ سلمان فارسیؓ کی پشت پر رکھا اور فرمایا کہ یہ لوگ اِس کی قوم سے ہوں گے۔ (مجمع البیان ج ۹، ص ۱۶۴)

۲۔ ☆ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ ہندوستان میں چوتھی یا پانچویں صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں۔ انھوں نے گیا، بہار (بھارت) میں بودھی کے درخت کے نیچے نروان حاصل کیا تھا اسی لیے انھیں بودھا کہا جاتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں آبادی کے لحاظ سے بدھا کے ماننے والے ایک فیصد سے بھی کم ہیں جبکہ مشرق بعید، چین اور سری لنکا میں تقریباً چالیس کروڑ بدھ موجود ہیں۔ بدھ تہذیب گندھارا کے علاقے (پشاور، چارسدہ، مردان، سوات، دیر، مالاکنڈ، باجوڑ ایجنسی اور جلال آباد تک) میں پروان چڑھی تھی اور یہیں سے بدھ مت ان ممالک میں پھیلا ہے۔ اشوک کے زمانے میں ٹیکسلا عظیم گندھارا سلطنت کے تین دارالخلافوں میں سے ایک تھا اور بدھ مت کا بہت بڑا علمی و ثقافتی مرکز تھا۔ (رضوانی)

۳۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۶۸۔ ۷۱

اسلام کا تیزی سے پھیلاؤ دنیا کی تاریخ کی ایک اہم حقیقت ہے۔ اس کے علل و اسباب پر بہت سی باتیں کی جاتی ہیں... اسلام بھی مسیحیت کی طرح جب اپنی جائے پیدائش سے باہر نکلا تو دوسری جگہوں پر تیزی سے پھیلا۔ اسلام کا آغاز جزیرہ نمائے عرب سے ہوا تھا مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکا کے علاوہ دنیا کی مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگ اس کے پیروکار ہیں... پھیلاؤ کے حوالے سے اسلام اور مسیحیت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ مسیحیت آہستہ آہستہ پھیلی تھی جبکہ اسلام بہت تیزی سے پھیلا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کی اتنی تیز ترقی کا راز کیا تھا؟

فرانس کے مشہور شاعر الفانسو لامارتین Alphonse de Lamartine نے کہا ہے کہ اگر ہم تین چیزوں کو مدنظر رکھیں تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی ناممکن دکھائی دیتی تھی۔ پہلی چیز مادی وسائل کا فقدان ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور دعوت دیتا ہے جبکہ اُس کے پاس کوئی قوت اور طاقت نہیں تھی۔ اُس کے قریبی رشتے دار بھی اُس کے دشمن تھے... دوسری چیز تیز تر ترقی یا عامل زمان ہے اور تیسری چیز نصب العین کی بلندی ہے۔ اگر ہم نصب العین کی بلندی کا تیز تر ترقی اور مادی وسائل کے فقدان سے موازنہ کریں تو ہمیں دنیا میں حضرت محمدؐ کی کوئی نظیر دکھائی نہیں دیتی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ لامارتین نے بالکل صحیح کہا تھا۔ مسیحیت نے اگر دنیا میں ترقی کی ہے تو حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے کئی صدیوں بعد کی تھی۔ مسیحیت کئی صدیوں بعد دنیا میں جگہ بنا سکی۔

(اب ہم اسلام کی کامیابی اور تیزی سے پھیلاؤ کے اسباب بیان کرتے ہیں)۔

ا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اَخلاق و کردار

قرآن اسلام کے پھیلاؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تاریخ بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ اسلام کے پھیلاؤ کا ایک اہم سبب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق و کردار اور آپ کی رہبری و قیادت ہے... خدا اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کر کے فرماتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ... (اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہیں، اگر آپ تند خُو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ (آل عمران: آیت ۱۵۹) مقصد یہ ہے کہ آپ کا اخلاق مسلمانوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کا ایک اہم سبب تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی دعوت دینے والا خود عظیم رہبر اور مدبر تھا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی رہبر کی کامیابی کے لیے اس کا ذاتی اور انفرادی زندگی میں بااخلاق اور نرم خُو ہونا بہت ضروری ہے۔[1]

ا۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۳۲ ۔ ۲۳۶ ۔ وحی و نبوت ص ۱۴۳

بیک وقت نرمی اور سختی

جن معاملات کا تعلق آپ کی ذات سے ہوتا تھا ان میں آپ انتہائی نرمی اور درگزر سے کام لیتے تھے۔ آپ نے درگزر کی مثالیں قائم کی تھیں اور آپ کا درگزر اسلام کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا لیکن اصولی اور عمومی مسائل میں جہاں قانون کی بات ہوتی تھی وہاں آپ سخت ہوتے تھے اور درگزر سے کام نہیں لیتے تھے۔

فتح مکہ کے بعد جب آپ نے قریش پر غلبہ حاصل کر لیا، اُس وقت آپ نے قریش کے بیس سالہ جرائم سے درگزر کیا تھا اور انھیں معاف کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے پیارے چچا حضرت حمزہؓ کے قاتل کو بھی معاف کر دیا تھا لیکن اسی فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اور اُس کا جرم ثابت ہو گیا۔ یہ قریش کا معزز قبیلہ تھا... چنانچہ یہ قبیلہ بہت پریشان ہوا... کچھ صحابہ نے سفارش کی لیکن رسول اکرم ﷺ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا... اور آپ نے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

گزشتہ قومیں اس لیے تباہ ہوئی تھیں کہ وہ خدا کے قانون کے اجرا میں فرق کرتی تھیں اگر کوئی طاقتور جرم کرتا تو وہ اسے معاف کر دیتے اور اگر کوئی کمزور جرم کرتا تو اُس پر حد جاری کرتے۔ اُس ذات کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں عدل کے نفاذ میں کبھی بھی سستی نہیں کروں گا اگرچہ مجرم میرا قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔[1]

۲۔ اصحاب کی آپ سے والہانہ عقیدت

اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ کا ایک سبب آنحضرت ﷺ سے صحابہ کی والہانہ عقیدت بھی ہے۔ آپ اس لیے صحابہ کے مرکز محبت تھے کہ آپ اُن کے ساتھ نرمی، مہربانی اور عفو و درگزر کا سلوک کرتے تھے۔ آپ اُن کے اور اپنی امت کے گناہوں کی بخشش کے لیے استغفار کیا کرتے تھے۔ آپ اپنے اصحاب کو اہمیت دیتے تھے، اُن سے مشورہ کرتے تھے اور اُن کا احترام کرتے تھے۔ آپ کی انہی صفات کی وجہ سے اصحاب آپ کے گرویدہ تھے۔[2] صدر اسلام کی تاریخ اس طرح کی والہانہ عقیدت کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اُس دور کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی طرف سے آپ کو جتنی محبت ملی تھی، اتنی محبت پوری تاریخ انسانیت میں کسی کو نہیں ملی۔

اسلام کے تاریخی حقائق کو دیکھ کر ہر معاشرہ اور انسان شناس محقق حیران ہیں کہ یہ انقلاب اتنی جلدی کیسے آیا؟ اسلام کا آغاز جاہلی عرب سے ہوا تھا اور علم عمرانیات کے تقاضوں کے مطابق اسے کامیابی کے لیے طویل عرصہ درکار تھا تاکہ برائیوں میں ڈوبی پرانی نسل ختم ہو جائے اور اُس کی جگہ نئی نسل آئے جو برائیوں سے

۱۔ وحی و نبوت ص ۱۳۴-۱۳۵۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۳۶ - ۲۴۲۔ صحیح مسلم ج ۵، ص ۱۱۴

۲۔ وحی و نبوت ص ۱۳۸

منتظر ہو، تب کہیں جا کر اسلام کو ترقی ملنی چاہیے تھی مگر اسلام کی ترقی نے عمرانیات کے اصولوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب کی اکثریت آپ سے بے حد عشق کرتی تھی اور انھوں نے رہوار عشق پر سوار ہو کر طویل راستے کو دیکھتے ہی دیکھتے طے کر لیا اور قلیل وقت میں اپنے معاشرے کو بدل دیا۔[۱]

پر و بال ما کمند عشق اوست | مو کشانش می کشد تا کوی دوست
من چگونہ نور دارم پیش و پس | چون نباشد نور یارم پیش و پس
نور او در یمن و یسر و تحت و فوق | بر سر و بر گردنم چون تاج و طوق

ہمارے بال و پر اُس کے عشق کی کمند ہیں جو ہمیں کوئے دوست کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر میرے دوست کا نور آگے پیچھے نہ ہوا تو میں آگے پیچھے نور کہاں سے حاصل کروں گا۔ دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے اس نور نے مجھے سر کے تاج اور گردن کے طوق کی طرح گھیر رکھا ہے۔

۳۔ قرآن اور رسول اکرم ﷺ کی شخصیت

دو چیزوں نے نئے اسلامی معاشرے کو وحدت اور نشاط عطا کی تھی۔ ان میں سے ایک کا نام قرآن ہے جس کی ہر وقت تلاوت ہوتی رہتی تھی اور وہ رہنمائی کرتا تھا اور دوسری آنحضرت ﷺ کی عظیم اور موثر شخصیت تھی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ کر اپنا دیوانہ بنا لیتی تھی۔[۲]

(اسلام کی تیز رفتار ترقی کے اسباب میں سے ایک سبب قرآن ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کا معجزہ ہے۔ یقیناً قرآن کی یہ زیبائی، گہرائی و گیرائی اور اُس کی جاذبیت آنحضرت ﷺ کی کامیابی اور اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ کا بنیادی سبب ہے۔ ہر جگہ قرآن اور اُس کے مطالب نے اسلام کے پھیلاؤ میں موثر کردار ادا کیا تھا۔[۳]

۴۔ شخصیت سازی پر توجہ

مکی زندگی کے تیرہ سالوں میں رسول اکرم ﷺ نے اسلام کے سچے پیروکاروں کی تربیت کی۔ جب آپ نے مدینہ ہجرت کی تو آپ کے صحابہ کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار تھی۔ یہ لوگ اسلام کی روح سے پوری طرح واقف تھے اور اُن کی اکثریت اسلامی تربیت سے آراستہ تھی۔ کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے تعلیم اور تربیت کے ذریعے سے شخصیت سازی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک گروہ کو تعلیم دی جاتی ہے، اُن کی

۱۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۹۱ ۔ ۹۳۔ صحابہ کی آنحضرت ﷺ سے والہانہ محبت کے لیے اسی کتاب کے صفحہ ۸۲ ۔ ۹۱ کے علاوہ داستان راستان ج ۱ ۔ ۲، شمارہ ۱۰۳، ص ۲۹۷ ۔ ۲۹۹ دیکھیے۔

۲۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۸۹

۳۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۳۴ ۔ ۲۳۵

تربیت کی جاتی ہے اور انھیں مقصد کے حصول کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے افراد تحریک میں شامل ہوتے ہیں اور وہ اُن کے شاگرد ہوتے ہیں۔ نئے ساتھی، پرانے ساتھیوں کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی کامیابی کا بھی یہی راز تھا کہ لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔[1]

۵۔ اسلام کے پھیلاؤ میں دعوت وتبلیغ کا کردار

اسلام کے پھیلاؤ میں جس چیز نے موثر کردار ادا کیا وہ دعوت و تبلیغ کا انداز تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ تبلیغ اسلام کے لیے ہر وقت متحرک رہتے تھے۔ آپ نے طائف کا سفر کیا۔ جب ایام حج آتے تو آپ باہر سے آنے والے مختلف قبائل کے افراد سے ملاقاتیں کرتے اور انھیں اسلام کی دعوت دیتے۔ آپ نے ایک مرتبہ حضرت علیؑ کو اور دوسری مرتبہ معاذ بن جبلؓ کو تبلیغ کے لیے یمن بھیجا۔

آپ نے ہجرت سے قبل مصعب بن عمیرؓ کو اہل مدینہ کے لیے مبلغ بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے قریش کے مظالم سے بچانے کے لیے کچھ مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کر جانے کا کہا۔ حبشہ پہنچ کر اُن مسلمانوں کو قریش کے مظالم سے نجات ملی اور مہاجرین حبشہ نے وہاں اسلام کی تبلیغ کی جس سے حبشہ بادشاہ اصحمہ نجاشی اور حبشہ کی نصف آبادی کے اسلام قبول کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔

ہجرت کے چھٹے سال آپ نے مختلف ممالک کے سربراہوں[2] کو خطوط ارسال کئے اور انھیں اپنی نبوت کی خبر دی۔ اس وقت آپ کے ایک سو پچاسی خطوط اور میثاق[3] ناموں میں سے ایک سو خطوط موجود ہیں جن میں آپ نے اپنی نبوت کے اعلان کے ساتھ انھیں دین اسلام کی دعوت دی تھی۔[4]

۶۔ لوگوں کی مسلمانوں سے ہم نشینی

آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی تبلیغ کی وجہ سے بحرین کے لوگوں کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اُس وقت بحرین میں ایرانیوں کی بڑی تعداد رہائش پذیر تھی جن میں سے کچھ مجوسی اور کچھ غیر مجوسی تھے۔ چنانچہ اُن کی اکثریت نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ بحرین کے حاکم یعنی شاہ ایران کے نمائندے نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی اہل ایران کو اسلام سے آشنائی حاصل ہو چکی تھی اور اُن کی بڑی تعداد اسلامی حقائق سے واقف ہو کر اسلام قبول کر چکی تھی ... اُس وقت ایران کی دینی اور حکومتی حالت

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۳۰

۲۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ ج ۲، ص ۱۰ ـ ۳۸

۳۔ وحی و نبوت ص ۱۴۱ ـ ۱۴۲

۴۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۷۷۔ سیری در سیرۂ نبوی حاشیہ ص ۲۰۹ ـ ۲۱۱

کچھ اس طرح سے تھی کہ وہاں کے عوام کی اکثریت نئے دین کی منتظر تھی ... پھر جب ایران اور مسلمانوں کے درمیان جنگیں ہوئیں تو پورا ایران مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سینکڑوں ایرانیوں نے نزدیک سے مسلمانوں کی زندگی کو دیکھا تو وہ گروہ در گروہ دین اسلام میں داخل ہوتے گئے۔[1]

۷۔ دعوت میں سختی سے پرہیز

دعوت میں سختی نہیں ہونی چاہیے۔ بالفاظ دیگر دعوت میں زور زبردستی نہیں ہونی چاہیے۔[2] دعوتِ اسلامی کا اصول یہ ہے کہ دعوت میں نرمی اور ملائمت ہونی چاہیے اور جبر و اکراہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى... دین (قبول کرنے) میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، گمراہی سے الگ ہو چکی ہے، پس جو طاغوت کا انکار کرے اور خدا پر ایمان لائے اُس نے مضبوط رسی تھام لی۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۵۶)

قرآن کی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے کیونکہ حقیقت روشن ہو چکی ہے، رشد و ہدایت کی راہ واضح ہے اور گمراہی کا راستہ بھی روشن ہے۔ اب ہر شخص کی مرضی ہے چاہیے تو ہدایت کا راستہ اپنائے، چاہے تو گمراہی کا راستا اختیار کرے۔[3]

۸۔ حضرت خدیجہؑ اور حضرت علیؑ کی مدد

بعض اوقات ہم جوش خطابت میں کچھ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو نہ تاریخ سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہ قرآن سے اُن کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی بجائے وہ دشمن کے نظریے سے مطابقت رکھتی ہیں... مثلاً کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے دو اسباب کی بنا پر ترقی کی تھی، حضرت خدیجہؑ کے مال اور حضرت علیؑ کی تلوار سے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام زر سے پھیلا یا زور سے پھیلا۔ (سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ) یہ کیسا دین ہے جو زر اور زور سے پھیلا؟

کیا قرآن میں کسی ایک جگہ بھی یہ لکھا ہوا ہے کہ دین اسلام زر اور زور سے پھیلا ہے؟

کیا حضرت علیؑ نے کبھی یہ فرمایا تھا کہ اسلام زر اور زور سے پھیلا ہے؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت خدیجہؑ کا مال مسلمانوں کے بہت کام آیا تھا لیکن اُن کا مال دعوتِ اسلام میں صرف ہوا تھا... مقصد یہ ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اُن کے مال سے کسی کو کچھ دے کر یہ

۱۔ سیری در سیرۂ نبوی حاشیہ ص ۷۸۔۷۹

۲۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۴۴

۳۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۵۳۔۲۵۴

کہا تھا کہ یہ دولت لے لو اور اسلام قبول کرو؟

کیا تاریخ میں کسی ایک شخص کے متعلق ایسی کوئی روایت موجود ہے؟ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھے اور حضرت خدیجہؓ نے اپنی دولت رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دی تھی تاکہ مسلمان فقر و فاقہ کی وجہ سے ہلاک نہ ہوں...

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؑ کی تلوار نے اسلام کی بڑی خدمت کی تھی۔ اگر حضرت علیؑ کی تلوار نہ ہوتی تو آج اسلام کی سرنوشت کچھ اور ہوتی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت علیؑ نے کسی کے سر پر تلوار علم کر کے کہا ہو کہ اسلام قبول کرو ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔ دشمن اسلام کو ختم کرنے کے لیے تلوار اٹھاتا تو جواب میں حضرت علیؑ کی تلوار دشمن سے مقابلے کے لیے اٹھتی تھی۔ جب ہم جنگ بدر، جنگ احد یا جنگ خندق کی تاریخ پڑھتے ہیں تو حضرت علیؑ کی تلوار دفاع میں بلند ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

جنگ خندق میں قریش اور ان کے حلیف قبائل نے مسلمانوں کا محاصرہ کیا تھا۔ دس ہزار مسلح افراد نے مدینہ کا گھیراؤ کیا تھا۔ مسلمانوں کی اجتماعی اور اقتصادی حالت انتہائی دگرگوں ہو چکی تھی (حالات اتنے خراب تھے کہ) مسلمانوں کے لیے امید کی کوئی کرن باقی نہیں تھی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ عمرو بن عبدوَد مسلمانوں کی کھودی ہوئی خندق پار کر کے اندر آ گیا تھا اور ھَلْ مِنْ مُبَارِزٌ کی صدا بلند کر رہا تھا۔

مسلمانوں میں سے کسی کو اُس کے مقابلے پر جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔[۱] عمرو نے تیسری یا چوتھی بار رجز پڑھا تاکہ مسلمانوں کی ہڈیوں تک کو جلا سکے اور اُن کو اشتعال دلا سکے... اُس نے کہا کہ میرا گلا مبارز طلب کرتے کرتے تھک چکا ہے تو کیا یہاں کوئی "مرد" موجود نہیں ہے جو میرے مقابلے پر آئے؟

۲۸ سالہ حضرت علیؑ اٹھے۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی طرف سے عذر پیش کرتے ہوئے کہا:

یا رسول اللہؐ! کوئی مسلمان اُس کے مقابلے پر جانے کے لیے تیار نہیں کیونکہ یہ آدمی ہزار آدمیوں کا مقابل ہے۔ جو بھی اس کے مقابلے پر جائے گا وہ قتل ہو جائے گا۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ جب حضرت علیؑ میدان کی طرف روانہ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الشِّرْكِ كُلِّهٖ تمام ایمان تمام شرک کے مقابلے پر جا رہا ہے۔[۲]

اس موقع پر حضرت علیؑ نے عمرو بن عبدوَد کو قتل کر کے اسلام کو بچایا۔[۳]

۱۔ محمد بن عمر بن واقدی، المغازی ج ۲ تصحیح مارسدن جونز ص ۴۷۰

۲۔ بحار الانوار ج ۲۰، ص ۲۱۵

۳۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۲۳۵ - ۲۳۸۔ گفتار ہای معنوی ص ۲۶۵ - ۲۶۷۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار ج ۲۰، ص ۲۰۳ - ۲۰۶۔ سیرت حلبیہ ج ۳، ص ۳۳۶۔ ابن اثیر، تاریخ کامل ج ۲، ص ۱۸۱۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۱، ص ۹۳ - ۹۹

۹۔ مدینہ میں اسلام کا فروغ اور اثر رسوخ

رسول اکرم ﷺ کی ہجرت سے پہلے اہل مدینہ عبداللہ بن اُبی کو اپنا حاکم بنانے پر اتفاق کر چکے تھے۔ نیز مدینہ میں یہودی قبائل رہتے تھے اور اُن کے علماء یہودیوں اور غیر یہودیوں سے بار بار یہ کہتے تھے کہ ہم آسمانی کتاب کا علم رکھتے ہیں۔ اس سرزمین میں ایک پیغمبر مبعوث ہوگا اور وہ آنحضرت ﷺ کے اوصاف اور علامات لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہتے تھے مگر جب آنحضرت ﷺ مبعوث برسالت ہوئے تو یہی یہودی آپ پر ایمان نہیں لائے سوائے عبداللہ بن سلام کے جو آپ پر ایمان لائے تھے۔[1]

اہل مدینہ چونکہ یہودی علماء سے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے متعلق سن چکے تھے اس لیے وہ جلد ہی آپ پر ایمان لے آئے۔

بحث کے چیدہ نکات

(۱) رسول اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کے متعلق شیعہ اور سنی دونوں متفق ہیں کہ آپ ماہ ربیع الاول میں پیدا ہوئے تھے۔ اکثر سنی مؤرخین کہتے ہیں کہ آپ کی ولادت بروز سوموار ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی تھی جبکہ شیعہ مؤرخین کہتے ہیں کہ آپ کی ولادت بروز جمعہ ۱۷ ربیع الاول کو ہوئی تھی۔

(۲) آپ آٹھ سال کے تھے کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلبؑ وفات پا گئے اور اُن کی وصیت کے مطابق آپ کے بڑے چچا حضرت ابو طالبؑ نے آپ کی کفالت کی۔

(۳) رسول اکرم ﷺ واحد نبی ہیں جن کی پوری تاریخ زندگی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ آپ نے اعلان نبوت سے قبل چالیس سالہ زندگی میں کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ آپ اہل مکہ میں "امین" کے نام سے مشہور تھے۔

(۴) زمانۂ جاہلیت میں جب کچھ افراد نے مظلوم لوگوں کی حمایت کا معاہدہ کیا تو آپ اس معاہدے میں شریک تھے۔ اس معاہدے کو "حلف الفضول" کہا جاتا ہے۔

(۵) اعلان نبوت سے پہلے آپ کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ کو خدائی تائید حاصل ہے اور بعثت سے کچھ عرصہ پہلے آپ کو عجیب قسم کے خواب دکھائی دیتے تھے۔ آپ کبھی ایک تہائی رات، کبھی آدھی رات اور کبھی دو تہائی رات عبادت میں بسر کرتے تھے۔

(۶) آپ کو کاہلی اور بیکاری سے سخت نفرت تھی۔ آپ غلاموں پر خصوصی شفقت فرماتے اور عام لوگوں کے ساتھ انتہائی مہربانی اور کشادہ روئی سے پیش آتے۔ آپ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کیا کرتے۔ آپ کو صفائی اور خوشبو سے خاص شغف تھا اور آپ لوگوں کو تاکید کرتے کہ جمعہ کے دن نہا دھو کر اور خوشبو لگا کر مسجد میں آئیں۔

۱۔ خاتمیت ص ۲۴۔۲۵

(۷) جب مہاجرین، مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کی اور حضرت علیؑ کو اپنا بھائی بنایا۔

(۸) آپ میں مردم شناسی، عزم صمیم، شک سے دوری، دلیری، پیش بینی، دُور اندیشی، لوگوں کو ان کی اہلیت کے مطابق عہدہ دینا، ظلم سے دُوری، تواضع، انکساری، وقار و متانت ... جیسی قائدانہ صلاحیتیں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔

(۹) آپ یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ خود آرام سے بیٹھے رہیں اور دوسرے آپ کی خدمت کریں۔ آپ کے اصولِ زندگی میں زُہد اور سادگی دکھائی دیتی تھی۔ آپ اکثر بوریے یا چٹائی پر آرام کرتے تھے۔ آپ کی غذا عام طور پر جو کی روٹی اور کھجور ہوتی تھی۔ اگر آپ کسی سواری پر سوار ہوتے اور کوئی شخص آپ کے ساتھ پیدل چلنا چاہتا تو آپ اُسے منع کر دیتے تھے۔ آپ کی مجلس دائرے کی شکل میں ہوتی تھی۔

(۱۰) آپ بے نظیر ارادے اور استقامت کے حامل تھے۔ آپ کے اصحاب آپ کے حکم پر کسی چون و چرا کے بغیر عمل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے مگر آپ نے کبھی متکبرانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ جن معاملات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہیں ہوتا تھا اُن معاملات میں آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کرتے تھے اور انھیں اہمیت دیتے تھے۔

(۱۱) آپ کے تمام معاملات میں نظم و ضبط پایا جاتا تھا۔ آپ نے اپنے اوقات کو تقسیم کر رکھا تھا۔ نیز یہ کہ آپ لوگوں کو علم حاصل کرنے اور پڑھنے لکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔

(۱۲) آپ تبلیغ میں نرمی سے کام لیتے۔ آپ کی تبلیغ بشارت اور امید کا پہلو لئے ہوئے ہوتی۔ آپ تبلیغ کے لیے ڈرانے دھمکانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ تبلیغ کے لیے آپ لوگوں کے درمیان کسی طرح کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ آپ نے کبھی اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔

(۱۳) آپ (مثبت) تنقید کو قبول کرتے تھے اور خوشامد و چاپلوسی کو ناپسند کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ خوشامد کرنے والوں کے منہ میں خاک ڈال دو۔ آپ محکم بنیادوں پر کام کرنے کو پسند کرتے تھے اور اس کی تاکید کرتے تھے۔

(۱۴) لوگوں میں تدریجی طور پر جو اختلافات پیدا ہو چکے تھے آپ ایسی رسوم و عادات کو ختم کرتے تھے، توہمات اور غلط عقائد کے خلاف جہاد کرتے تھے اور لوگوں کو ان کی جہالت سے آگاہ کرتے تھے۔

(۱۵) آپ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں میں قومی اور نسلی تعصبات پیدا نہ ہوں۔ آپ کی ان تعلیمات کا غیر عرب مسلمانوں پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے سلاطین کے نسلی تعصبات کے باوجود غیر عرب اقوام، اسلام سے متنفر نہیں ہوئیں اور وہ خلفاء کے کاموں کو غیر اسلامی سمجھتی تھیں۔

(۱۶) ابھی آنحضرت ﷺ نے عمومی دعوت شروع نہیں کی تھی کہ سورۂ شعراء کی آیت ۲۱۴ نازل ہوئی جس

میں آپ کو حکم دیا گیا کہ اپنے قریبی رشتے داروں کو اسلام کی دعوت دیں۔ چنانچہ آپ نے تیسری دعوت کے آخر میں حاضرین سے فرمایا کہ حضرت علیؑ میرے وزیر، وصی اور میرے بعد میرے جانشین ہیں۔

(۱۷) مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج ہمیشہ ایک دوسرے سے جنگ لڑتے رہتے تھے۔ ان کا ایک شخص قریش سے فوجی مدد مانگنے کی غرض سے مکہ آیا۔ جب وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا تو اُس نے آنحضرت ﷺ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا اور اسلام کی طرف مائل ہوا۔ یہ واقعہ پیغمبر اکرم ﷺ سے اہل مدینہ کی آشنائی کا ذریعہ ثابت ہوا۔

(۱۸) قریش کے سردار مشورے کے لیے دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ اجلاس کے اختتام پر آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؑ کو بلا کر فرمایا کہ آج رات آپ میرے بستر پر سو جائیں۔

انھوں نے آپ کے حکم کو قبول کیا۔ صبح کے وقت جب کفار نے آپ کو قتل کرنے کے لیے دھاوا بولا تو دیکھا کہ رسول خدا ﷺ کے بستر پر حضرت علیؑ سوئے ہوئے ہیں۔

(۱۹) آنحضرت ﷺ نے تیرہ برس کی مکی زندگی میں جہاد بلکہ دفاع کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ مسلمان قریش کے مظالم سے تنگ آگئے اور حضرت جعفر طیار کی قیادت میں ستر افراد نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔

(۲۰) آنحضرت ﷺ نے بعثت کے تیرہ برس بعد مدینہ ہجرت فرمائی۔ مدینہ میں مسلمانوں کو طاقت و قوت ملی اور اس دوران جنگ بدر، احد اور خندق کے علاوہ کچھ چھوٹی اور بڑی جنگیں مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہوئیں۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوئی۔ جنگ احد غم و اندوہ پر ختم ہوئی اور اس جنگ میں رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ سمیت ستر مسلمان شہید ہوئے۔

(۲۱) ہجرت کے چھٹے سال ذی قعدہ کے مہینے میں آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ حج کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے۔ قریش کو آپ کی آمد کا علم ہوا تو انھوں نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ پھر آنحضرت ﷺ اور قریش کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا جو صلح حدیبیہ کہلاتا ہے۔ اس معاہدے میں ظاہری طور پر آنحضرت ﷺ نے کفار کو بہت زیادہ مراعات دی تھیں لیکن بعد کے حالات و واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کے لیے بہت فائدہ مند رہا۔

(۲۲) ۸ھ میں لشکر اسلام نے مکہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ یہ ایک عظیم کامیابی تھی کیونکہ مکہ جزیرۃ العرب کا مرکز تھا اور اُم القریٰ کا درجہ رکھتا تھا۔

(۲۳) ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر مکہ بھیجا لیکن ابھی وہ مدینہ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ جبریل امینؑ نازل ہوئے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج کے منصب سے معزول کر دیا اور حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ امیر حج کے فرائض انجام دیں اور مشرکین مکہ کو سورۂ برأت کی ابتدائی آیات سنائیں۔

(۲۴) حجۃ الوداع آنحضرت ﷺ کا آخری حج تھا۔ آپ نے اس حج پر روانہ ہونے سے قبل ہر جگہ لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ اِمسال حج پر جا رہے ہیں، جس نے ہمارے ساتھ حج کرنا ہو، وہ ہمارے قافلے میں شامل ہوجائے۔ آپ نے حج کے دوران مختلف مقامات پر خطبات ارشاد فرمائے۔ پھر واپسی پر غدیر خم کے مقام پر ایک لاکھ افراد کی موجودگی میں آپ نے خدا کا اہم ترین پیغام پہنچایا اور حضرت علیؑ کو اپنا جانشین اور امام مقرر کیا۔

چنانچہ سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں اس دن کو ''اِکمال دین و اِتمام نعمت'' کا دن کہا گیا ہے۔

(۲۵) اعلانِ نبوت کے آغاز میں نازل ہونے والی آیات میں کہا گیا ہے کہ اسلام ساری دنیا کا دین ہے۔ اسلام صرف عرب کا دین نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن میں عربوں سے بے نیازی اور بے اعتنائی کا اظہار کیا گیا ہے۔

اِن آیات سے اس بات کا استنباط ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے غیر عرب اقوام کو اسلام قبول کرنے کے لیے مناسب تر اور آمادہ تر قرار دیا تھا۔

(۲۶) دنیا کے تمام بڑے ادیان کو ان کے مقام ظہور میں کوئی خاص پذیرائی نہیں ملی۔ اس کے برعکس دوسرے علاقوں میں ان کا والہانہ استقبال ہوا۔ چنانچہ مکہ اسلام کی جنم بھومی تھا مگر یہاں ابتدائی دنوں میں اسلام کو خاص پذیرائی نہیں ملی تھی جبکہ مدینہ میں اسلام کو زبردست پذیرائی ملی۔

(۲۷) اسلام کا تیزی سے پھیلاؤ تاریخ کی اہم ترین حقیقت ہے۔ اسلام کی تیز رفتار ترقی کے اسباب میں سیرت نبویؐ کو بڑی اہمیت حاصل ہے یعنی آنحضرت ﷺ کا اَخلاق، طرز بود و باش اور رہبری و قیادت کا انداز صرف آپ کی زندگی میں ہی نہیں بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی اسلام کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنا۔ آپ انفرادی اور ذاتی مسائل میں نرم خو تھے مگر اسلامی قانون کے اجرا کے معاملے میں سختی سے کام لیتے تھے۔

(۲۸) اسلام کی پیشرفت کے اسباب میں سے ایک صحابہ کرام کی آپ سے والہانہ عقیدت و ارادت بھی ہے۔ انھوں نے مرکب عشق پر سوار ہوکر طویل فاصلوں کو قلیل عرصے میں طے کیا تھا اور اپنے معاشرے کو بدل دیا تھا۔

(۲۹) قرآن کریم نے نئے اسلامی معاشرے میں وحدت اور نشاط کی روح پھونک دی تھی اور قرآن کریم، رسول اکرم ﷺ کا زندۂ جاوید معجزہ ہے۔

(۳۰) اسلام کے پھیلاؤ میں دعوت و تبلیغ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ایک بار حضرت علیؑ کو اور دوسری بار حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تھا۔ آپ نے اپنی ہجرت سے قبل حضرت مصعب بن عمیر کو تبلیغ کے لیے مدینہ بھیجا تھا۔

آنحضرت ﷺ کے ایک سو خطوط اس وقت بھی موجود ہیں جو آپ نے مختلف بادشاہوں کو لکھے تھے اور انھیں اسلام کی دعوت دی تھی۔

(۳۱) کچھ لوگوں کی یہ بات غلط ہے کہ اسلام حضرت خدیجہؑ کی دولت اور علیؑ کی تلوار سے پھیلا تھا۔ یہ صحیح ہے

کہ حضرت خدیجہؑ کی دولت مسلمانوں کے بہت کام آئی تھی۔ جب مسلمان معاشی تنگی میں مبتلا تھے تو حضرت خدیجہؑ نے اپنی دولت رسول خدا ﷺ کے اختیار میں دیدی تھی۔ اگر حضرت خدیجہؑ کی دولت نہ ہوتی تو مسلمان تنگدستی اور افلاس کی وجہ سے ہلاک ہوجاتے۔ حضرت علیؑ کی تلوار نے بھی اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اگر حضرت علیؑ کی تلوار نہ ہوتی تو دشمن شجر اسلام کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتے مگر دولت کا لالچ دے کر یا تلوار کی دھمکی سے کسی کو مسلمان نہیں بنایا گیا۔

(۳۲) مدینہ میں اسلام کی قبولیت عام کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ میں یہودی رہتے تھے اور علمائے یہود لوگوں کو بتاتے تھے کہ کتاب خدا کے مطابق اس سرزمین میں ایک پیغمبر مبعوث ہوگا۔ لوگ مسلسل یہ باتیں سنتے آرہے تھے جب انھیں حضرت محمد ﷺ میں مذکورہ علامات نظر آئیں تو وہ آپ پر ایمان لے آتے۔

تیسرا باب

سقیفہ سے قتل عثمانؓ تک

واقعاتِ سقیفہ کا تجزیہ

حضرت عمرؓ کا عہد خلافت

خلفائے ثلاثہ کی فتوحات کا تجزیہ

حضرت عثمانؓ کا قتل

واقعاتِ سقیفہ کا تجزیہ

اعلانِ غدیر کے بعد مدینہ کے حالات میں خاص تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ ان حالات سے بے خبر نہیں تھے لہٰذا آپ نے ان حالات کو غیر مؤثر بنانے اور ناخوش گوار حالات کو جنم لینے سے روکنے کے لیے اُسامہ بن زیدؓ [۱] کی سرکردگی میں ایک لشکر تشکیل دیا اور اسے جزیرۃ العرب کی سرحد کے باہر روانگی کا حکم دیا۔ اس کا مقصد جہاں رومیوں کے خطرے سے اسلامی سرحدوں کو محفوظ رکھنا تھا، وہاں طالع آزماؤں کا راستہ روکنا بھی تھا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے جب ۱۱ھ ماہ محرم کے آخر میں یہ لشکر تشکیل دیا، اس وقت آپ بیمار نہیں ہوئے تھے لیکن لشکر کی روانگی کے دن آپ کو شدید بخار ہوگیا اور آپ بستر سے لگ گئے۔ آپ کی بیماری اور ۱۸ سالہ ناتجربہ کار سالار کی قیادت کا بہانہ بنا کر بعض صحابہ نے لشکر کے ساتھ جانے میں لیت و لعل سے کام لیا اور حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب ہونے تک یہ لشکر رکا رہا۔

جب پیغمبر اکرم ﷺ نے دیکھا کہ لشکر جانے میں ٹال مٹول کر رہا ہے اور لوگ تاخیری حربوں سے کام لے رہے ہیں تو آپ سخت بخار کے باوجود غضب ناک ہو کر مسجد میں تشریف لائے اور ٹال مٹول کرنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے لشکر سے پیچھے رہ جانے والوں پر لعنت کی۔ [۲]

۱۔ اُسامہ بن زیدؓ کے سالار لشکر مقرر ہونے کے متعلق دو باتیں توجہ طلب اور اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) جب اُسامہؓ کو لشکر کا سالار مقرر کیا گیا اُس وقت وہ اٹھارہ برس کے نوخیز جوان تھے اور انھیں جنگ کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ یہ بات آنحضرت ﷺ سے مخفی نہیں تھی۔ اس کے باوجود آپ نے باصرار اُن کو سالار لشکر بنایا۔

(۲) اس لشکر میں بزرگ صحابہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، ابوعبیدہ بن جراح اور سعد بن ابی وقاص ... شامل تھے جو اُسامہؓ سے صرف عمر میں ہی بڑے نہ تھے بلکہ انھیں جنگوں کا بھی خاصا تجربہ تھا۔ اُن میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے لشکر کی قیادت بھی کی تھی اور اُن میں کچھ قبائل کے سردار بھی تھے مگر اس کے باوجود وہ کم عمر اُسامہؓ کی قیادت میں جانے اور اُن کے احکامات ماننے پر مجبور تھے۔ آخر ان دو باتوں کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟

(تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد رضا مظفر، اُسرار سقیفہ، ترجمہ محمد جواد حجتی کرمانی ص ۱۱۰ ۔ ۱۱۲)

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۲، ص ۲۰

اس کے باوجود لشکر نے پندرہ دن سے زیادہ تاخیر کی یہاں تک کہ انھیں آنحضرت ﷺ کی رحلت کی خبر ملی مگر حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد دو پہروں سے بھی کم وقت میں لشکر کوچ کر گیا!!

سقیفہ میں انصار نے اپنی فضیلت بیان کی جبکہ حضرت عمرؓ نے اُن کی مخالفت کرتے ہوئے خلافت کو مہاجرین کا حق قرار دیا۔ اُن کے درمیان تلخی پیدا ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ آگے بڑھے اور انھوں نے انتہائی دھیمے لہجے میں مہاجرین کے فضائل بیان کئے اور انصار یعنی اوس و خزرج کی پرانی رقابتوں کا حوالہ دے کر مہاجرین کے حق میں زمین ہموار کی۔

الغرض طے یہ پایا کہ امیر کا تعلق مہاجرین سے ہوگا اور وزیروں کا انتخاب انصار میں سے کیا جائے گا اور انصار کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہ بن جراح کی بیعت کا مشورہ دیا جبکہ حضرت عمرؓ نے آگے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اور اُن کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی ان کی بیعت کی اور یوں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے۔[1]

حضرت علیؑ، تمام بنی ہاشم اور ممتاز صحابہ مثلاً ابوذرؓ، سلمانؓ، عمارؓ، مقدادؓ، ابن مسعودؓ، زبیرؓ، ابوایوب انصاریؓ، قیس بن سعدؓ، عثمان بن حنیفؓ، خزیمہ بن ثابتؓ، سہل بن حنیفؓ، حذیفہ بن یمانؓ، زید بن ارقمؓ اور بریدہ اسلمیؓ وغیرہ نے کئی ماہ تک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔[2]

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنانے کی حسب ذیل کوششیں کی گئیں:

(۱) لشکر اُسامہ میں شرکت سے انحراف۔

(۲) پیغمبر اکرم ﷺ کو وصیت نامہ نہ لکھنے دینا۔

(۳) پیغمبر اکرم ﷺ کے غسل و کفن اور دفن میں شریک نہ ہونا۔

(۴) جب تک حضرت ابوبکرؓ سُنح سے مدینہ پہنچ نہیں گئے تب تک حضرت عمرؓ وفات رسولؐ کا انکار کرتے رہے۔

(۵) حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے لیے مسلسل کوششیں کی گئیں جو سب کو دکھائی دے رہی تھیں۔

(۶) سقیفہ میں حباب بن منذر اور سعد بن عبادہ سے جھگڑا کرنا۔

(۷) بیعت سے انکار کرنے والے ان افراد پر حملہ کرنا جو حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر میں پناہ لیے ہوئے تھے۔

(۸) زبیر بن عوام کی تلوار توڑنا۔

(۹) حضرت مقدادؓ کو کوڑے مارنا۔

امیرالمومنینؑ نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ ابوبکرؓ کی حکومت کو مضبوط کردو تاکہ کل وہ یہ حکومت تمھیں لوٹا دیں۔

تاریخ طبری ج ۱، ص ۱۸۱۸ بحوالہ رحلت پیامبر تا کشتہ شدن عثمانؓ از یوسف غلامی۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: محمد رضا مظفر کی کتاب اسرار سقیفہ، ترجمہ محمد جواد حجتی کرمانی ص ۱۰۷ ۔ ۲۱۳

۲۔ تحلیلی بر مواضع سیاسی علی بن ابی طالبؑ ص ۶۰ ۔ ۷۸

نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے اثبات کے لیے تین طرح سے استدلال کیا ہے:

(۱) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص اور وصیت

(۲) اپنی ذاتی لیاقت و اہلیت

(۳) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبی اور روحانی قرابت

(۱) نص اور وصیت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی نص کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اس کی بجائے آپ نے اپنی ذاتی لیاقت اور اہلیت کا تذکرہ کیا ہے مگر یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ نہج البلاغہ کے دوسرے خطبے میں ... آپ نے اہل بیتؑ کے متعلق صریحاً یہ الفاظ فرمائے ہیں: **وَفِيهِمُ الْوَصِيَّةُ وَالْوِرَاثَةُ**[۱] یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اور وراثت ان ہی کے لیے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے بہت سے خطبات میں اپنے حق خلافت کا تذکرہ کیا ہے اگر اس کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کوئی نص نہ ہوتی تو آپ اس کا یوں تذکرہ نہ فرماتے ... کیونکہ نص اور پہلے سے خلافت کی تعیین کے بغیر اس حساس مسئلے پر آپ کبھی بھی لب کشائی نہ کرتے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لیاقت اور اہلیت سے بالقوہ حق کا استدلال تو کیا جا سکتا ہے بالفعل حق کا استدلال نہیں کیا جا سکتا اور بالقوہ حق کے چھن جانے پر افسوس کا اظہار کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

اب ہم یہاں پر اُن مقامات کو بیان کرتے ہیں جن میں حضرت علیؑ نے خلافت کو اپنا حق قرار دیا ہے۔ نہج البلاغہ کے خطبہ ۶ میں ہے ... جب آپ بی بی عائشہ اور طلحہ و زبیر کی سرکشی سے آگاہ ہوئے تو آپ نے فرمایا: ... **فَوَاللهِ مَا زِلْتُ مَدْفُوعًا عَنْ حَقِّي مُسْتَأْثَرًا عَلَيَّ مُنْذُ قَبَضَ اللهُ نَبِيَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى يَوْمِ النَّاسِ هَذَا** خدا کی قسم! جب سے خدا نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا سے اٹھا لیا، برابر دوسروں کو مجھ پر مقدم کیا گیا اور مجھے میرے حق سے محروم رکھا گیا۔

نہج البلاغہ کا خطبہ ۱۷۰ جسے سید رضی اگر کلمات قصار میں شامل کرتے تو زیادہ مناسب ہوتا... اس خطبے میں آپ نے فرمایا: **وَقَدْ قَالَ قَائِلٌ إِنَّكَ عَلَى هَذَا الْأَمْرِ يَا ابْنَ أَبِي طَالِبٍ لَحَرِيصٌ فَقُلْتُ بَلْ أَنْتُمْ وَاللهِ لَأَحْرَصُ وَأَبْعَدُ وَأَنَا أَخَصُّ وَأَقْرَبُ وَإِنَّمَا طَلَبْتُ حَقًّا لِي وَأَنْتُمْ تَحُولُونَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ وَتَضْرِبُونَ وَجْهِي دُونَهُ فَلَمَّا قَرَّعْتُهُ بِالْحُجَّةِ فِي الْمَلَإِ الْحَاضِرِينَ هَبَّ كَأَنَّهُ بُهِتَ لَا يَدْرِي مَا يُجِيبُنِي بِهِ** ایک کہنے والے نے مجھ سے کہا کہ اے فرزند ابو طالبؑ! آپ تو اس خلافت پر للچائے ہوئے ہیں تو میں نے کہا کہ خدا کی قسم! تم اس پر کہیں زیادہ حریص اور پیغمبرؐ سے دور ہو۔ اور میں اس کا اہل اور پیغمبرؐ سے نزدیک تر ہوں۔

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۲

میں نے تو اپنا حق مانگا ہے اور تم میرے اور میرے حق کے درمیان حائل ہو جاتے ہو۔ اور جب میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں تو تم رخ موڑ دیتے ہو۔ چنانچہ جب بھری محفل میں اس دلیل سے میں نے اُس (کے کان کے پردوں) کو کھٹکھٹایا تو وہ چوکنا ہوا اور اس طرح مبہوت ہو کر رہ گیا کہ اسے کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔

یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت پر اعتراض کرنے والا کون تھا؟ اور اس نے کس موقع پر یہ اعتراض کیا تھا۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اعتراض کرنے والا سعد بن ابی وقاص تھا اور اُس نے مجلس شوریٰ میں اعتراض کیا تھا پھر وہ کہتے ہیں کہ امامیہ اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ اعتراض سقیفہ کے دن ابو عبیدہ بن جراح نے کیا تھا۔

نہج البلاغہ کے مذکورہ جملوں کے بعد حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْتَعْدِيكَ عَلٰى قُرَيْشٍ وَمَنْ اَعَانَهُمْ فَاِنَّهُمْ قَطَعُوا رَحِمِي وَصَغَّرُوا عَظِيمَ مَنْزِلَتِي وَاَجْمَعُوا عَلٰى مُنَازَعَتِي اَمْرًا هُوَ لِي ثُمَّ قَالُوا اَلَا اِنَّ فِي الْحَقِّ اَنْ تَاْخُذَهُ وَفِي الْحَقِّ اَنْ تَتْرُكَهُ خدایا! میں قریش اور اُن کے مددگاروں کے خلاف تجھ سے مدد چاہتا ہوں کیونکہ انھوں نے قطع رحمی کی، میرے مرتبے کی بلندی کو پست سمجھا اور اس (خلافت) پر کہ جو میرے لیے مخصوص تھی، ٹکرانے کے لیے ایکا کر لیا۔ پھر کہتے یہ ہیں کہ حق تو یہی ہے کہ آپ اسے لیں اور یہ بھی حق ہے کہ آپ اس سے دستبردار ہو جائیں۔

ابن ابی الحدید حضرت علیؑ کی افضلیت اور قابلیت کے معترف ہیں ... حضرت کے مذکورہ جملے اُن کی نظر میں قابل تاویل ہیں کیونکہ ان میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ خلافت میرے لیے مخصوص ہے اور حضرت علیؑ رسول اکرم ﷺ کی وصیت اور نص قطعی کے بغیر اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔

بنی اسد سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے آپ سے پوچھا: یا علیؑ! کیا وجہ ہے کہ لوگوں نے آپ کو اس منصب سے الگ رکھا، حالانکہ آپ اس کے زیادہ حق دار تھے؟

امیر المومنینؑ نے اس کا جو جواب دیا وہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۶۰ میں مرقوم ہے۔ آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا: ایک طرف سے لوگوں کی خود غرضی تھی اور دوسری طرف سے ہماری بے نیازی تھی۔

(واضح رہے کہ) یہ سوال جواب اُس وقت ہوئے جب آپ منصب خلافت پر جلوہ فگن تھے اور معاویہ آپ کے خلاف شاطرانہ چالیں چلنے میں مصروف تھا۔ اسی لیے آپ کو یہ بات بے محل محسوس ہوئی کہ اس طرح کے حساس موقع پر ایسا سوال کیا جائے۔ اسی لیے آپ نے جواب دینے سے قبل اسے ہلکی سی ملامت کی اور فرمایا کہ موقع دیکھ کر سوال کرنا چاہیے۔ اب وقت نہیں ہے کہ ہم گزری ہوئی باتوں پر بحث کریں جبکہ آج ہمیں معاویہ کا مسئلہ درپیش ہے ... لیکن اس کے باوجود آپ نے ہمیشہ کی طرح نرمی سے اسے جواب دیا اور حقائق کی وضاحت سے منہ موڑنا پسند نہیں فرمایا۔

خطبۂ شقشقیہ میں آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا:

آزی تُراثِی نَہْبًا میں اپنے موروثی حق کو لٹتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ موروثی حق سے خاندانی اور رشتے داری وراثت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے معنوی اور الٰہی وراثت مراد ہے۔

(۲) لیاقت اور اہلیت

خطبۂ شقشقیہ میں آپ نے فرمایا ہے: اَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا فُلَانٌ وَإِنَّهُ لَيَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّيَ مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحٰى يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَلَا يَرْقٰى اِلَيَّ الطَّيْرُ خدا کی قسم! فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر اُس کی کیلی کا ہوتا ہے۔ میں وہ کوہ بلند ہوں جس پر سیلاب کا پانی گزر کر نیچے گر جاتا ہے اور مجھ تک کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ علاوہ ازیں نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۹۵ میں آپ نے پہلے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور اپنے مقام تسلیم و ایمان کو بیان کیا ہے، پھر مختلف مواقع پر اپنی جاں نثاری کا تذکرہ کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے: وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر مبارک میرے سینے پر تھا۔ اس کے بعد آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینے کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ اس عمل میں فرشتے میری مدد کرتے رہے ... یہاں تک کہ ہم نے آپ کو سپرد خاک کیا۔ اس پورے عرصے میں فرشتوں کی دھیمی آوازیں برابر میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ پھر فرمایا: فَمَنْ ذَا اَحَقُّ بِهِ مِنِّي حَيًّا وَمَيِّتًا اُن کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی مجھ سے بڑھ کر کون اُن کا حق دار ہو سکتا ہے۔[۱]

۱۔ خزیمہ بن ثابت انصاریؓ نے اس کے متعلق کہا تھا:

ما کنت احسب هذا الأمر منصرفًا — عن هاشم ثمّ منها عن ابی حسن
الیس اوّل من صلّی لقبلتهم — و أعرف النّاس بالآثار والسّنن
و آخر النّاس عهدًا بالنبی و من — جبریل عونٌ له فی الغسل والکفن
من فیه ما فیهم لا یمترون به — ولیس فی القوم ما فیه من الحسن
ما ذا الّذی ردّکم عنه فنعلمه — ها إنّ بیعتکم من اغبن الغبن

میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خلافت کو بنی ہاشم اور ابو الحسنؑ سے موڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ پہلے فرد نہیں جنھوں نے قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھی تھی؟ کیا وہ کتاب و سنت کے سب سے بڑے عالم نہیں؟ کیا وہ آخری فرد نہیں جنھیں پیغمبرؐ نے دیکھا تھا اور جبرئیلؑ نے غسل وکفن میں جن کی مدد کی تھی؟ لوگوں میں جتنی بھی فضیلتیں ہیں وہ سب اکیلے علیؑ میں موجود ہیں مگر جو فضیلتیں علیؑ میں ہیں وہ کسی اور میں نہیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اُن کی بیعت سے تمھیں کس چیز نے باز رکھا؟ کچھ تو بتاؤ تاکہ ہم بھی جان سکیں۔ آگاہ رہو کہ تم نے جس کی بیعت کی ہے وہ ایک بدترین فریب ہے جس میں تم مبتلا ہوئے ہو۔ (شیخ مفید، الارشاد ج ۱، ص ۳۲)

(۳) قرابت اور نسب

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وفات رسولؐ کے بعد سعد بن ابی عبادہ انصاری نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ اُس کے قبیلے کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سعد اور اُس کے ساتھیوں نے اس کام کے لیے سقیفہ کا انتخاب کیا تھا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہ بن جراح وہاں آ گئے۔ انھوں نے لوگوں کی توجہ سعد سے ہٹا دی اور حاضرین سے حضرت ابوبکرؓ کے لیے بیعت لی۔ اس مجمع میں مہاجرین اور انصار کے درمیان بہت سی تلخ باتوں کا تبادلہ ہوا۔ اس اجلاس میں جو کچھ ہوا، اس کے کئی اسباب تھے۔ مہاجرین کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ رسول اکرم ﷺ کا تعلق قریش سے تھا اور ہم قریش سے تعلق رکھتے ہیں ... ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب سقیفہ کی گہما گہمی جاری تھی، اُس وقت حضرت علیؑ رسول اکرم ﷺ کی تکفین و تدفین کے انتظامات میں مشغول تھے۔ آپ نے بعد میں سقیفہ میں موجود لوگوں سے فریقین کے دلائل کے متعلق پوچھا۔ جب آپ کو فریقین کے دلائل سے آگاہ کیا گیا تو آپ نے اُن کے دلائل پر تنقید کی۔ حضرت علیؑ کی گفتگو کو سید رضی نے نہج البلاغہ کے خطبہ ۶۵ میں نقل کیا ہے۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۶۰ میں ہے کہ ایک اسدی کے سوال کے جواب میں آپ نے مسئلہ نسب سے یوں استدلال پیش کیا تھا: وَقَدِ اسْتَعْلَمْتَ فَاعْلَمْ اَمَّا الاِسْتِبْدَادُ عَلَيْنَا بِهٰذَا الْمَقَامِ وَنَحْنُ الْاَعْلَوْنَ نَسَبًا وَالْاَشَدُّوْنَ بِالرَّسُوْلِ نَوْطًا فَاِنَّهَا كَانَتْ اَثَرَةً شَحَّتْ عَلَيْهَا نُفُوْسُ قَوْمٍ جان لو کہ (ان لوگوں کا) اس منصب پر خود اختیاری سے جم جانا، باوجودیکہ ہم نسب کے اعتبار سے بلند تھے اور رسول اکرم ﷺ سے رشتۂ قرابت بھی قوی تھا۔ اُن کی یہ خود غرضی تھی جس میں کچھ لوگوں کے نفس اس پر مر مٹے تھے...

آپ کی طرف سے نسب کا استدلال "جدل منطقی" پر مبنی ہے۔ آپ نے یہ دلیل اس لیے پیش کی کہ دوسروں کے استدلال کی بنیاد قرابت نسبی پر تھی۔

اس خطبے میں آپ یہ فرماتے ہیں: اگر میرے متعلق نص رسولؐ اور میری ذاتی لیاقت و اہلیت سے تم صرف نظر بھی کر لو اور صرف رسول اکرم ﷺ سے نسبی قرابت کو ہی معیار خلافت سمجھ لو، پھر بھی میں خلافت کے دوسرے دعویداروں سے کہیں زیادہ خلافت کا حق دار ہوں۔

حضرت عمرؓ کا عہد خلافت

(حضرت عثمانؓ، حضرت ابوبکرؓ کی بیماری کے تمام دنوں میں اُن کے ساتھ ساتھ تھے اور ان کی طرف سے حضرت عمرؓ کی جانشینی کا وصیت نامہ لکھنے پر مامور ہوئے تھے۔ جونہی انھوں نے وصیت نامہ لکھوانا شروع کیا تو وہ بیہوش ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ اپنی ذمے داری سے واقف تھے اس لیے انھوں نے وصیت نامے میں حضرت عمرؓ کا نام لکھ دیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو ہوش آیا تو بولے کہ مجھے وصیت نامہ پڑھ کر سناؤ۔ انھوں نے وصیت نامہ پڑھ کر سنایا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کی تائید کی۔[1] یوں حضرت ابوبکرؓ کی دو سال تین ماہ کی حکومت کے بعد ۱۳ ہجری میں حضرت عمرؓ خلیفہ بنے اور پورے دس سال مسلمانوں پر حکومت کی)۔ جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے اور انھیں یہ احساس ہوا کہ اب وہ دنیا سے جانے والے ہیں تو انھوں نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے ایک نئی روش اپنائی یعنی انھوں نے انتخاب خلیفہ کے لیے شوریٰ بنانے کی وہ روش اپنائی جو نہ تو رسول خدا ﷺ نے اور نہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنائی تھی اور نہ ہم شیعوں کے عقیدے کے مطابق خلافت کا منصب اُس کے سپرد کیا جسے رسول خدا ﷺ اپنا جانشین مقرر کر گئے تھے۔ واضح رہے کہ یہ صرف ہم شیعوں کا عقیدہ نہیں ہے۔ اہل سنت کے منابع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ عملی طور پر اسے قبول نہیں کرتے)۔ (لطف کی بات یہ ہے کہ) حضرت عمرؓ نے اہل سنت کے اس عقیدے کا بھی بھرم نہیں رکھا کہ رسول خدا ﷺ نے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا تھا اور آپ نے خلیفہ کے انتخاب کا اختیار امت کے سپرد کیا تھا۔

خلیفہ ثانی نے خلیفہ اول کی سنت پر بھی عمل نہیں کیا تھا حالانکہ خلیفہ اول نے انھیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ خلیفہ اول کا خلیفہ دوم کو مقرر کرنا نہ تو شیعہ عقیدے کے مطابق تھا اور نہ ہی سنی عقیدے کے مطابق۔ اس طرح خلیفہ دوم کا عمل نہ تو شیعہ عقیدے کے مطابق ہے اور نہ ہی اہل سنت کے عقیدے سے میل کھاتا ہے (سچ تو یہ ہے کہ) اُن کا عمل حضرت ابوبکرؓ کے عمل سے بھی متصادم ہے۔ انھوں نے ایک نئی روش اپنائی تھی۔ انھوں نے چھ مشہور صحابہ پر مشتمل ایک شوریٰ تشکیل دی لیکن ان کی قائم کردہ شوریٰ جمہوریت کی شوریٰ سے بالکل الگ تھی البتہ اسے Aristocracy یعنی اشرافیہ کی حکومت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کئی نمائندوں کی شوریٰ تھی اور نمائندوں کو بھی خود انھوں نے ہی منتخب کیا تھا۔ چونکہ حضرت علیؑ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے انھیں بھی با دلِ نخواستہ

۱۔ رسول جعفریان، تاریخ خلفاء ج ۲، ص ۹۳ بحوالہ تاریخ طبری ج ۳، ۴۲۹

اس شوریٰ میں شامل کیا گیا۔ حضرت علیؑ کے علاوہ شوریٰ میں حضرت عثمانؓ، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمان بن عوف شامل تھے۔ اُس وقت ان افراد کو صحابہ میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس شوریٰ کے اراکین کی تعداد چھ ہے (عام طور پر ارکان شوریٰ کی تعداد طاق ہوتی ہے تاکہ جب کسی مسئلے پر رائے شماری ہو تو ایک طرف کم از کم ایک رکن زیادہ ہو) اس لیے انھوں نے کہا کہ اگر تین افراد کسی ایک پر متفق ہوں اور دوسرے تین ان سے اختلاف کریں تو جس طرف عثمان ہوں، اُس رائے کا احترام کیا جائے۔

کیا کہنا اس شوریٰ کا؟ اگر یہ شوریٰ ہے تو پھر آپ لوگوں کو کسی کی رائے قبول کرنے پر مجبور کیوں کر رہے ہیں؟! شوریٰ کی ہیئت ترکیبی کچھ ایسی تھی کہ حضرت عمرؓ کی خواہش کے عین مطابق اس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ ہی منتخب ہو سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ حضرت علیؑ نصف اراکین شوریٰ کی حمایت حاصل کر سکیں گے اور اس نصف میں حضرت عثمانؓ شامل نہیں ہوں گے۔ حضرت عثمانؓ اُن کے حریف امیدوار تھے۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ کا انتخاب یقینی تھا۔ چنانچہ اس حقیقت کا اظہار حضرت علیؑ نے ان الفاظ میں کیا تھا: **فَصَغَا رَجُلٌ مِنْهُمْ لِضِغْنِهِ وَمَالَ الْآخَرُ لِصِهْرِهِ** اُن میں سے ایک شخص اپنے کینہ کی وجہ سے حق سے منحرف ہو گیا اور دوسرا دامادی کی وجہ سے اُدھر جھک گیا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ شقشقیہ)

خلیفہ ثانی اس منظر نامے سے خوب آگاہ تھے۔ بہرحال اس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا۔ جب رائے شماری ہوئی تو زبیر نے حضرت علیؑ کو ووٹ دیا۔ طلحہ نے حضرت عثمانؓ کو ووٹ دیا۔ سعد نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ اب عبدالرحمان بن عوف کے ہاتھ میں تمام اختیارات آ گئے۔ وہ جسے منتخب کرتے وہی خلیفہ بنتا۔ عبدالرحمان بن عوف اپنے آپ کو غیر جانب دار ثابت کرنے چاہتے تھے۔ (اس سے قبل) حضرت عمرؓ یہ حکم دے چکے تھے کہ ارکانِ شوریٰ تین دن تک ایک گھر میں محبوس رہیں گے اور آپس میں صلاح مشورہ کریں گے اور نماز اور رفع حاجت کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ انھوں نے پہرے داروں کا ایک دستہ بھی مقرر کر دیا تھا اور اُن سے کہا تھا کہ اگر یہ لوگ تین دن میں کوئی فیصلہ نہ کریں تو انھیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ آخر کار عبدالرحمان نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی اور یوں ۲۴ھ میں حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔[1] انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں حضرت عمارؓ اور حضرت ابوذرؓ جیسے کبار صحابہ کو قید کیا، جلاوطن کیا اور کوڑے لگائے۔ حضرت عمارؓ کو اتنے کوڑے لگوائے کہ وہ فتق کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب انھوں نے عبدالرحمان بن عوف کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ عبدالرحمان اپنی زندگی کے آخری پانچ چھ برسوں میں حضرت عثمانؓ سے ناراض ہو گئے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جب میں مر جاؤں تو میری نماز جنازہ عثمان سے مت پڑھوانا۔[2]

۱۔ عبدالرحمان بن عوف نے حضرت علیؑ اور حضرت عثمانؓ سے جو گفتگو کی تھی اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۳۵، ۲۵۰

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۲۱ ۔ ۲۲۶

خلفائے ثلاثہ کی فتوحات کا تجزیہ

پیغمبر اسلام ﷺ (اعلانِ نبوت کے بعد) تیرہ سال مکہ میں رہے۔ اس عرصے میں آپ نے مسلمانوں کو اپنے دفاع کی بھی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ اس وقت مسلمان دفاع اور جہاد کی مطلوبہ طاقت نہیں رکھتے تھے۔ بعد میں جب آپ نے جہاد اور فتوحات کی اجازت دی تو وہ اجازت اسلامی تعلیمات اور ثقافت کے عین مطابق تھی۔ ایک طرف سے فتوحات میں جتنا اضافہ ہوتا اتنا ہی اسلامی تعلیمات اور ثقافت کو فروغ ملتا۔ جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ اسلام میں جذب ہوجاتے تھے اور اسلام اُن کے رگ و پے میں اتر جاتا تھا۔ وہ اسلام کو اچھی طرح جانتے تھے اور دوسروں کو بھی اسلام سمجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔[۱]

فتوحات کا نتیجہ

خلفائے ثلاثہ کی فتوحات کے چند ناخوش گوار نتائج حسب ذیل ہیں:

(۱) خوارج کا ظہور

خلفاء کے دور میں بالخصوص خلیفہ ثالث کے دور میں رسول خدا ﷺ کی تعلیمات سے کہیں زیادہ فتوحات پر زور دیا گیا[۲] اور حکومت اس بات سے غافل رہی کہ باہر کے لوگوں کو اسلام میں لانے کے لیے اسلامی تعلیمات اور ثقافت سکھانے کی بھی ضرورت ہے تاکہ نومسلم روح اسلام سے واقف ہوں۔[۳]

خلفاء نے صرف فتوحات پر توجہ دی جبکہ اسلامی تعلیمات اور ثقافت کے فروغ کے لیے کوئی اقدامات نہ کیے جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں ایک ایسے طبقے نے جنم لیا جو بظاہر اسلام کا دلدادہ تھا مگر وہ صرف اسلام کے ظاہر کو ہی جانتا تھا اور اسلام کی روح سے بالکل ناآشنا تھا[۴] اور یوں ایک جاہل مسلک تقدس مآب طبقہ اسلام میں نمودار ہوا اور یہ طبقہ اسلام کے لیے وبال جان بن گیا۔ خوارج کا تعلق اسی کے طبقے سے تھا۔

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۰ ۔ ۳۱
۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۰ ۔ ص ۸۲ ۔ ۱۰۸
۳۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۵۳
۴۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۱

(۲) ریا اور فریب کاری کا فروغ

خوارج میں بہت سی خامیوں کے باوجود بہادری اور فداکاری موجود تھی۔ اس دوران ایک اور گروہ پیدا ہوا جو بظاہر عبادت گزار اور پرہیزگار دکھائی دیتا تھا۔ ان میں خوارج کی طرح بہادری اور فداکاری کی صفت موجود نہیں تھی۔ ان لوگوں نے اسلام کو رہبانیت اور گوشہ نشینی کا دین بنا دیا تھا۔ ان لوگوں نے تصنع اور ریاکاری کا بازار گرم کیا۔ یہ لوگ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے تلوار اٹھا کر ظالم حکمرانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انھوں نے ہر صاحب فضیلت کے خلاف زبان کی تلوار چلانے کی ٹھانی اور انھوں نے کفر اور فسق کے فتوؤں کا بازار گرم کیا اور ہر صاحب فضیلت کو بے دین کہا۔[۱]

(۳) مسلمانوں کا اَخلاقی زوال

خلفاء کی خلافت میں بالعموم اور حضرت عثمانؓ کی خلافت میں بالخصوص دولت کی ریل پیل اور اس کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے اسلام کو بہت سے خطرات لاحق ہوئے تھے۔ حضرت علیؑ کو ان خطرات کا اچھی طرح سے اندازہ تھا اس لیے آپ نے اس کے خلاف جہاد کیا اور یہی آپ کی شہادت کا سبب بنا۔ آپ نے بیت المال کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف اپنے خطبات، مخطوطات اور تمام کلمات میں بھرپور منطقی اور بیانی جہاد کیا تھا۔

اُس دور میں مسلمانوں نے بہت زیادہ فتوحات حاصل کی تھیں۔ ان فتوحات کی وجہ سے عالم اسلام میں مُن برسنے لگا تھا۔ فتوحات کے ذریعے سے جو دولت عالم اسلام میں آئی اُس سے عوام کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا البتہ ایک مخصوص طبقے کی تجوریاں بھر گئیں۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں تو مالی بے ضابطگیوں کی انتہا ہوگئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بے مایہ افراد جن کے پاس چند برس پہلے تک کچھ نہ تھا سرمایہ دار بن گئے۔

جب دولت کی ریل پیل ہوئی تو اس کے مضر اثرات بھی سامنے آنا شروع ہوئے اور مسلمانوں کا اَخلاقی زوال شروع ہوا۔ حضرت علیؑ نے اُس زمانے میں امت کو اِس تباہ کن خطرے سے آگاہ فرمایا تھا۔ مسعودی نے مروج الذہب میں حضرت عثمانؓ، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبداللہ، زید بن ثابت، یعلیٰ بن امیہ کی بے تحاشا دولت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ دولت زمین سے تو نہیں پھوٹی تھی اور نہ ہی آسمان سے برسی تھی۔ چند افراد کو سرمایہ دار بنانے کے لیے لاکھوں افراد کو مفلسی کی بھٹی میں جھونکا گیا تھا۔[۲]

(۴) اسلامی معاشرے میں انتشار

وہ اسلامی معاشرہ جو مثالی اتحاد کا نمونہ تھا، آہستہ آہستہ اضطراب و انتشار کا شکار ہوتا گیا اور خلوص نیت

۱۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۵۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۲

۲۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۲۵۸۔ ۲۶۰

کی جگہ ذاتی اغراض نے لے لی۔ واضح رہے کہ اس طرح کی فتنہ انگیزیوں کی ابتدا خود عربوں اور مسلمانوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ جب انتشار کی آگ عربوں کا دامن جلا رہی تھی اس وقت باقی تو مسلم اقوام نے اپنے آپ کو اس فتنے سے نہ صرف علیحدہ رکھا بلکہ وہ قوانین اسلام کا دفاع کرنے لگی تھیں۔

امیرالمومنینؑ نے ان فتنوں کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے ایک خطبے میں فرمایا تھا:

...إِنَّكُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ أَغْرَاضُ بَلَايَا قَدِ اقْتَرَبَتْ فَاتَّقُوا سَكَرَاتِ النِّعْمَةِ وَاحْذَرُوا بَوَائِقَ النِّقْمَةِ

... اے گروہ عرب! تم ایسی ابتلاؤں کا نشانہ بن چکے ہو جو عنقریب تمھیں اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔ عیش و تنعم کی بدمستیوں کے اثرات اور انتقام کی بلاؤں سے ڈرو...[1]

اس بیان کی روشنی میں ان فتنوں کے اسباب کو ایک گروہ کی سرکشی اور دنیوی لذتوں میں مدہوشی اور دوسرے گروہ کے کینہ و انتقام میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔[2]

ساسانی سلطنت کی شکست اور مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب

ساسانی سلطنت کی شکست اور مسلمانوں کی کامیابی کے کچھ اسباب یہ ہیں:

(۱) لوگ ساسانی حکومت سے ناخوش تھے۔

(۲) ساسانی حکومت میں معاشرتی اونچ نیچ پائی جاتی تھی۔

(۳) زرتشت کی تعلیمات بے روح ہو چکی تھیں۔

(۴) ساسانی حکومت کے نظام میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔

(۵) مبلغین اسلام کے توسط سے اسلام کے اصول و مبانی اہل ایران تک پہنچ چکے تھے۔

(۶) مجاہدین اسلام کا اپنے اور اپنے دین پر مکمل اعتماد اور یقین۔[3]

اسلامی تمدن میں ایران کا کردار

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے عظمت اور افتخار کی عظیم داستانیں رقم کی تھیں... اور دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے پرشکوہ اور عظیم تمدن کی داغ بیل ڈالی تھی جو کئی صدیوں تک جاری رہی اور ان کا قائم کردہ تمدن پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ بنا رہا۔ اسلامی تمدن آج بھی انسان کے روشن تمدن کا ایک حصہ شمار ہوتا ہے اور تاریخ تمدن اس پر ناز کرتی ہے۔ مسلمان کئی صدیوں تک سائنس، صنعت و حرفت، فلسفہ، اخلاق

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۹

۲۔ حکمت ہا و اندرز ہا ص ۱۳۰ ۔ ۱۳۲

۳۔ محمد نصیری، تاریخ تحلیلی اسلام ص ۱۴۳

اور اعلیٰ نظم و نسق کی وجہ سے دنیا میں چھائے رہے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ ظہور اسلام، اسلامی حکومت کے قیام اور مختلف اقوام کے اسلامی حکومت کے زیر نگیں نے کے بعد ایک عظیم اور پرشکوہ تمدن وجود میں آیا۔ اس عظیم تمدن کی نظیر دنیا میں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اسے انسانیت کی تاریخ میں "اسلامی تمدن" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس تمدن کے قیام میں ایشیا، افریقا اور یورپ کی بہت سی اقوام شریک تھیں۔ اہل ایران کا تعلق بھی ان اقوام سے ہے جو اس تمدن کے قیام میں شریک اور حصہ دار تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تمدن کے قیام میں ایرانیوں کا بہت بڑا حصہ ہے...

سوال یہ ہے کہ کیا اس تمدن کا بنیادی محرک اسلام تھا اور اس کی تہہ میں اسلامی روح کارفرما تھی؟ یا اس کے اسباب اور محرکات کچھ اور تھے؟... چنانچہ اس تاریخی، اجتماعی اور دینی بحث کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کی ایرانی تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے کہ اُس عہد کی فکری، اعتقادی، اجتماعی، سیاسی، خاندانی اور اخلاقی قدریں کیا تھیں۔ ان سب قدروں کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کے ساتھ ہمیں اس بات کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے کہ اسلام نے اس سلسلے میں ایران کو کیا دیا ہے؟ پھر ہم کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔

خوش قسمتی سے ظہور اسلام کے وقت کی ایران کی تاریخ بالکل روشن اور محفوظ ہے اس لیے حقیقت کا جاننا انتہائی آسان ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پچھلی نصف صدی سے اس موضوع پر بہت زیادہ بحثیں ہو رہی ہیں اور اس مسئلے پر بحث کا آغاز یورپ کے مستشرقین کی طرف سے کیا گیا ہے۔[2]

برلن یونیورسٹی میں "ہنر اسلامی" کے پروفیسر ارنسٹ کونل (۱۹۳۵ء تا ۱۹۶۴ء) نے اپنے ایک لیکچر میں یہ خوبصورت نکتہ بیان کیا تھا کہ مسلمانوں کا تعلق مختلف نسلوں سے تھا۔ انھوں نے اپنے نسلی اختلافات پر ایک پل تعمیر کیا اور وہ پل اسلام تھا یعنی اسلام نے پہلی بار عقیدے کی بنیاد پر سیاسی اور اجتماعی وحدت قائم کی تھی اسی لیے ایک عظیم اور وسیع تمدن کے قیام میں بہت سی سہولتیں پیدا ہوئی تھیں۔[3]

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے ایران کو ایک جدید فکری اور اعتقادی نظام عطا کیا۔ اہل ایران نے بھی کھلے دل سے اسلام کے فکری اور اعتقادی نظام کو قبول کیا اور اپنے پرانے عقائد سے دوری اختیار کر لی۔ اہل ایران کی طرف سے یہ قبولیت اتفاقی اور فوری نہیں تھی بلکہ یہ قبولیت تدریجی تھی اور یہ اثر انگیزی زیادہ تر اُس وقت پیدا ہوئی جب ایران، عربوں کے مقابلے میں آزاد اور طاقتور تھا۔

یہ بحث اس لحاظ سے بھی دل چسپ ہے کہ اسلام کا ایک خصوصی امتیاز یہ ہے کہ مفتوح اقوام کی روح کی گہرائیوں تک جس طرح اسلام نفوذ کرتا ہے دنیا کا کوئی نظام اس طرح نفوذ نہیں کر سکتا[4] اور اس تصور کا

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱، ص ۳۴۸۔ گوستاولوبون، تمدن اسلام و غرب ص ۷۵۱۔ ول ڈیورانٹ، تاریخ تمدن ج ۱۱، ص ۳۱۷

۲۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۱۳۶۔ ۱۳۷ ۳۔ مجموعہ آثار ج ۱۴۔ ص ۱۳۱۔ ہنر اسلامی، ترجمہ ہوشنگ طاہری ص ۶۔ ۸

۴۔ گوستاولوبون Gustave Le Bon، تمدن اسلام و غرب ص ۵۵۲

دوسرا رخ یہ ہے کہ جس طرح اہل ایران نے اسلام قبول کیا اتنی آسانی سے دوسری کسی قوم نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یقیناً اہل ایران کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی طرح کسی بھی قوم نے اپنے فکری نظام کو خیر باد نہیں کہا تھا اور جس طرح اہل ایران نے اسلام کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کئے تھے کسی قوم کی طرف سے ایسا نہیں ہوا تھا۔[1]

تمدن ایران پر اسلام کے اثرات

اسلام نے ایران کی جو پہلی چیز ختم کی تھی وہ مذہبی عقائد کی رنگا رنگی تھی۔ اس کی جگہ اسلام نے انھیں عقیدے کی وحدت عطا کی۔[2] اسلام نے ایران اور سرزمین مشرق میں مسیحیت کی پیش قدمی اور اس کے اثر کو روک دیا تھا۔[3] جب ہم اسلام کے بعد کے ایران کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایران میں علمی و ثقافتی انقلاب دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ پیاسے کو صحرا میں پانی مل گیا ہو۔ ایرانیوں نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور اس کے نتیجے میں انھوں نے پہلی دفعہ اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا...

ایک طرف سے ...تو اسلامی علوم و تمدن کے علاوہ یونانی، ہندی اور مصری تمدن و ثقافت کے لیے دروازے کھل گئے اور ایک عظیم اسلامی تمدن کی عمارت کے لیے بنیاد فراہم ہوئی نیز اس کے نتیجے میں بوعلی سینا، فارابی، ابوریحان البیرونی، عمر خیام، خواجہ نصیر الدین طوسی اور ملا صدرا کے علاوہ سیکڑوں فزکس، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ کے ماہرین، طبیب، ادیب، فلسفی اور عارف منظر عام پر آئے...

اسلام نے ایران کو خودشناسی کے ساتھ ساتھ جہاں شناسی بھی سکھا دی اور اس خود شناسی اور جہاں شناسی سے یہ نظریہ باطل ہوگیا کہ ایرانیوں کی قابلیت صرف فوجی طاقت تھی اور اُن کے پاس علمی دماغ نہیں تھا۔ اگر چند ادوار میں ایرانی پس ماندہ رہے ہیں تو اس پس ماندگی کی وجہ یہ تھی کہ وہ "زرتشتی حکمرانوں" کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایران میں اسلام آیا اور "زرتشتیوں کی زنجیریں" ٹوٹیں تو ایرانیوں نے اسلامی دور میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔[4]

اسلام نے ایران سے ثنویت، آتش پرستی، توہم پرستی اور آفتاب پرستی کا خاتمہ کیا اور انھیں توحید پرستی اور خدا پرستی کا عقیدہ دیا۔ اسلام نے عربوں کی اتنی خدمت نہیں کی جتنی ایرانیوں کی خدمت کی ہے کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں عرب صرف شرک فی العبادت میں مبتلا تھے جبکہ ایران کی جاہلیت اس سے کہیں زیادہ بدتر تھی۔ اہل ایران شرک فی الخالقیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اسلام نے ایرانیوں کے سینگوں والے، داڑھی مونچھوں والے گھنگریالے بالوں والے، لاٹھی بردار، ردا بردوش اور کنگرہ دار تاج والے خدا کے تصور کو ختم کیا اور اس کی بجائے

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۱۵۱
۲۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۳۱۳۔ ص ۳۳۵۔ ۳۳۶
۳۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۳۱۴
۴۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۳۱۷۔ ۳۱۸

خدائے قیوم کا عقیدہ عطا کیا[1] اور یہ بتایا کہ زبانیں اس کی توصیف [2] سے عاجز ہیں اور وہ ہر جگہ ہے اور ہر چیز کے ساتھ ہے اور کوئی چیز اس کے ساتھ نہیں ہے۔[3] وہ اول ہے، وہ آخر ہے، وہ ظاہر ہے، وہ باطن ہے [4] آنکھیں اُس کو نہیں دیکھ سکتیں مگر وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔[5]

اُس وقت کا طبقاتی معاشرہ دو پرانی بنیادوں یعنی خون اور ملکیت پر قائم تھا (تمام قوانین، رسوم اور آداب کا دار و مدار ان دو بنیادوں پر تھا) اسلام نے اس کی بجائے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس کی بنیاد خون اور ملکیت پر نہیں بلکہ فضیلت، علم، محنت، عمل اور تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔

اسلام نے موروثی اور طبقاتی روحانیت کو منسوخ کیا اور اسے موروثیت سے نکال کر علم اور تقویٰ کو اس کی بنیاد قرار دیا... اسلام نے بادشاہوں کے "آسمانی نژاد" ہونے کے نظریے کی سخت تردید کی۔[6] اسلام نے عورتوں کو حقوق دیے اور حرم سرا اور بے شمار شادیوں کے اصول کو منسوخ کیا۔ اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت محدود کر دی جو اجتماعی ضرورت کے عین مطابق ہے اور اس کے لیے یہ شرط رکھی کہ شوہر بیویوں کے درمیان عدل کر سکتا ہو تو دوسری شادی کرے، ورنہ دوسری شادی نہ کرے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنی بیوی عاریتاً کسی کو دے دیتے تھے، استلحاق اولاد، نکاح شغار، محارم سے نکاح اور بیوی پر شوہر کی حکمرانی کے خود ساختہ قوانین کو منسوخ کیا۔ اسلام صرف مسلمان ہو جانے والے ایرانیوں کے لیے ہی خیر و برکت کا باعث نہیں بنا بلکہ اُس نے زرتشتی آئین پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے اور بلا واسطہ اس میں ہمہ گیر اصلاحات کا موجب ثابت ہوا...

اسلام نے ایران اور اہل ایران کی جو خدمت کی ہے وہ صرف قرون اولیٰ تک محدود نہیں ہے۔ اسلام جب سے اس ملک پر سایہ فگن ہوا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک اِس ملک کو جب بھی کوئی خطرہ درپیش ہوا وہ صرف اسلام کے وسیلے سے دور ہوا۔ اسلام نے منگولوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور انھیں آدم خوری سے علم دوست اور دانش پرور بنا دیا تھا چنگیز خان کے پوتے کو محمد خدا بندہ میں بدل دیا تھا اور نسل تیمور سے بایسنغر اور امیر حسین بایقرا کو وجود بخشا۔ اسلام آج بھی بیرونی مخرب فلسفہ کا مقابلہ کر رہا ہے اور اسلام اہل ایران کے لیے عزت و آزادی اور احساس شرف کی اساس ہے۔ آج ملت ایران جس چیز پر فخر کر رہی ہے اور دوسری اقوام تک جس چیز کو پہنچانے کی خواہش رکھتی ہے وہ قرآن اور نہج البلاغہ ہے نہ کہ "اوستا" اور "زند"۔[7]

۱۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۵۵)

۲۔ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ (سورۂ صافات: آیت ۱۸۰)

۳۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ (سورۂ حدید: آیت ۴)

۴۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (سورۂ حدید: ۳)

۵۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (سورۂ انعام: آیت ۱۰۳)

۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۳۲۱۔۳۲۲

۷۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۳۲۴۔۳۲۵

حضرت عثمانؓ کا قتل

(۱) حضرت عثمانؓ کا کردار

اسلامی تاریخ کی پہلی نصف صدی ہجری میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا ہوا...

حضرت عثمانؓ نے پہلی بار اسلامی دنیا میں "اشرافیہ" کی حکومت قائم کی جبکہ ایسی حکومت کا نہ تو اسلام میں کوئی تصور موجود تھا اور نہ ہی ان سے پہلے خلفاء کی زندگی میں اس کی کوئی مثال ملتی تھی...

اُن کے دور حکومت میں مالی بے ضابطگیوں کا دروازہ کھلا۔ حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں نے خلافت کا منصب اس لیے قبول کیا کہ لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہو چکے تھے، ایک طبقہ دولت مندوں کا تھا اور دوسرا فاقہ کش غریبوں کا تھا۔

آپ نے اس جملے میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کی Mismanagement کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی سیاست کا سب سے کمزور پہلو اقرباء نوازی تھا۔[۱]

ان کی قوم میں زمانۂ جاہلیت میں اشرافیت کی کچھ نہ کچھ عادت جڑ پکڑ چکی تھی اور انھوں نے اپنے عہد حکومت میں اُسے مضبوط کرنے کے لیے اراضی تقسیم کیں اور مسلمانوں کی جائیداد یا تو اپنے رشتے داروں کی بخش دی یا پھر اپنے دوستوں اور طرفداروں میں تقسیم کردی۔

(معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ انھوں نے جس صحابی کو بیت المال کا خزانچی بنایا تھا وہ مسجد میں جا کر لوگوں سے کہنے لگا: "عثمان کا خیال یہ ہے کہ میں اُس کا اور اُس کے رشتے داروں کا خزانچی ہوں جبکہ میں اپنے

۱۔ اس کا ہلکا سا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

انھوں نے اپنے مادری بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا والی مقرر کیا۔ (تاریخ طبری ج ۴، ص ۲۵۱)

انھوں نے اپنے ایک اور رشتے دار عبداللہ بن عامر بن کریز کو بصرہ کا والی مقرر کیا اور ایران کو بھی اُس کی ماتحتی میں دیا۔

(تاریخ طبری ج ۴، ص ۲۶۴)

انھوں نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو کوفہ کا والی مقرر کیا اور مشرقی مفتوحہ علاقوں کا بھی نگران بنایا۔

(تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۶۵)

انھوں نے معاویہ کو شام کا گورنر برقرار رکھا اور شام کے مغربی علاقوں کا حاکم مقرر کیا۔ (انساب الاشراف ص ۱۸۸)

پ کو تم مسلمانوں کے بیت المال کا خزانچی سمجھتا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری دولت عثمان کے حوالے کروں۔" یہ کہہ کر اُس نے بیت المال کی چابیاں لوگوں کے سامنے پھینک دیں اور ناراض ہو کر مسجد سے چلا گیا) [1] علاوہ ازیں انھوں نے بیت المال سے بے تحاشا "خسروانہ عطائیں" کی تھیں جس کے نتیجے میں دس بارہ سال کے مختصر عرصے میں عالم اسلام میں ایسے ایسے دولت مند پیدا ہوئے جن کی کہیں مثال نہ ملتی تھی۔ سیاسی لحاظ سے بھی انھوں نے اسی اقلیت کو کلیدی عہدوں پر فائز کیا تھا۔ [2]

عیش و تنعم کی بدمستی: امیر المومنینؑ نے اپنے خطبے میں ایک نکتہ بیان کیا ہے جسے آپ نے "سکر نعمت" (عیش و تنعم کی بدمستی) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور آپ نے لوگوں کو خبردار کیا تھا کہ دولت کی فراوانی اپنے ساتھ "بلائے انتقام" کو لے کر آتی ہے۔ [3]

جی ہاں جب (فتوحات کی وجہ سے) عالم اسلام پر ہُن برسنے لگا تو بیت المال کی غیر منصفانہ تقسیم شروع ہوئی اور اسلامی معاشرے میں طبقاتی نظام نے جنم لیا تو اسلامی معاشرے میں دنیا زدگی اور عیش پرستی کی پرانی بیماری عود کر آئی [4] اور ہر جگہ فتنوں کی تخم پاشی کی گئی۔ اس کے ساتھ مزید بربادی اُس وقت ہوئی جب حکومت کی زمام بدعنوان افراد کے ہاتھوں میں آئی اور امیر المومنینؑ کے بقول اَلْاَثَرَۃ پیدا ہو گیا (یعنی دنیا پرستی اور نفس پرستی کا جذبہ بہت زیادہ پیدا ہو گیا) جس کے نتیجے میں بے تحاشا مظالم ہوئے۔ ایک طبقہ وہ تھا جہاں دولت کی ریل پیل تھی اور اسے کوئی غم فکر نہیں تھا۔ یہ طبقہ عیش پرستی میں ایسا مست تھا کہ آپے سے باہر ہو چکا تھا جبکہ دوسرا طبقہ جو محروم اور مظلوم تھا وہ انتقام لینے پر تیار ہو چکا تھا۔ آخر کار کشمکش شروع ہوئی۔ اس حالت کا خلاصہ، امیر المومنینؑ کے دو جملوں میں پیش کیا جا سکتا ہے: اِتَّقُوْا سَكَرَاتِ النِّعْمَةِ وَاحْذَرُوْا بَوَائِقَ النِّقْمَةِ عیش و تنعم کی بدمستیوں کے اثرات اور انتقام کی بلاؤں سے ڈرو... (یعنی ایک طرف بے تحاشا دولت ہے اور دوسری طرف انتقام کے شعلے بلند ہیں)۔ [5]

جب خلیفہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں میں سے کسی کو ایک لاکھ درہم اور کسی کو ایک لاکھ دینار دے رہے تھے اور اُن کے رشتے دار اپنی جیبیں بھر رہے تھے اور اپنے لیے بکریوں کے ریوڑ اور گھوڑوں کے گلّے اور

۱۔ بلاذری، انساب الاشراف ج ۴، ص ۵۱۸ اور ۵۴۷ بحوالہ تاریخ تحلیلی اسلام، محمد نصیری ص ۱۳۶

۲۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ۱۴۳۔۱۴۴

حسب ذیل اقدامات حضرت عثمانؓ کے قتل کا باعث بنے تھے:

(۱) اموی حکومت کی تاسیس (۲) طے شدہ منصوبے کے تحت تقرریاں اور معزولیاں

(۳) بیت المال میں سخت بے ضابطگیاں (۴) حضرت ابوذرؓ اور دیگر بزرگ صحابہ پر مظالم اور اُن کی توہین

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۹ ۴۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۲۶۱۔۲۶۴ ۵۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۳۲۔۱۳۳

غلام اور کنیزیں خرید رہے تھے اُس وقت حضرت ابوذرؓ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف تھے۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت عثمانؓ نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح سے حضرت ابوذرؓ کی زبان بند کی جائے جو اُن کے لیے ہزاروں تلواروں سے زیادہ گھائل کرنے والی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوذرؓ کو شام جلاوطن کیا گیا، انھیں کوڑے مارے گئے مگر وہ حق گوئی سے باز نہ آئے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے ایک غلام کو رقم کی ایک تھیلی دی اور اس سے کہا کہ اگر تو یہ تھیلی ابوذرؓ کو دینے میں کامیاب ہوگیا تو میں تجھے آزاد کردوں گا۔ غلام خاصا چرب زبان تھا۔ وہ تھیلی لے کر حضرت ابوذرؓ کے پاس آیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح بھی حضرت ابوذرؓ اُس سے رقم کی تھیلی لے لیں ...لیکن حضرت ابوذرؓ نے تھیلی نہ لی اور غلام سے کہا کہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تجھے آزادی ملے لیکن مجھے افسوس ہے کہ اگر میں نے یہ رقم لے لی تو تو آزاد ہو جائے گا مگر مجھے عثمان کا غلام بننا پڑے گا۔[1]

(۲) لوگوں کا ردعمل

آہستہ آہستہ مملکت کے ہر گوشہ وکنار سے اعتراضات اٹھنے لگے۔ مختلف شہروں سے لوگ اعتراض و تنقید کی غرض سے مدینہ کی طرف چل پڑے اور انھوں نے (حکومتی پالیسیوں پر) اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ جب زبانی اور تحریری شکایات کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو عوام مختلف شہروں بالخصوص کوفہ اور مصر سے شکایات کے ازالے کے لیے مدینہ آئے اور اہل مدینہ کے تعاون سے انھوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کردی (انھوں نے ۴۹ دن تک خلیفہ کے گھر کا محاصرہ کیے رکھا)۔[2] خلیفہ نے زندگی کے آخری لمحات تک اُن کا مقابلہ کیا۔ آخرکار (ماہ ذی الحجہ ۳۵ھ میں)[3] شورشیوں نے انھیں قتل کردیا۔[4]

جب لوگ خلیفہ کے خلاف شورش میں مصروف تھے... تو حضرت علیؑ شورش پسندوں سے لاتعلق تھے اور آپ خلیفہ کے حامیوں میں سے بھی نہیں تھے۔ آپ شورش پسندوں اور خلیفہ کے درمیان رابطہ کار کی حیثیت رکھتے تھے اور آپ کی کوشش تھی کہ شورشیوں کے جائز مطالبات تسلیم کرائے جائیں اور خلیفہ بھی قتل ہونے سے بچ جائیں۔ یہی کچھ نہج البلاغہ میں ہے اور تاریخ بھی مسلمہ طور پر یہی گواہی دیتی ہے۔ آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا تھا: اِنِّي اَنْشُدُكَ اللهَ اَلّا تَكُونَ اِمَامَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْمَقْتُولَ فَاِنَّهُ كَانَ يُقَالُ يُقْتَلُ فِي هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِمَامٌ

۱۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۷۰۔ ۷۱

۲۔ مسعودی، مروج الذہب ج ۲، ص ۳۴۶

۳۔ مروج الذہب ج ۲، ص ۳۴۶۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۶۵

۴۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ۱۴۴

يُفْتَحُ عَلَيْهَا الْقَتْلُ وَالْقِتَالُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم اس امت کے وہ سربراہ نہ بنو کہ جسے قتل ہی ہونا ہے چونکہ کہا گیا ہے کہ اس امت میں ایک ایسا حاکم مارا جائے گا جو اس کے لیے قیامت تک قتل وخوں ریزی کا دروازہ کھول دے گا۔ (خطبہ ۱۶۲)

الغرض حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں جو اُن کا بدترین دور تھا حضرت علیؑ نے پوری کوشش کی کہ وہ خلیفہ اور شورشی افراد کے درمیان رابطہ کار کا کردار ادا کریں۔

ابتدا میں جب عبدالرحمان بن عوف نے ایک سازشی منصوبے کے تحت حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنایا اُس وقت لوگوں نے حضرت علیؑ سے کہا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا اور جب انھوں نے یہ سب کچھ کرلیا ہے تو اس کے جواب میں آپ کیا کررہے ہیں؟ اُس وقت آپ نے فرمایا تھا: لَأُسْلِمَنَّ مَا سَلِمَتْ أُمُورُ الْمُسْلِمِينَ وَلَمْ يَكُنْ فِيهَا جَوْرٌ إِلَّا عَلَيَّ خَاصَّةً خدا کی قسم! جب تک مسلمانوں کے امور کا نظم ونسق برقرار رہے گا اور صرف میری ہی ذات ظلم وجور کا نشانہ بنی رہے گی تب تک میں خاموشی اختیار کرتا رہوں گا۔ (خطبہ ۷۲)[1]

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں حضرت علیؑ ہی وہ واحد شخص تھے جن کی طرف انقلابی دیکھتے تھے جبکہ حضرت عثمانؓ انھیں کبھی قبول کرتے تھے اور کبھی رد کرتے تھے۔ آپ نے انقلابیوں اور خلیفہ کے درمیان مصالحت کرانے کی بہت کوشش کی۔ آپ خلیفہ کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے کہ تم اپنی روش کو تبدیل کردو اور لوگوں کے مطالبات مان لو اور تم نے جن بدعنوان لوگوں کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے انھیں اپنے سے الگ کردو۔ ان میں مروان بن حکم سرفہرست تھا۔ حضرت رسول خدا ﷺ نے مروان اور اُس کے باپ کو اُن کی اسلام دشمنی کی وجہ سے مدینہ بدر کردیا تھا[2]... لیکن حضرت عثمانؓ نے اقتدار میں آنے کے بعد (اُن کو مدینہ واپس بلا لیا تھا) اپنی بیٹی کی شادی مروان سے کردی اور اُسے اپنا چیف سکریٹری بنا لیا۔ یہ شخص بہت سی ناراضگیوں کا باعث بنا ہوا تھا۔ حضرت علیؑ نے حضرت عثمانؓ سے کئی بار کہا کہ تم مروان کو یہاں سے نکال دو (جس طرح سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اسے واپس نہیں آنے دیا تھا، تم بھی اسے یہاں سے نکال دو)۔[3]

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار، ص ۶۰ ـ ۶۱

۲۔ نبی اکرم ﷺ نے مروان اور اس کے باپ کو جلاوطن کرکے طائف بھیج دیا تھا۔

۳۔ ☆ ابن عبدالبر کی الاستیعاب میں ہے کہ حکم، رسول اکرم ﷺ کی نقلیں اتارا کرتا تھا حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے خود اُسے یہ حرکتیں دیکھ لیا۔ اُس کا بیٹا مروان اُس وقت سات آٹھ برس کا تھا اور وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ طائف میں رہا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے اپنے زمانۂ خلافت میں حکم بن ابی العاص کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی تھی مگر حضرت عثمانؓ نے نہ صرف یہ کہ حکم کو اپنی خلافت میں مدینہ واپس بلا لیا تھا بلکہ مروان کو اپنا چیف سکریٹری بنا لیا تھا۔

(خلافت وملوکیت مولانا مودودی صفحہ ۱۱۰) رضوانی

چنانچہ حضرت عثمانؓ وعدہ کرتے تھے کہ میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا لیکن بعد میں وہ وعدے سے پھر جاتے تھے۔ انھوں نے کئی بار عہد شکنی کی اور لوگوں کے مطالبات ماننے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں انقلابیوں نے اُن کے گھر میں گھس کر انھیں قتل کردیا۔[۱]

(۳) قتل عثمانؓ میں معاویہ کا کردار

حضرت علیؑ نے معاویہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

تمہارا خفیہ ہاتھ کہنیوں تک خون عثمانؓ سے آلودہ ہے پھر تم کس منہ سے خون عثمانؓ کے قصاص کی بات کرتے ہو؟ ... حضرت علیؑ نے ایک ایسے راز سے پردہ اٹھایا جسے تاریخ کی تیز نگاہیں بھی کم ہی دیکھتی ہیں۔ البتہ عصر جدید کے محققین نے تاریخ کے مختلف زاویوں پر تحقیق کرکے اس نکتے کو پا لیا ہے ورنہ اس سے قبل سابقہ ادوار میں تو کوئی بھی یہ باور کرنے پر تیار نہیں تھا کہ معاویہ کا بھی قتل عثمانؓ میں کوئی کردار ہوسکتا ہے یا کم از کم اُس نے عثمانؓ کے دفاع میں کوتاہی سے کام لیا ہے۔ معاویہ و عثمانؓ دونوں اموی تھے ... معاصر مورخین اُن کے تعلق کو آج کل کی سیاست میں پارٹی پولیٹکس کے زاویے سے دیکھتے ہیں یعنی معاویہ اور عثمانؓ میں صرف قبیلہ ہی مشترک نہیں تھا کہ خون اور قبیلے کے رشتے نے انھیں آپس میں جوڑ رکھا ہو بلکہ اُن دونوں کے مقاصد بھی مشترک تھے۔ حضرت عثمانؓ معاویہ سے محبت کرتے تھے اور اُس کی حمایت بھی کرتے تھے اور معاویہ بھی حضرت عثمانؓ سے دوستی کا دم بھرتا تھا اسی لیے کوئی یہ باور نہیں کرسکتا تھا کہ خلیفہ کے قتل میں معاویہ کا بھی ہاتھ ہوگا۔

(بات یہ ہے کہ) معاویہ کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ زندہ عثمانؓ سے تو مردہ عثمانؓ اُس کے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ موزوں ہے، تو اُس نے اُن کے قتل کے لیے زمین ہموار کی حالانکہ معاویہ اُن کی مدد کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا اور انھیں قتل ہونے سے بچا سکتا تھا مگر اُس نے اُن کی کوئی مدد نہ کی اور اُن کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔[۲]

حضرت علیؑ کی تیز نگاہوں نے معاویہ کے مخفی ہاتھ کو دیکھ لیا تھا اور پس پردہ واقعات کو جان لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے معاویہ کو قتل عثمانؓ میں برابر کا شریک اور ذمے دار ٹھہرایا تھا۔[۳]

۱۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ۱۳۴ ـ ۱۳۵

۲۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۲۸

۳۔ (سیری در نہج البلاغہ ص ۱۶۷ـ ۱۶۸ـ ۱۶۹، ۱۷۳ـ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۳۴ ـ ۱۳۶)
اس نکتے کو خطبہ ۲۲، خطبہ ۱۳۷ اور مکتوب ۲۸ اور مکتوب ۳۷ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

بحث کے چیدہ نکات

(۱) اُسامہ بن زید کی قیادت میں لشکر کی تشکیل کچھ طالع آزما صحابہ کی سازش کو ناکام بنانے کی بہترین تدبیر تھی۔ رسول اکرم ﷺ حضرت علیؑ کی خلافت کے لیے خطرہ بننے والوں کو جزیرۃ العرب سے نکال کر رومیوں کے خطرے سے اسلامی حکومت کی سرحدوں کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت علیؑ کی خلافت کے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا چاہتے تھے مگر آپ کی سخت تاکید کے باوجود کچھ صحابہ کے تاخیری حربوں کی وجہ سے لشکر اُسامہ روانہ نہ ہو سکا جس کے نتیجے میں سقیفہ کا واقعہ پیش آیا۔

(۲) رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد سعد بن ابی عبادہ نے خلافت کا دعویٰ کیا اور انصار کے ایک گروہ کے ساتھ سقیفہ میں اجتماع منعقد کیا لیکن جب حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہ بن جراح سقیفہ پہنچے تو لوگوں کی توجہ سعد سے ہٹ گئی اور وہاں پر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی۔

(۳) حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے استحقاق کے لیے نہج البلاغہ میں تین طرح سے استدلال کیا ہے:

(۱) پیغمبر اسلام ﷺ کی نص اور وصیت
(۲) خلافت کے لیے آپ کی لیاقت اور اہلیت
(۳) پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ نسبی قرابت اور روحانی تعلق

(۴) نہج البلاغہ کا دوسرا خطبہ واضح طور پر اہلبیتؑ کے متعلق ہے اور اس میں وَفِيهِمُ الْوَصِيَّةُ وَالْوِرَاثَةُ کے الفاظ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے قدم قدم پر اپنے لیے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر آپ آنحضرت ﷺ کی طرف سے منصوص نہ ہوتے تو آپ اتنی شد و مد سے استحقاق خلافت کو بیان نہ کرتے۔

(۵) اپنے حق خلافت کے لیے آپ نے نص کے علاوہ اپنی لیاقت، فضیلت، قرابت و نسب سے بھی نہج البلاغہ کے خطبات میں استدلال کیا ہے۔

(۶) حضرت ابوبکرؓ کا اپنے بعد وصیت کے ذریعے خلیفہ نامزد کرنے کا عمل سنی اور شیعہ دونوں مذاہب کے نظریے کے خلاف تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا عمل بھی سنی اور شیعہ نظریات کے خلاف تھا بلکہ اُن کا عمل حضرت ابوبکرؓ کے عمل سے بھی متصادم تھا۔ انھوں نے انتخاب خلیفہ کے لیے نئی روش اپنائی تھی۔

(۷) حضرت عمرؓ نے زخمی ہونے کے بعد چھ صحابہ پر مشتمل ایک شوریٰ تشکیل دی تھی۔ مذکورہ صحابہ کا انتخاب "اشرافیہ کی حکومت" کی طرز پر کیا گیا تھا۔ پھر انھوں نے کہا تھا کہ اگر تین افراد ایک رائے قائم کریں اور دوسرے تین افراد ان سے علیحدہ رائے کا اظہار کریں تو جس گروہ میں عثمانؓ ہوں اس رائے کو ترجیح دی جائے۔ الغرض اس شوریٰ کی ترکیب ایسی تھی کہ اس سے عثمانؓ کا چناؤ یقینی تھا۔

(۸) رسول اکرم ﷺ، مکہ میں (اعلان نبوت کے بعد) تیرہ برس رہے۔ اس دوران آپ نے کسی کو دفاع کی بھی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ آپ جانتے تھے کہ ابھی مسلمان دفاع اور جہاد کی طاقت نہیں رکھتے۔

بعد میں آپ نے جہاد و فتوحات کی اجازت دی تو صرف ثقافت اسلامی کی حد میں ہی اجازت دی تھی۔

(۹) خلفاء کے عہد حکومت میں بالعموم اور خلیفہ ثالث کے عہد میں بالخصوص اسلامی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی جبکہ اُن گنت فتوحات ہوئیں لیکن حکومت نے یہ نہ سوچا کہ فاتحین کے لیے اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعلیم کی بھی ضرورت ہے اور مجاہدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ روح اسلام سے آشنا ہوں۔ اس غفلت کے نتیجے میں دنیائے اسلام میں "مقدس مآب" اور "زاہد مسلک" فرقے نمودار ہوئے۔ خوارج بھی اسی طرز تفکر کی پیداوار تھے۔

(۱۰) خلفاء کے عہد میں بالعموم اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں بالخصوص دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے عالم اسلام کو خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ بیت المال کی دولت عوام پر خرچ کرنے کی بجائے چند لوگوں میں تقسیم کردی جاتیں جس سے امت میں اخلاقی زوال آیا۔

(۱۱) اسلامی معاشرہ مثالی اتحاد اور اخلاص نیت کے بعد تفریق اور خودغرضی میں مبتلا ہوگیا۔ حضرت علیؑ نے اس وقت کے معاشرے کو دو طبقاتی معاشروں سے تعبیر کیا تھا کہ جہاں ایک طرف مال مست تھے اور دوسری طرف فاقہ مست تھے اور مال مستوں کے خلاف فاقہ مستوں کے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

(۱۲) مسلمانوں کی کامیابی اور ساسانی حکومت کے زوال کے حسب ذیل اسباب تھے:

(۱) لوگ ساسانی حکومت سے ناخوش تھے۔

(۲) ساسانی حکومت میں معاشرتی اونچ نیچ پائی جاتی تھی۔

(۳) زرتشت کی تعلیمات بے روح ہو چکی تھیں۔

(۴) ساسانی حکومت کے نظام میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔

(۵) مبلغین اسلام کے توسط سے اسلام کے اصول و مبانی اہل ایران تک پہنچ چکے تھے۔

(۶) مجاہدین اسلام کا اپنے اور اپنے دین پر مکمل اعتماد اور یقین۔

(۱۳) اسلام نے ایران سے پراگندہ افکار، غلط مذہبی عقائد، دوئی پرستی، اوہام پرستی، آفتاب پرستی کا خاتمہ کیا اور اس کے ساتھ موروثی اور طبقاتی روحانیت کو منسوخ کیا۔ اسلام نے عورت کو معاشرے میں اعلیٰ مقام عطا کیا اور لا تعدد شادیوں اور حرم سرائی کو ختم کردیا۔

اسلام صرف نومسلم ایرانیوں کے لیے ہی خیر و برکت کا ذریعہ نہیں بنا بلکہ اس نے آئین زرتشتی پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے اور بلاواسطہ ان میں گہری اصلاحات کا ذریعہ ثابت ہوا۔

(۱۴) اسلام نے ایران اور اہل ایران کی صرف پہلی صدی ہجری میں ہی خدمت نہیں کی تھی بلکہ آج تک ایران کو جب بھی کوئی خطرہ درپیش ہوا تو اسلام نے اس کا دفاع کیا۔

اسلام نے (وحشی) منگولوں کو اپنے اندر جذب کیا اور نسل چنگیز سے خدا بندہ اور نسل تیمور سے بایسنقر

اور امیر حسین بالقرا جیسے افراد پیدا کئے اور آج بھی اسلام بیرونی مخرب اخلاق فلسفے کے سامنے سپر بنا ہوا ہے اور لوگوں کے لیے شرف وعزت واستقلال کا ذریعہ ہے۔

(۱۵) حضرت عثمانؓ کی بنیادی کمزوری اُن کا قبیلہ اور اُن کے رشتے دار تھے۔ اُن کے قبیلہ کے لوگ زمانۂ جاہلیت میں طبقۂ اشرافیہ کی عادات کے خوگر تھے۔

(۱۶) حضرت عثمانؓ کے قتل کا سبب بننے والے اقدامات کچھ یوں تھے:

(۱) اموی حکومت کی تاسیس

(۲) اپنے رشتے داروں کو جاگیروں سے نوازنا اور بیت المال کی دولت ان میں تقسیم کرنا۔

(۳) مخصوص اقلیت کو کلیدی عہدوں پر فائز کرنا اور اہل افراد کو عہدوں سے معزول کرنا۔

(۴) حضرت ابوذرؓ جیسے بزرگ صحابی سے ناروا سلوک کرنا اور بزرگ صحابہ کی توہین کرنا۔

(۵) طرید رسولؐ مروان بن حکم کو مدینہ بلانا اور اسے اپنا چیف سکریٹری مقرر کرنا۔

(۱۷) حضرت علیؑ حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش کرنے والوں میں سے نہیں تھے اور آپ کا تعلق خلیفہ کے طرفداروں سے بھی نہیں تھا۔ آپ کی حیثیت ایک مصالحت کار کی سی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی سیاسی بے ضابطگیوں پر آہستہ آہستہ انگلیاں اٹھنا شروع ہوئیں لیکن جب زبانی اور تحریری شکایات بے نتیجہ رہیں تو لوگ دور دراز بالخصوص کوفہ ومصر سے شکایتیں لے کر مدینہ آئے اور اہل مدینہ کے تعاون سے خلیفہ ثالث کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ مروان کے جھانسے میں آکر خلیفہ نے لوگوں کی شکایات کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور آخری لمحات تک ان کے مقابلے میں ڈٹے رہے یہاں تک کہ انقلابیوں نے انھیں قتل کر دیا۔

(۱۸) حضرت عثمانؓ کے خلیفہ بنتے ہی بنی امیہ حکومتی عہدوں پر چھا گئے۔ حکومت کے مرکزی اور کلیدی عہدے بنی امیہ کو عطا کئے گئے، حد یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے طرید رسولؐ مروان بن حکم کو خصوصی وزارت عطا کی تھی اور یہی چیز ان کے قتل کا باعث بنی۔

(۱۹) بنی امیہ کا آپس میں تعلق صرف رشتے داری پر ہی مبنی نہیں تھا اس سے بڑھ کر آج کی اصطلاح کے مطابق ان میں سیاسی قرابت داری بھی پائی جاتی تھی اور ہر وقت وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے بے چین رہتے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے معاویہ پر بڑی نوازشات کی تھیں لیکن جب معاویہ نے یہ محسوس کیا کہ اس کے مقاصد کے حصول کے لیے زندہ عثمانؓ کی بجائے مردہ عثمانؓ زیادہ فائدہ مند ہے تو اس نے ان کے قتل کے لیے زمین ہموار کی اور جب حضرت عثمانؓ محصور تھے تو معاویہ کے پاس بھرپور فوجی طاقت موجود تھی اگر وہ چاہتا تو خلیفہ کو قتل ہونے سے بچا سکتا تھا لیکن اس نے اپنے محسن کو مشکلات کی گھڑی میں حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ حضرت علیؑ کی تیز نگاہوں نے معاویہ کے خفیہ ہاتھ کا ادراک کیا تھا اور پس پشت عوامل کی نشاندہی کی تھی۔ اس لیے آپ معاویہ کو قتل عثمانؓ کا ذمے دار قرار دیتے تھے۔

چوتھا باب

تاریخ زندگی حضرت علیؑ

حضرت علیؑ خلفاء کے دور میں

بیعت ، خصوصیت اور حکومت علیؑ کی سیاسی روش

حکومت مرتضوی کو درپیش مشکلات

حضرت علیؑ خلفاء کے دور میں

(۱) خلفاء پر تنقید

خلفاء پر آپ کی تنقید[۱] ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور آپ کی تنقید سبق آموز ہے۔ آپ خلفاء پر ذاتی مخالفت اور تعصب کی وجہ سے تنقید نہیں کرتے تھے۔ آپ کی تنقید تجزیاتی اور منطقی ہے... (اور اصول یہ ہے کہ) منطقی تنقید ہمیشہ روحانی اور اخلاقی خصوصیات پر اور اُن افراد کی خاص تاریخی زندگی پر مبنی ہوتی ہے جن پر تنقید کی جاتی ہے...

نہج البلاغہ میں خلفاء پر کی گئی کچھ تنقیدیں کلی وضمنی ہیں اور کچھ جزئی اور مخصوص ہیں۔ کلی تنقیدیں تو وہ ہیں جن میں آپ نے کھل کر اظہار کیا ہے کہ میرا قطعی اور تسلیم شدہ حق مجھ سے چھینا گیا ہے...

حضرت ابوبکرؓ پر آپ نے خطبہ شقشقیہ میں جو تنقید کی ہے اُس کا خلاصہ دو جملوں میں کیا جاسکتا ہے:

(۱) انھیں بخوبی علم تھا کہ میں اُن سے کہیں زیادہ منصب خلافت کا حق دار ہوں اور خلافت کا جامہ صرف میرے ہی جسم پر پورا آتا ہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سے جانتے تھے پھر بھی انھوں نے اس طرح کا اقدام کیا اور خلافت کے عرصے میں میری حالت اُس شخص جیسی تھی جس کی آنکھ میں کانٹا چبھا ہوا ہو یا جس کے گلے میں ہڈی پھنسی ہوئی ہو...

۱۔ خلفائے ثلاثہ کے عہد میں آپ کی بعض مصروفیات کچھ یوں تھیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا۔

(۲) قرآن مجید کی تفسیر اور بہت سی مشکل آیات کی تفسیری وضاحت نیز ابن عباسؓ جیسے شاگردوں کی تربیت کرنا۔

(۳) اقوام عالم کے علماء بالخصوص علمائے یہود ونصاریٰ کے سوالات کے جوابات دینا۔

(۴) نت نئے مسائل کا شرعی حکم بیان کرنا اور ایسے پیچیدہ جھگڑوں کا فیصلہ کرنا جو دوسرے قاضیوں سے حل نہ ہوتے تھے۔

(۵) پاک ضمیر اور روحانی طور پر آمادہ افراد کی سیر وسلوک کے لیے تربیت کرنا۔

(۶) بچھڑے ہوئے، محروم اور غریب لوگوں کی خبر گیری کرنا۔

(۷) ایسی سیاسی مشکلات کا دور کرنا جو دوسروں سے حل نہ ہوتی تھیں۔ (مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۷۱، ۷۷)

خدا کی قسم! فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر اُس کی کیلی کا ہوتا ہے۔[۱]

(۲) آپ نے خلیفہ اول پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انھوں نے زندگی میں تو لوگوں سے ایک بار یہ کہا تھا کہ تم اپنی بیعت واپس لے لو اور مجھے سبکدوش کر دو۔ انھیں تو اپنی صلاحیتوں پر شک تھا اور وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ مجھے سبکدوش کر دو پھر انھوں نے اپنا جانشین کیوں نامزد کیا؟

تعجب ہے کہ وہ زندگی میں تو خلافت سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے لیکن اپنے مرنے کے بعد اس کی بنیاد دوسرے کے لیے استوار کر گئے۔[۲]

مذکورہ بالا جملے کے بعد آپ نے دونوں خلفاء کے باہمی گٹھ جوڑ کو یوں واضح فرمایا: لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَيْهَا بے شک ان دونوں نے سختی کے ساتھ خلافت کے تھنوں کو آپس میں بانٹ لیا۔[۳]

نہج البلاغہ میں شیخین پر اس مشترکہ تنقید کے علاوہ آپ نے حضرت عمرؓ کی حسب ذیل دو اخلاقی خصوصیات پر الگ سے تنقید کی ہے:

(۱) مزاج کے لحاظ سے خلیفہ اول اور خلیفہ ثانی ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ خلیفہ ثانی تند خو، پُر ہیبت اور سخت مزاج آدمی تھے ... عجیب بات یہ ہے کہ وہ عورتوں پر زیادہ سختی کرتے تھے اور وہ اُن سے زیادہ ڈرتی تھیں۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوئی تو اُن کے خاندان کی عورتیں گھر میں بین کر رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے انھیں منع کیا مگر عورتیں بدستور بین کرتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بہن ''اُم فروہ'' کو عورتوں کے درمیان سے پکڑ کر باہر نکالا اور کوڑے لگائے۔ جب عورتوں نے یہ ماجرا دیکھا تو اِدھر اُدھر ہو گئیں ...

(۲) آپ حضرت عمرؓ کی جلد بازی پر بھی تنقید کرتے تھے کیونکہ وہ رائے قائم کرنے میں جلد بازی سے کام لیتے تھے اور پھر بہت جلد اپنی رائے بدل دیتے تھے ...

اس سلسلے کی کئی داستانیں موجود ہیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے عورتوں کے زیادہ حق مہر کو ختم کرنا چاہا اور کہا کہ جس عورت کا حق مہر پانچ سو درہم سے زیادہ ہوگا اس کے پانچ سو درہم رہنے دیے جائیں اور باقی رقم ضبط کر کے بیت المال میں جمع کر دی جائے۔ یہ سن کر ایک عورت نے اُن سے کہا کہ اللہ نے تو ہمیں اپنی مرضی کے مطابق مہر لینے کا حق عطا کیا ہے اور آپ ہمیں قرآن کے عطا کردہ حق سے محروم کر رہے ہیں۔ پھر اُس نے وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ... (سورۂ نساء: آیت ۲۰) کی آیت پڑھی۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۳

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کا فیصلہ قرآن مجید کی آیت کے سراسر خلاف ہے تو انھوں نے کہا: كُلُّكُمْ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتَّى رَبَّاتُ الْحِجَالِ تم میں سے ہر شخص عمر سے زیادہ دین جانتا ہے حتیٰ کہ حجلہ نشین عورتیں بھی
اسی طرح انھوں نے ستر بار یہ جملہ کہا تھا: لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔
حضرت علیؑ نے اُن کی تند مزاجی پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے: فَصَيَّرَهَا فِي حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ يَغْلُظُ كَلْمُهَا وَيَخْشُنُ مَسُّهَا خلیفہ اول نے خلافت کو ''ایک سخت و درشت محل میں'' رکھ دیا جس کے چرکے کاری تھے اور جس کو چھو کر بھی درشتی محسوس ہوتی تھی...

فَصَاحِبُهَا كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ إِنْ أَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَإِنْ أَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ جس کا اس سے سابقہ پڑے وہ ایسا ہے جیسے سرکش اونٹنی کا سوار کہ اگر مہار کھینچتا ہے (تو اُس کی منہ زوری سے) اس کی ناک کا درمیانی حصہ ہی شگافتہ ہوا جاتا ہے (جس کے بعد مہار دینا ہی ناممکن ہو جائے گا) اور اگر باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ مہلکوں میں پڑ جائے گا۔

آپ نے اُن کی جلد بازی، کثرت اشتباہ اور عذر خواہی پر اور بار بار عذر خواہی پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا: وَيَكْثُرُ الْعِثَارُ فِيهَا وَالْاِعْتِذَارُ مِنْهَا وہ بات بات میں ٹھوکر کھاتا اور پھر عذر خواہی کرتا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے نہج البلاغہ میں آپ نے خلیفہ اول اور ثانی پر صرف خطبہ شقشقیہ میں ہی تنقید کی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ علاوہ ازیں اگر کہیں آپ نے تنقید کی ہے تو وہ یا کلی تنقید ہے یا اس میں کنائے کا پہلو نمایاں ہے مثلاً آپ نے عثمان بن حنیف کے نام خط[1] میں مسئلہ ''فدک'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نہج البلاغہ میں ایک مکتوب ہے جس کے الفاظ ہیں:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی تو اُن کے بعد مسلمانوں نے خلافت کے بارے میں کھینچا تانی شروع کردی۔ اس موقع پر بخدا مجھے یہ کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا اور نہ میرے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ پیغمبرؐ کے بعد عرب، خلافت کا رُخ ان کے اہل بیت سے موڑ دیں گے اور نہ یہ کہ اُن کے بعد اسے مجھ سے ہٹا دیں گے مگر ایک دم میرے سامنے یہ منظر آیا کہ لوگ فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔[2]

اور اسی قسم کا اشارہ آپ نے معاویہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں کیا ہے۔[3]

ان دو خلفاء کی نسبت آپ نے نہج البلاغہ میں حضرت عثمانؓ کا زیادہ ذکر کیا ہے کیونکہ

(۱) وہ ایسے حالات میں قتل ہوئے تھے جنھیں تاریخ الفتنۃ الکبریٰ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

(۲) خلافت کے دعوے دار آپ پر خون عثمانؓ کا الزام عائد کر رہے تھے۔

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۴۵

۲۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۶۲

۳۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۲۸

(۳) جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی حکومت کے خلاف شورش بپا کی تھی وہ لوگ اُس وقت بڑے اثر رسوخ رکھنے والے سمجھے جاتے تھے، حضرت علیؑ کے دوستوں میں شمار کئے جاتے تھے اور حضرت کے مخالفین آپ سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ان افراد کو ان کے حوالے کیا جائے۔

(۴) جب انقلابیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اس وقت آپ نے فریقین میں رابطہ کار اور مصالحت کار کا کردار ادا کیا تھا۔

(۵) حضرت عثمانؓ کے دور میں فساد پھیل چکا تھا اور حضرت علیؑ اپنی شرعی ذمے داری کی بنا پر ان خرابیوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے اور آپ کو ان حالات پر تنقید کرنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔

مذکورہ بالا اسباب کی وجہ سے آپ کو اپنے پیشرو کا زیادہ ذکر کرنا پڑا۔

نہج البلاغہ میں سولہ جگہ آپ نے حضرت عثمانؓ کا تذکرہ کیا ہے جس میں سے زیادہ تر کا تعلق اُن کے قتل سے ہے اور پانچ جگہ آپ نے خون عثمانؓ سے اپنی لاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے۔ ایک جگہ آپ نے طلحہ کے متعلق فرمایا ہے کہ آج یہ شخص خون عثمانؓ کے انتقام کا نعرہ لگا رہا ہے حالانکہ یہ خود شورشیوں میں شامل تھا اور دو جگہ آپ نے معاویہ سے خطاب فرمایا ہے کہ تم قتل عثمانؓ کا بہانہ بنا کر میری انسانی اور الٰہی حکومت کے خلاف سازشیں کر رہے ہو۔ تم قتل عثمانؓ پر ٹسوے بہا رہے ہو اور خون عثمانؓ کے انتقام کا نعرہ لگا کر لوگوں کو جمع کر رہے ہو مگر اس میں تمہارے ذاتی مفادات پوشیدہ ہیں جبکہ تم نے عثمانؓ کی مدد کرنے میں سخت کوتاہی کی ہے۔[1]

بہرحال نہج البلاغہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت عثمانؓ کے طرز حکومت پر سخت تنقید کی تھی اور انقلابیوں کی شکایات کو جائز جانا تھا لیکن اس کے ساتھ آپ حضرت عثمانؓ کے قتل کو اسلامی معاشرے کی مصلحتوں کے خلاف سمجھتے تھے ... آپ چاہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ صحیح روش پر چلیں، اسلامی عدل کے اصولوں کی مکمل پاسداری کریں اور اگر وہ اپنی موجودہ روش سے باز نہ آئیں تو پھر انقلابیوں کو چاہیے کہ وہ انہیں حکومت سے معزول کر دیں اور اگر قید کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کریں اور اُن کی جگہ کسی موزوں شخص کا انتخاب کریں۔[2]

حضرت عثمانؓ پر تنقید کے موارد

جب حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو جلاوطن بھیجا تو آپ حضرت ابوذرؓ کو وداع کرنے اُن کے ساتھ چلے اور آپ نے حضرت ابوذرؓ سے جو گفتگو کی اُس میں حضرت عثمانؓ پر سخت تنقید کی اور حضرت ابوذرؓ کے موقف کو درست قرار دیا۔

۱۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۱۵۶ ۔ ۱۶۶

۲۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۱۷۰ ۔ ۱۷۱

نہج البلاغہ کے خطبہ ۳۰ میں آپ نے حضرت عثمانؓ کی حکومت کی روش کو جامع انداز میں یوں بیان فرمایا ہے: اِسْتَاْثَرَ فَاَسَاءَ الْاَثَرَةَ یعنی انھوں نے (اپنے عزیزوں کی) طرفداری کی تو بری طرفداری کی۔

آپ نے اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے اپنے رشتے داروں کو پوری امت پر ترجیح دی تھی اور انھوں نے اقربا پروری کی نہایت قبیح روش اختیار کی تھی۔

حضرت عثمانؓ کمزور ارادے کے آدمی تھے ... مروان بن حکم جسے رسول خدا ﷺ نے مدینہ سے جلاوطن کیا تھا ... اسے انھوں نے اپنا چیف سکریٹری بنا لیا تھا اور وہ اُن کے نام سے جو چاہتا، کر گزرتا تھا۔

حضرت علیؑ نے اُن کی اس روش پر تنقید کی تھی اور آپ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا: تم مروان کی سواری نہ بنو کہ وہ تمھیں جہاں چاہے کھینچتا پھرے جبکہ تم سن رسیدہ ہو چکے ہو اور تمہاری عمر بھی بیت چکی ہے۔[1]

حضرت عثمانؓ، حضرت علیؑ سے بدگمان رہتے تھے اور وہ مدینہ میں آپ کے قیام کو اپنے لیے مخل و مضر تصور کرتے تھے[2] چنانچہ انھوں نے حضرت علیؑ سے کہا کہ آپ مدینہ چھوڑ کر "ینبع" چلے جائیں تاکہ لوگ آپ کو نہ دیکھیں اور بھول جائیں۔ آپ نے اُن کی درخواست قبول کر لی مگر انھوں نے خود دو مرتبہ آپ کو واپس مدینہ بلایا... آپ اُن کے پاس گئے اور اُن کے سامنے لوگوں کے مطالبات پیش کئے اور پُرخلوص مشورے دیے۔ اگر حضرت عثمانؓ اُن مشوروں پر عمل کرتے تو شاید قتل ہونے سے بچ جاتے۔

حضرت عثمانؓ نے آپ کی تجاویز قبول کر لیں مگر اُن کے بدعنوان رشتے داروں نے اُن کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کیا۔ اُن کے پورے خاندان میں اُن کی بیوی نائلہ وہ واحد خاتون تھیں جو اپنے شوہر سے کہتی تھیں کہ تم علی بن ابی طالبؑ کے علاوہ کسی کی بات نہ مانو مگر مروان اور اُن کے دیگر رشتے داروں نے اُن کو حضرت علیؑ کے مشوروں پر عمل کرنے نہ دیا۔

دوسری بار حضرت عثمانؓ نے ... ابن عباس کے ذریعے سے آپ کو پیغام بھیجا کہ آپ مدینہ چھوڑ دیں۔ آپ نے ابن عباس سے فرمایا کہ یہ کیا طریقہ ہے کہ ایک دن مجھ سے کہا جاتا ہے کہ مدینہ چھوڑ دو اور دوسرے ہی دن کہا جاتا ہے کہ واپس چلے آؤ۔[3]

آپ نے خطبہ شقشقیہ میں حضرت عثمانؓ پر شدید تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

...اِلٰی اَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ نَافِجًا حِضْنَیْهِ بَیْنَ نَثِیْلِهٖ وَ مُعْتَلَفِهٖ وَ قَامَ مَعَهٗ بَنُوْ اَبِیْهِ یَخْضَمُوْنَ مَالَ اللهِ خِضْمَةَ الْاِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِیْعِ اِلٰی اَنِ انْتَكَثَ عَلَیْهِ فَتْلُهٗ وَ اَجْهَزَ عَلَیْهِ عَمَلُهٗ وَ كَبَتْ بِهٖ بِطْنَتُهٗ

یہاں تک کہ اس قوم کا تیسرا شخص پیٹ پھلائے سرگین اور چارے کے درمیان کھڑا ہوا اور اُس کے ساتھ اُس

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۴

۲۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۱۷۲۔۱۷۳

۳۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۲۷۔۱۲۸۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۱۷۳۔۱۷۴۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳۸

کے بھائی بند اٹھ کھڑے ہوئے جو اللہ کے مال کو اس طرح نگلتے تھے جس طرح اونٹ فصل ربیع کا چارہ چرتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب اُس کی بٹی ہوئی رسی کے بل کھل گئے اور اُس کی بداعمالیوں نے اُس کا کام تمام کر دیا اور شکم پری نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۳)[1]

(۲) حضرت علیؑ کی صبر آزما خاموشی

یہاں خاموشی سے ہماری مراد تلوار اٹھانے سے گریز کرنا ہے۔ اس سے مطلق خاموشی مراد نہیں ہے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ آپ نے ہر مناسب موقع پر اپنا دعویٰ اور مطالبہ پیش کیا اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا گلہ کیا تھا۔ آپ اس خاموشی کی تلخیوں کو یاد کرتے تھے اور اسے انتہائی جانکاہ اور کڑوے گھونٹ سے تعبیر کرتے تھے۔[2]

... وَ اَغْضَيْتُ عَلَى الْقَذٰى وَ شَرِبْتُ عَلَى الشَّجَا وَ صَبَرْتُ عَلٰى اَخْذِ الْكَظَمِ وَ عَلٰى اَمَرَّ مِنْ طَعْمِ الْعَلْقَمِ آنکھوں میں خس و خاشاک تھا مگر میں نے چشم پوشی کی، حلق میں پھندے تھے مگر میں نے غم و غصے کے گھونٹ پی لیے اور گلوگرفتگی کے باوجود حنظل سے زیادہ تلخ حالات پر صبر کیا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۶)

آپ نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر دو راستوں میں سے ایک راستہ چنا کیونکہ وہ راستہ مصلحت کے قریب تر تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: **وَ طَفِقْتُ اَرْتَئِيْ بَيْنَ اَنْ اَصُوْلَ بِيَدٍ جَذَّاءَ اَوْ اَصْبِرَ عَلٰى طَخْيَةٍ عَمْيَاءَ يَهْرَمُ فِيْهَا الْكَبِيْرُ وَ يَشِيْبُ فِيْهَا الصَّغِيْرُ وَ يَكْدَحُ فِيْهَا مُؤْمِنٌ حَتّٰى يَلْقٰى رَبَّهُ فَرَاَيْتُ اَنَّ الصَّبْرَ عَلٰى هَاتَا اَحْجٰى فَصَبَرْتُ وَ فِي الْعَيْنِ قَذًى وَ فِي الْحَلْقِ شَجًا** میں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں یا اس بھیانک تیرگی پر صبر کر لوں جس میں سن رسیدہ بالکل ضعیف اور بچہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور مومن اس میں جدوجہد کرتا ہوا اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ مجھے اس اندھیر پر صبر ہی قرین عقل نظر آیا۔ لہٰذا میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں (غبار اندوہ کی) خلش تھی اور حلق میں (رنج و غم کے) پھندے لگے ہوئے تھے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۳)

۱۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۱۷۳۔۱۷۵

۲۔ حسب ذیل وجوہات کی بنا پر آپ نے حکومت سے کنارہ کشی اختیار کی تھی اور حکومت کے لیے تلوار نہیں اٹھائی تھی:

(۱) اسلام اور مسلمانوں کی عزت و شوکت کی خاطر

(۲) فتنۂ ارتداد کے سدباب کی خاطر

(۳) آپ نے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی تھی مگر لوگوں نے آپ کی دعوت کا مثبت جواب نہیں دیا تھا۔

(۴) سرداران قبائل کے بعد اُن کے قبیلے والے بھی خلیفۂ اول کی بیعت کر چکے تھے۔

(۵) خلافت کو واپس لینے کے لیے آپ کے پاس مطلوبہ افرادی طاقت موجود نہیں تھی۔

اسلامی اتحاد

ہر شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ حضرت علیؑ نے اتنی روح فرسا تکلیفیں کیوں برداشت کیں اور آپ کی سوچ کیا تھی اور آپ کے صبر کرنے کی وجہ کیا تھی؟[۱]

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد برقرار رکھنے اور تفرقے کو روکنے کی خواہش تھی۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں کے سامنے جس طاقت کا مظاہرہ کیا تھا وہ اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاقِ کلمہ کی وجہ سے کیا تھا اور بعد میں کئی برسوں تک مسلمانوں نے جو حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی تھیں وہ بھی اتحاد و اتفاق کی برکت سے نصیب ہوئی تھیں۔

امیرالمومنینؑ نے اسلامی دنیا کے اتحاد و اتفاق کو بچانے کے لیے تلوار نہیں اٹھائی تھی اور اپنے ذاتی حقوق لٹنے پر بھی خاموشی اختیار کیے رکھی۔ آپ نے خود بھی وجہ بیان کی تھی ... جب آپ کے دورِ حکومت میں طلحہ اور زبیر نے آپ کی بیعت توڑی اور داخلی انتشار پیدا کیا تو آپ نے فرمایا: میں نے مسلمانوں کو تفرقہ سے بچانے کے لیے اپنے مسلمہ حق سے چشم پوشی کی تھی...

نہج البلاغہ میں تین جگہ ان وجوہات کو بیان کیا گیا ہے:

۱۔ جن باتوں کی وجہ سے آپ نے مخالفین سے جنگ نہیں کی تھی اُن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اگر آپ جنگ کرتے تو آپ کے گنے چنے مخلص ساتھی شہید ہو جاتے اور وہ صحابہ بھی بڑی تعداد میں شہید ہو جاتے جنھوں نے مسئلہ خلافت میں آپ سے اختلاف کیا تھا۔ نتیجتاً مسلمان کمزور اور مشرک و بت پرست لوگ مضبوط ہو جاتے۔

(۲) مسلمان افراد و قبائل کی اکثریت رسول خدا ﷺ کی زندگی کے آخری سالوں میں اسلام لائی تھی۔ ابھی تک اُن کی روح میں اسلام پوری طرح جاگزیں نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں اگر آپ جنگ کرتے تو داخلی انتشار دیکھ کر نو مسلم افراد اور قبائل مرتد ہو جاتے۔

(۳) رسول خدا ﷺ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے مسیلمہ کذاب نبوت کا دعویٰ کر چکا تھا اور اُس کی قوم اسے نبی تسلیم کر چکی تھی اور آپ کی وفات کے بعد طلیحہ نے اور سجاح نامی عورت نے بھی اپنی اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا اور ہزاروں افراد اُن کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اگر حضرت علیؑ اپنے سیاسی حریفوں سے جنگ کرتے تو مسلمان کمزور ہو جاتے اور نئے مدعیانِ نبوت بڑی آسانی سے مدینہ پر قبضہ کر لیتے اور مسلمانوں کا خاتمہ کر دیتے۔

(۴) روم کی عیسائی حکومت بھی مسلمانوں کی دشمن تھی۔ مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے اُس کے حوصلے بلند ہو جاتے اور وہ مسلمانوں کو تر نوالہ سمجھ کر ہضم کر جاتے۔ (مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۶۶، ۷۱)

☆ حضرت علیؑ اسلامی اتحاد کے نقیب تھے۔ اس موضوع پر علامہ شیخ محمد جواد شری لبنانی کی انگریزی کتاب The Brother of the Prophet Muhammad کا اردو ترجمہ "امیرالمومنینؑ اُسوۂ وحدت" کے نام سے جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان عنقریب شائع کرے گی۔ (رضوانی)

(۱) خلیفہ اول کی بیعت کے بعد جب ابوسفیان حضرت علیؑ کی حمایت کے بہانے آپ کے پاس آیا تاکہ فتنہ برپا کر سکے (اس نے کہا تھا کہ اگر آپ اجازت تو میں مدینہ کی گلیوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں) تو آپ نے فرمایا: اَیُّهَا النَّاسُ شُقُّوْا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ بِسُفُنِ النَّجَاةِ وَ عَرِّجُوْا عَنْ طَرِیْقِ الْمُنَافَرَةِ وَ ضَعُوْا تِیْجَانَ الْمُفَاخَرَةِ اے لوگو! فتنہ و فساد کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر اپنے کو نکال لے جاؤ۔ تفرقہ و انتشار کی راہوں سے اپنا رخ موڑ لو۔ فخر و مباہات کے تاج اتار ڈالو۔[1]

(۲) جب چھ رکنی شوریٰ کے اجلاس میں عبدالرحمان بن عوف نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ مقرر کیا تو آپ نے فرمایا: ... لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ اَحَقُّ النَّاسِ بِهَا مِنْ غَیْرِیْ وَ وَ اللّٰهِ لَاُسْلِمَنَّ مَا سَلِمَتْ اُمُوْرُ الْمُسْلِمِیْنَ وَ لَمْ یَکُنْ فِیْهَا جَوْرٌ اِلَّا عَلَیَّ خَاصَّةً تم جانتے ہو کہ مجھے اوروں سے زیادہ خلافت کا حق پہنچتا ہے۔ خدا کی قسم! جب تک مسلمانوں کے امور کا نظم و نسق برقرار رہے گا اور صرف میری ذات ہی ظلم و جور کا نشانہ بنتی رہے گی تب تک میں خاموشی اختیار کرتا رہوں گا۔[2]

(۳) جب آپ نے مالک اشترؒ کو مصر کا گورنر مقرر فرمایا تو اہل مصر کے نام اپنے خط میں لکھا: ... فَاَمْسَکْتُ یَدِیْ حَتّٰی رَاَیْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْاِسْلَامِ، یَدْعُوْنَ اِلٰی مَحْقِ دِیْنِ مُحَمَّدٍ فَخَشِیْتُ اِنْ لَمْ اَنْصُرِ الْاِسْلَامَ وَ اَهْلَهٗ اَنْ اَرٰی فِیْهِ ثَلْمًا اَوْ هَدْمًا، تَکُوْنُ الْمُصِیْبَةُ بِهٖ عَلَیَّ اَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلَایَتِکُمْ ان حالات میں میں نے اپنا ہاتھ روکے رکھا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ مرتد ہونے والے اسلام سے مرتد ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو مٹا ڈالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اب میں ڈرا کہ اگر کوئی رخنہ یا خرابی دیکھتے ہوئے میں اسلام اور اہل اسلام کی مدد نہ کروں گا تو یہ میرے لیے اس سے بڑھ کر مصیبت ہوگی جتنی یہ مصیبت کہ تمہاری یہ حکومت میرے ہاتھ سے چلی جائے۔[3]

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۷۲

۳۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۶۲۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۱۷۶، ۱۸۵

بیعت، خصوصیت اور حکومت علیؑ کی سیاسی روش

(١) بیعت

حضرت عثمانؓ کے عہد میں اسلامی خلافت کی کمزوری اور زمانۂ جاہلیت کے طبقاتی نظام[١] کو دوبارہ زندہ کرنے کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کی مشکلات میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجے میں وہ قتل ہوگئے۔ مدینہ کے لوگ جو سابق خلیفہ کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے[٢] وہ چھوٹے، بڑے، عورتیں اور مرد، عرب اور غیر عرب سب ایک جلوس کی صورت میں حضرت علیؑ کے دروازے پر آئے اور سب یک زبان ہوکر کہنے لگے کہ اسلامی خلافت کے لائق صرف علیؑ ہیں اور انھیں چاہیے کہ وہ خلافت قبول کریں۔[٣] ان لوگوں نے اتنا اصرار[٤] کیا کہ آپ اس ہجوم کے متعلق فرماتے ہیں: فَمَا رَاعَنِي إِلَّا وَالنَّاسُ كَعُرْفِ الضَّبُعِ إِلَيَّ يَنْثَالُوْنَ عَلَيَّ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ حَتَّى لَقَدْ وُطِئَ الْحَسَنَانِ وَشُقَّ عِطْفَايَ مُجْتَمِعِيْنَ حَوْلِي كَرَبِيضَةِ الْغَنَمِ اُس وقت مجھے لوگوں کے ہجوم نے دہشت زدہ کردیا جو میری جانب بجو کے ایال کی طرح ہر طرف سے لگاتار بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ عالم یہ ہوا کہ حسنؑ و حسینؑ کچلے جارہے تھے اور میری ردا کے دونوں کنارے پھٹ گئے تھے۔ وہ سب میرے گرد بکریوں کے گلے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔

آپ نے نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں یوں ارشاد فرمایا: وَبَسَطْتُمْ يَدِي فَكَفَفْتُهَا وَمَدَدْتُمُوْهَا فَقَبَضْتُهَا ثُمَّ تَدَاكَكْتُمْ عَلَيَّ تَدَاكَّ الْإِبِلِ الْهِيْمِ عَلَى حِيَاضِهَا يَوْمَ وِرْدِهَا حَتَّى انْقَطَعَتِ النَّعْلُ وَسَقَطَ الرِّدَاءُ وَوُطِئَ الضَّعِيْفُ وَبَلَغَ مِنْ سُرُوْرِ النَّاسِ بِبَيْعَتِهِمْ إِيَّايَ أَنِ ابْتَهَجَ بِهَا الصَّغِيْرُ وَهَدَجَ إِلَيْهَا الْكَبِيْرُ وَتَحَامَلَ نَحْوَهَا الْعَلِيْلُ وَحَسَرَتْ إِلَيْهَا الْكِعَابُ تم نے بیعت کے لیے میری طرف ہاتھ پھیلانا چاہا

١۔ مجموعہ آثار ج ٢، ص ١١١۔ جہان بینی توحیدی ص ٥٢۔ حماسۂ حسینی ج ٢، ص ٢٨٧۔٢٨٨۔ مجموعہ آثار ج ٣، ص ٩٠١۔٩٠٢۔ امامت و رہبری ص ١٣٩۔١٤٠

٢۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ١٢٩

٣۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ١٣٥

٤۔ نہج البلاغہ کے خطبات ٣، ٥٤، ٩٢، ٢٢٩ میں آپ نے لوگوں کے پرزور مطالبے کا تذکرہ کیا ہے۔

تو میں نے روک لیا اور تم نے اسے کھینچنا چاہا تو میں نے سمیٹ لیا مگر اس کے بعد تم اس طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے جس طرح پانی پینے کے دن پیاسے اونٹ تالابوں پر گر پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ میری جوتی کا تسمہ کٹ گیا اور عبا کاندھے سے گر گئی۔ کمزور و ناتواں کچلے گئے اور میری بیعت پر تمہاری خوشی کا یہ عالم تھا کہ بچوں نے خوشیاں منائیں۔ بوڑھے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بیعت کے لیے آگے بڑھے۔ بیمار بھی اٹھتے بیٹھتے پہنچ گئے اور میری بیعت کے لیے نوجوان لڑکیاں بھی پردوں سے نکل کر دوڑ پڑیں۔[۱]

(۲) خلافت قبول کرنے کا فلسفہ

حضرت عثمانؓ کے بعد آپ نے خلافت کا عہدہ قبول کیا اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ سماجی انصاف ختم ہو چکا ہے اور لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ایک طبقہ شکم سیر اور دوسرا طبقہ خالی پیٹ ہے اس لیے میں نے مجبوراً یہ عہدہ قبول کیا ہے۔

حضرت کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں: أَمَا وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ لَوْ لَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ وَ مَا أَخَذَ اللهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَلَّا يُقَارُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَ لَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا وَ لَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ أَوَّلِهَا وَ لَأَلْفَيْتُمْ دُنْيَاكُمْ هٰذِهِ أَزْهَدَ عِنْدِي مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ دیکھو! اس ذات کی قسم! جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں گے تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اول کو سیراب کیا تھا اور تم اپنی دنیا کو میری نظروں میں بکری کی رینٹ سے بھی زیادہ ناقابل اعتناء پاتے۔[۲]

آپ کی حکومت کا یہ منشور تھا[۳] ... اور آپ بھی جانتے تھے کہ اس طرح کے منشور کے راستے میں کیا

۱۔ حکمت و اندرز ہا ص ۱۲۹ ۔ ۱۳۰ ۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۹

آپ نے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر عہدۂ خلافت لینے سے انکار کیا تھا:

(۱) معاشرے میں اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا تھا کہ اصلاحات کی کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔

(۲) حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد عمومی فضا سازگار نہیں تھی۔

(۳) لوگوں کی عادات اتنی بگڑ چکی تھیں کہ وہ اسلامی اصلاحات قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔

(۴) حکومت چلانے کے لیے اہل افراد کی کمی تھی۔

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۳

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۲ ۔ ۲۳

کیا رکاوٹیں پیدا ہوں گی لہٰذا آپ نے انتہائی مخدوش حالات میں عثمان خلافت سنبھالی اور بیعت کے لیے آنے والوں سے فرمایا: دَعُونِي وَالْتَمِسُوا غَيْرِي فَإِنَّا مُسْتَقْبِلُونَ أَمْرًا لَهُ وُجُوهٌ وَ أَلْوَانٌ لَا تَقُومُ لَهُ الْقُلُوبُ وَلَا تَثْبُتُ عَلَيْهِ الْعُقُولُ وَإِنَّ الْآفَاقَ قَدْ أَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ. وَاعْلَمُوا أَنِّي إِنْ أَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا أَعْلَمُ وَلَمْ أُصْغِ إِلَى قَوْلِ الْقَائِلِ وَ عَتْبِ الْعَاتِبِ وَإِنْ تَرَكْتُمُونِي فَأَنَا كَأَحَدِكُمْ وَلَعَلِّي أَسْمَعُكُمْ وَأَطْوَعُكُمْ لِمَنْ وَلَّيْتُمُوهُ أَمْرَكُمْ وَ أَنَا لَكُمْ وَزِيرًا خَيْرٌ لَكُمْ مِنِّي أَمِيرًا مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لیے) میرے علاوہ کوئی اور ڈھونڈھ لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں جسے نہ دل برداشت کرسکتے ہیں اور نہ عقلیں اسے مان سکتی ہیں۔ دیکھو! اُفق عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ راستہ پہچاننے میں نہیں آتا۔ یاد رکھو کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں تو تمھیں اُس راستے پر لے چلوں گا جو تمہارے علم میں ہے اور اس کے متعلق کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والے کی سرزنش پر کان نہیں دھروں گا اور اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو تمھارے ہی ایک فرد کی طرح زندگی گزاروں گا اور ہوسکتا ہے کہ جسے تم اپنا امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں اور میرا (تمہارے دنیوی مفاد کے لیے) امیر ہونے سے وزیر ہونا بہتر ہے۔[1]

(۳) مرتضوی حکومت کی سیاسی روش

(۱) نصیحت اور سماجی ناہمواریوں کے خلاف جہاد

جب آپ سریرآرائے خلافت ہوئے اُس وقت اسلامی مملکت ایک بڑے بحران سے دوچار تھی۔ برسوں سے جس فتنہ و آشوب کی تخم ریزی کی جا رہی تھی اُس کا ثمر ناخوش گوار حوادث کی صورت میں نمودار ہو چکا تھا۔ آپ نامساعد حالات کو دیکھ رہے تھے، اس کے باوجود آپ نے اس ذمے داری کو قبول کیا۔[2]

آپ نے خلافت قبول کرنے کے بعد دو نکاتی دستورالعمل بنایا:

(۱) نصیحت اور لوگوں کی روحانی و اخلاقی اصلاح جس کا نمونہ نہج البلاغہ کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) سماجی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف جہاد۔[3]

حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جو اراضی الاٹ کی تھیں وہ عام مسلمانوں کی ملکیت تھی۔ ایسی جاگیروں

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۹۲۔ بیست گفتار ص ۱۹۔۲۰۔ جہاں بینی توحیدی ص ۵۲۔ ۵۳۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۲۲۔ ۲۴

۲۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ بیست گفتار ص ۲۳، ۲۸

۳۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۱۱۲۔ جہاں بینی توحیدی، ص ۵۳۔ داستان راستان ج ۱۔ ۲، شمارہ ۱۱۰، ص ۳۲۸۔ ۳۳۳۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۱۲۷۔ ۱۲۸

کے متعلق آپ نے فرمایا: وَاللهِ لَوْ وَجَدْتُهُ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَاءُ وَ مُلِكَ بِهِ الْإِمَاءُ لَرَدَدْتُهُ خدا کی قسم! اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آیا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہو تو میں اسے بھی واپس پلٹا دوں گا۔[1]

بیعت کے اگلے دن آپ کا عام خطاب

اے لوگو! رسول اللہ ﷺ کے گزر جانے کے بعد لوگوں نے ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا اور ابوبکرؓ نے عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا اور عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے شوریٰ تشکیل دی جس نے عثمانؓ کو خلیفہ چنا اور عثمانؓ نے کچھ ایسے کام کیے جن پر تم نے اعتراض کیا اور آخرکار اُن کے گھر کا محاصرہ ہوا اور وہ قتل ہو گئے۔ پھر تم میرے پاس آئے اور پورے شوق و رغبت سے میری بیعت کی۔

میری روش یہ ہے کہ میں تمھیں رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت کی طرف پلٹاؤں اور میں جو وعدہ کروں گا اسے پورا کروں گا البتہ اس کے لیے یہ شرط ہے کہ تم بھی استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو گے... جان لو کہ میں رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی ویسا ہی ہوں جیسا کہ اُن کی زندگی میں تھا... میں طبعی طور پر خلافت کی رغبت نہیں رکھتا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے: "میرے بعد جو بھی امت کے معاملات کی باگ ڈور سنبھالے گا قیامت کے دن اُسے پل صراط پر روکا جائے گا اور فرشتے اُس کے دفتر عمل کو اس کے سامنے کھولیں گے۔ اگر وہ عادل ہوگا تو خدا اُس کے عدل کی وجہ سے اُسے نجات دے گا اور اگر وہ ظالم ہوگا تو اُسے پل صراط پر اتنا عذاب دیا جائے گا کہ اُس کا بند بند جدا ہو جائے گا اور وہ دوزخ میں جا گرے گا۔"

اب جبکہ تم نے اتفاق رائے سے مجھے خلیفہ چن لیا ہے، میرے لیے اس ذمے داری کو قبول کرنے سے انکار کرنا مناسب نہیں ہے۔

پھر آپ نے منبر کے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی، لوگوں کو دیکھا اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو! میں اب یہ اعلان کر چکا ہوں کہ جن لوگوں نے دوسرے لوگوں کا حق مار کر بیت المال کی رقم ہڑپ کی ہے اور نہریں جاری کروائی ہیں اور قیمتی گھوڑوں پر سواری کر رہے ہیں اور خوبصورت و نازک اندام کنیزیں خرید کر دنیا کی لذتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں میں کل اُن سے سب چھین لوں گا اور انھوں نے ناجائز ذرائع سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب مال اُن سے واپس لے لوں گا۔ اُن کے پاس صرف ان کا حق رہنے دوں گا۔ حق سے زیادہ اُن کے پاس کچھ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ایسے لوگوں سے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے پاس نہ آئیں اور یہ نہ کہیں کہ علی بن ابی طالبؑ نے ہمیں دھوکے میں رکھا تھا۔

آج میں پوری وضاحت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ میں تمام اختیارات کو معطل کر دوں گا یہاں تک

۱۔ بیست گفتار ص ۲۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵

کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور اسلامی خدمات کو بھی نظر انداز کردوں گا — جسے رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف ملا ہے اور جسے اسلام کی خدمت کی توفیق نصیب ہوئی ہے اُس کا اجر اُسے خدا عطا کرے گا۔ یہ توفیقات کسی طرح بھی معاشی اونچ نیچ کا سبب نہیں بن سکتیں ... تم سب خدا کے بندے ہو اور مال خدا کا مال ہے لہٰذا اس مال کو تمہارے درمیان برابر تقسیم ہونا چاہیے۔ مال کی تقسیم میں کوئی کسی پر برتری نہیں رکھتا۔[۱]

(۲) سچائی پر مبنی صاف ستھری سیاست

امیرالمومنینؑ اپنی سیاست میں صاف گوئی کے قائل تھے۔ آپ جو کام کرنا چاہتے، اسے کبھی لوگوں سے نہیں چھپاتے تھے ... چنانچہ آپ کے اس واضح منشور کے اعلان کے بعد پہلے دن سے ہی آپ کی حکومت کی مخالفت شروع ہوگئی۔ پہلی باقاعدہ مخالفت جنگ جمل کی صورت میں سامنے آئی۔ حیاتِ رسولؐ میں طلحہ اور زبیر کی اسلام کے لیے بڑی خدمات تھیں مگر حضرت عثمانؓ کے عہد میں انھیں بھاری رشوتیں ملی تھیں جس کی وجہ سے وہ بہت امیر ہوگئے تھے۔ اب جب حضرت علیؑ نے ناجائز دولت ضبط کرنے کا اعلان کیا تو انھیں یقین ہوگیا کہ علیؑ اُن کی ناجائز دولت واپس لے لیں گے ...[۲]

جنگ جمل کے بعد جنگ صفین ہوئی۔ معاویہ، حضرت عثمانؓ کا قریبی رشتے دار تھا اور وہ بیس سال سے شام کا خود مختار حکمران چلا آرہا تھا۔ اس عرصے میں اُس نے اپنی حکومت کی بنیادوں کو خوب مستحکم کرلیا تھا۔ جب لوگوں نے حضرت علیؑ کی بیعت کی تو آپ نے تکمیل بیعت کے بعد فرمایا: میں اس بات کے لیے تیار نہیں ہوں کہ معاویہ کو اُس کے عہدے پر برقرار رکھوں ... آپ کے اس واضح اعلان کی وجہ سے معاویہ کے ساتھ جنگ صفین ہوئی۔ جنگ صفین کے بعد خوارج کے ساتھ جنگ نہروان ہوئی جس کے واقعات کو سب جانتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی خلافت کے ساڑھے چار سال میں آپ کو کئی جنگیں لڑنی پڑیں اور آپ کو ایک دن بھی سکون کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ آپ عدل و انصاف میں درگزر کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

(۳) آپ عدل و انصاف میں درگزر کو جائز نہیں سمجھتے تھے

آپ نے قیام عدل کے لیے حکومت قبول کی تھی اور عدل و انصاف پر سمجھوتہ نہ کرنے کا نتیجہ محراب عبادت میں آپ کی شہادت کی شکل میں نمودار ہوا۔[۳] اور سچ کہا گیا ہے کہ **وَقُتِلَ فِي مِحْرَابِهِ لِشِدَّةِ عَدْلِهِ** آپ شدت عدل کی وجہ سے محراب عبادت میں قتل کیے گئے۔

۱۔ مجموعہ آثار ج ۱۸، ص ۳۴۲ ـ ۳۴۶۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۲، خطبہ ۹۰، ص ۲۷۱ ـ ۲۷۳

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۲، خطبہ ۹۰، ص ۲۷۱ ـ ۲۷۳

۳۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ۱۳۶ ـ ۱۳۹

عدل و انصاف اور قانونِ شریعت کے اجرا میں سخت گیری کی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔ اِن لوگوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین برپا کیں اور آخر میں جہالت وفکری جمود کا ہاتھ خوارج کی صورت میں آستین سے باہر آیا۔[۱]

آپ کی خلافت کے عرصے کو آپ کی زندگی کے تلخ ترین ایام میں شمار کیا جاتا ہے مگر آپ مکتب اور نظریے کے لحاظ سے کامیاب رہے۔ آپ نے اسلامی معاشرے میں عدل و انصاف کو فروغ دیا۔

آپ کی روش سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب تک معاشرے میں اقتصادی اصلاحات نہ کی جائیں اور جب تک سماجی انصاف قائم نہ کیا جائے اُس وقت تک حکومتوں اور چہروں کی تبدیلی اور نااہل لوگوں کی جگہ اہل افراد کو عہدے دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح کی تبدیلی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔[۲]

(۴) عام لوگوں کے حقوق کا خیال

(آپ اپنی حکومت میں عوام کے حالات جاننے کے لیے تنہا شہر کا دورہ کیا کرتے تھے اور لوگوں کی مشکلات معلوم کر کے انھیں حل کرتے تھے)۔[۳]

ایک دن حسب عادت آپ شہر کوفہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ آپ کو دو لوگوں کے لڑنے کی آوازیں سنائی دیں ... معلوم ہوا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور کسی بات پر الجھ پڑے ہیں۔ آپ نے دونوں کو سامنے کھڑا کیا اور جس نے اپنے دوست کو مارا تھا آپ اُس سے قصاص لینا چاہتے تھے کہ ... مضروب نے کہا کہ میں اسے معاف کرتا ہوں۔

آپ نے فرمایا: اچھا! ... تم نے اپنا حق معاف کیا ہے۔ تمہارے سوا ریاست کا بھی ایک حق ہے۔ تم ریاست کے حق کو معاف کرنے کا اختیار نہیں رکھتے کیونکہ وہ حق تم سے مربوط نہیں ہے۔ عمومی حق کو معاف نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسلام عمومی حقوق سے درگزر نہیں کرتا البتہ ذاتی اور مخصوص حقوق میں اسلام رعایت دیتا ہے۔[۴]

۱۔ بیست گفتار ص ۵۹

۲۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ۱۳۸ ۔ ۱۳۹

۳۔ آپ کی عادت تھی کہ آپ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھی دار الامارہ سے باہر آجاتے تھے تاکہ کسی کو بھی آپ سے رابطہ کرنے میں دشواری نہ ہو۔ (بیست گفتار ص ۲۹ ۔ ۳۰ معمولی تلخیص کے ساتھ)

۴۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۶۲ ۔ ۶۳

☆ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت اور دینی جماعتوں کو اپنے خلیفہ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو لوگ عوام کو ناحق مار پیٹ رہے ہیں اور اُن کا خون بہا رہے ہیں وہ خون ناحق حکمرانوں کی گردن پر ہے اور حکومت کسی بھی صورت میں عمومی حق کو معاف نہیں کرسکتی اور مجرموں کو سزا دینے سے پہلوتہی نہیں کرسکتی جو کہ کررہی ہے۔ (رضوانی)

(۵) ایفائے عہد

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وعدہ وفا کرنا حق و صداقت کا تقاضا ہے۔ ایفائے عہد سے بہتر ڈھال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ جو آدمی قیامت کے دن خدا کے سامنے پیش ہونے پر یقین رکھتا ہو اُسے لوگوں کے ساتھ دھوکا نہیں کرنا چاہیے۔[۱] ایفائے عہد کو آپ ایک عمومی اور انسانی مسئلہ سمجھتے تھے۔ آپ نے مالک اشترؒ کے نام اپنے مشہور[۲] خط میں لکھا تھا: ''خبردار! لوگوں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فائدہ دیکھ کر تم وعدہ توڑ دو۔'' پھر آپ نے عہد و پیمان کے عمومی اور انسانی پہلو کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''اگر انسانوں کے درمیان عہد و پیمان کا احترام ختم ہوجائے تو پھر پتھر پر پتھر رکھنا ہی ناممکن ہوجائے گا (یعنی کوئی آدمی مکان تک نہیں بنا سکے گا)۔''[۳]

(۶) بیت المال کی منصفانہ اور مساویانہ تقسیم

کچھ ''سیاست دان'' ساتھیوں نے خیر خواہی میں امیرالمومنینؑ کو دو مشورے دیئے تھے لیکن آپ اخلاقی لحاظ سے اُن کے مشوروں کو تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔ پہلے مشورے کا تعلق بیت المال کی تقسیم سے تھا جبکہ آپ دولت کی تقسیم کے متعلق کسی امتیاز کے قائل نہیں تھے۔ آپ عرب و عجم، آقا و غلام اور قریشی و غیر قریشی کی تفریق نہیں کرتے تھے۔ آپ بیت المال میں سب کو برابر کا حصہ دار سمجھتے تھے۔

دوسرا مشورہ آپ کو یہ دیا گیا تھا کہ آپ صاف گوئی کو سیاست سے الگ رکھیں لیکن آپ فریب اور نیرنگی کے ہرگز قائل نہیں تھے اور صاف گوئی اور صداقت و امانت سے ذرہ برابر بھی انحراف کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

بیت المال کی منصفانہ اور مساویانہ تقسیم کے متعلق آپ کی کئی داستانیں مشہور ہیں۔
(ان میں سے ایک داستان اُن کے بھائی جناب عقیل کی بھی ہے)۔[۴]

(۷) عمال اور حکام کی کڑی نگرانی

جب آپ کو پتا چلا کہ بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف نے ایک دعوت میں شرکت کی ہے تو آپ نے اُسے عتاب آمیز خط میں فرمایا: وَمَا ظَنَنْتُ اَنَّكَ تُجِيبُ اِلٰى طَعَامِ قَوْمٍ عَائِلُهُمْ مَجْفُوٌّ وَ غَنِيُّهُمْ مَدْعُوٌّ
مجھے امید نہ تھی کہ تم اُن لوگوں کی دعوت قبول کر لو گے کہ جن کے یہاں سے فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں اور

۱۔ حکمت و اندرزہا ص ۱۵۱ ۔ ۱۵۲ ۔ ص ۱۳۰ ۔ ۱۳۲ ۔ پیرامون انقلاب اسلامی ص ۴۴

۲۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳

۳۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۱۵۱ ۔ ۱۵۲

۴۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۵۳ ۔ ۱۵۴

دولت مند مدعو ہوں...[1]

آپ کے اس گورنر کا قصور یہ تھا کہ اُس نے ایک ایسی دعوت میں شرکت کی تھی جو اشرافیہ کے لیے مخصوص تھی۔ اس دعوت میں صرف دولت مند شریک تھے اور غریبوں کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔[2]

(۸) عوام کی مشکلات حل کرنا

آپ نے حجاز کے عامل قثم بن عباس کو ایک خط میں لکھا... وَاجْلِسْ لَهُمُ الْعَصْرَيْنِ فَأَفْتِ الْمُسْتَفْتِيَ وَ عَلِّمِ الْجَاهِلَ وَ ذَاكِرِ الْعَالِمَ وَ لَا يَكُنْ لَكَ إِلَى النَّاسِ سَفِيرٌ إِلَّا لِسَانُكَ وَ لَا حَاجِبٌ إِلَّا وَجْهُكَ اور لوگوں کے لیے صبح و شام جلسہ رکھو۔ مسئلہ پوچھنے والے کو مسئلہ بتاؤ، جاہل کو تعلیم دو اور عالم سے تبادلہ خیال کرو اور دیکھو لوگوں تک پیغام پہنچانے کے لیے تمہاری زبان کے سوا کوئی سفیر نہ ہونا چاہیے اور تمہارے چہرے کے سوا کوئی تمہارا دربان نہ ہونا چاہیے۔[3]

(۹) عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ

جناب مالک اشترؓ کے نام ایک خط میں آپ نے تحریر فرمایا: ... وَاجْعَلْ لِذَوِي الْحَاجَاتِ مِنْكَ قِسْمًا تُفَرِّغُ لَهُمْ فِيهِ شَخْصَكَ وَ تَجْلِسُ لَهُمْ مَجْلِسًا عَامًّا فَتَتَوَاضَعُ فِيهِ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَكَ وَ تُقْعِدُ عَنْهُمْ جُنْدَكَ وَ أَعْوَانَكَ مِنْ أَحْرَاسِكَ وَ شُرَطِكَ حَتَّى يُكَلِّمَكَ مُتَكَلِّمُهُمْ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ يَقُولُ فِي غَيْرِ مَوْطِنٍ لَنْ تُقَدَّسَ أُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيفِ فِيهَا حَقُّهُ مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ ...اور دیکھو ضرورت مندوں کے لیے ایک وقت معین کر دو جس میں سب کام چھوڑ کر انہی کے لیے مخصوص ہو جاؤ اور اُن کے لیے دربار عام لگاؤ اور اس میں اپنے پیدا کرنے والے اللہ کے لیے تواضع و انکساری سے کام لو اور اپنے تمام نگہبان، پولیس، فوج اور مددگاروں کو ہٹا دو تاکہ کہنے والے بے دھڑک اپنی بات کہہ سکیں اور کسی طرح کی لکنت کا شکار نہ ہوں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی مرتبہ یہ فرماتے سنا ہے کہ "اُس قوم میں پاکیزگی نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا۔"[4]

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۴۵

۲۔ گفتار ہائی معنوی ص ۲۲۹۔ انسان کامل ص ۸۳۔ ۸۵

۳۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۶۷

۴۔ بیست گفتار ص ۳۰۔ ۳۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳

حکومت مرتضوی کو درپیش مشکلات

(آپ کی حکومت کی مندرجہ ذیل مشکلات نے آپ کو اپنے ردعمل کے اظہار پر مجبور کیا تھا)

(۱) حضرت عثمانؓ کا قتل

حضرت علیؑ کو جو پہلی مشکل پیش آئی، جس کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ "مستقبل میں ہمیں بہت سی مشکلات درپیش ہیں" وہ حضرت عثمانؓ کا قتل تھا۔ جب آپ خلیفہ بنے تو اُن کے پیشرو خلیفہ انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے اور انقلابیوں نے انھیں دفن کرنے کی اجازت بھی نہ دی تھی اور انھیں خلیفہ سے بہت سی شکایات تھیں اور وہی انقلابی حضرت علیؑ کے ساتھ وابستہ ہو چکے تھے...

حضرت علیؑ جانتے تھے کہ قتل عثمانؓ فتنے کا باعث ثابت ہوگا اور اس مسئلے کا ایک عجیب رخ یہ بھی تھا کہ خود حضرت عثمانؓ کے کچھ طرف دار (خصوصاً معاویہ) کسی نہ کسی طریقے سے قتل عثمانؓ میں شریک تھے جو چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح عثمانؓ قتل ہو جائیں تا کہ دنیائے اسلام میں فتنہ برپا کیا جائے اور وہ ان حالات سے سیاسی مفادات حاصل کر سکیں۔[۱]

(۲) عدل میں رواداری نہ کرنا

حضرت علیؑ کی کچھ مشکلات ایسی بھی تھیں جو ایک لحاظ سے آپ کی روش سے متعلق تھیں تو دوسری طرف سے اُن کا تعلق مسلمانوں کی لائی ہوئی تبدیلیوں سے بھی تھا۔ آپ کسی کی بے جا حمایت کے قائل نہ تھے جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی معاشرے میں مختلف طبقاتی امتیازات قائم ہو چکے تھے۔ اس حوالے سے آپ نے حیران کن ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: "میں عدل و انصاف سے ذرا بھی منہ نہیں موڑوں گا۔" یہاں تک کہ آپ کے مخلص اصحاب آپ کے پاس آ کر کہنے لگے تھے: امیرالمومنینؑ! تھوڑی سی رو رعایت سے کام لیجیے اور اشراف کو بیت المال سے زیادہ وظیفہ دیجیے۔ اُن کی یہ تجویز سن کر آپ نے فرمایا: اَتَأْمُرُونِّي اَنْ اَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ فِيمَنْ وُلِّيتُ عَلَيْهِ وَاللّٰهِ لَا اَطُورُ بِهِ مَا سَمَرَ سَمِيرٌ وَ مَا اَمَّ نَجْمٌ فِي

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۴۔۲۵

السَّمَاءِ نَجْمًا لَوْ كَانَ الْمَالُ لِي لَسَوَّيْتُ بَيْنَهُمْ فَكَيْفَ وَإِنَّمَا الْمَالُ مَالُ اللهِ أَلَا وَإِنَّ إِعْطَاءَ الْمَالِ فِي غَيْرِ حَقِّهِ تَبْذِيرٌ وَإِسْرَافٌ وَهُوَ يَرْفَعُ صَاحِبَهُ فِي الدُّنْيَا وَيَضَعُهُ فِي الْآخِرَةِ وَيُكْرِمُهُ فِي النَّاسِ وَيُهِينُهُ عِنْدَ اللهِ

کیا تم مجھ پر یہ امر عائد کرنا چاہتے ہو کہ میں جن لوگوں کا حاکم ہوں ان پر ظلم و زیادتی کر کے (کچھ لوگوں کی) امداد حاصل کروں تو خدا کی قسم! جب تک دنیا کا قصہ چلتا رہے گا اور کچھ ستارے دوسرے ستاروں کی طرف جھکتے رہیں گے میں اس چیز کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا۔ اگر یہ خود میرا مال ہوتا تب بھی میں اسے سب میں برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ خدا کا مال ہے۔ دیکھو! بغیر کسی حق کے داد و دہش کرنا بے اعتدالی اور فضول خرچی ہے اور یہ اپنے مرتکب کو دنیا میں بلند کرتی ہے مگر آخرت میں پست کرتی ہے اور لوگوں کے اندر عزت میں اضافہ کرتی ہے مگر خدا کے پاس ذلیل کرتی ہے...[1]

(۳) سیاست میں سچائی

سیاست میں آپ کی سچائی اور صاف گوئی آپ کی خلافت کے لیے تیسری مشکل تھی۔ آپ کے کچھ ساتھی بھی آپ کی اس پالیسی سے ناخوش تھے۔[2] مشکل یہ تھی کہ آپ کے مدمقابل معاویہ اپنی خلافت کا دعویدار تھا۔ وہ انتہائی ہشیار، تیز اور چالاک شخص تھا اور اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لیے تمام جائز و ناجائز ذرائع استعمال کرتا تھا۔[3]

(۴) ناکثین، قاسطین اور مارقین

امیرالمومنینؑ نے تین قسم کے گروہوں کو خود سے علیحدہ رکھا اور اُن سے جنگ کی۔ آپ جمل والوں کو ناکثین اور صفین والوں کو قاسطین اور جنگ نہروان لڑنے والے خوارج کو مارقین کے نام سے یاد کرتے تھے۔[4]

ناکثین نفسیاتی طور پر دولت پرست لوگ تھے۔ یہ لوگ طبقاتی نظام کے حامی تھے۔ امام علیؑ نے عدل و مساوات کے متعلق جو خطبات دیئے تھے اُن میں آپ کا اشارہ اسی گروہ کی طرف تھا۔ قاسطین نفسیاتی طور پر سیاست و برتری کے خواہش مند اور منافق تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ کی بجائے عنان حکومت اُن کے ہاتھ میں ہونی چاہیے... حضرت علیؑ کی اُن سے جنگ دراصل نفاق اور دوغلے پن سے جنگ تھی۔ مارقین نفسیاتی

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۲۷۔۲۸

۳۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۵۶۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۵۳۔ ۵۵۔ ۹۲۔ ۹۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۲۸۔۲۹

۴۔ امام علیؑ سے پہلے رسول خدا ﷺ نے ان گروہوں کو یہی نام دیئے تھے۔ اس روایت کو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۰۱ میں نقل کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کی اس پیشین گوئی کو آپ کے دلائل نبوت میں شمار کیا ہے۔

طور پر متعصب لوگ تھے۔ یہ خشک قسم کے تقدس مآب بدترین جہالت کا شکار تھے۔

حضرت علیؑ نے ان تینوں گروہوں سے جہاد کیا اور ان میں سے کسی کے ساتھ صلح نہیں کی۔[1]

(۱) ناکثین

ناکثین (بیعت شکن افراد) کے ساتھ جنگ کی وجہ یہ تھی کہ طلحہ بن عبیداللہ اور زبیر بن العوام نے آپ سے کوفہ اور بصرہ کی گورنری کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ نے اُن کے مطالبہ ماننے سے انکار کردیا تھا۔ ان دونوں نے مکہ جانے کے بہانے مدینہ چھوڑ دیا اور امویوں کے ذریعے لوٹی ہوئی دولت کے بل بوتے پر ایک لشکر جمع کیا (اور مکہ سے ام المومنین بی بی عائشہؓ کو اپنے ساتھ ملایا) اور بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر بصرہ پر قبضہ کیا اور لوٹ مار کی۔ آخرکار ۳۶ھ میں بصرہ کے قریب حضرت علیؑ کی فوج اور بی بی عائشہؓ اور طلحہ و زبیر کی فوج کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ اس جنگ کو جنگِ جمل کہا جاتا ہے۔ اس میں امیرالمومنین کو فتح ملی تھی)۔[2]

امیرالمومنینؑ کی فوج کا ایک آدمی جنگ جمل میں سخت پریشان تھا۔ وہ دونوں لشکروں کو دیکھتا تو اسے ایک طرف حضرت علیؑ کی رکاب میں بزرگان اسلام نظر آتے تھے اور دوسری طرف دیکھتا تو زوجہ رسولؐ بی بی عائشہؓ دکھائی دیتیں ... اور اُن کے پہلو میں طلحہ نظر آتا تھا۔ صدر اسلام میں طلحہ کی بہت سی اسلامی خدمات تھیں اور غزوات میں وہ تیر اندازی کے بہترین جوہر دکھا چکا تھا۔ پھر وہ زبیر کو دیکھتا تو اسے اُس کی اسلامی خدمات طلحہ سے بھی زیادہ نظر آتیں یہاں تک کہ اُس نے روز سقیفہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی بلکہ حضرت علیؑ کے دیگر حامیوں کے ساتھ حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر میں موجود تھا۔

یہ آدمی حیرت میں ڈوب گیا... کہ ان دو گروہوں میں سے کون حق پر ہے؟ اور اس جنگ میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ چنانچہ وہ امیرالمومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے امیرالمومنینؑ! کیا یہ ممکن ہے کہ طلحہ و زبیر اور عائشہؓ باطل پر جمع ہو سکتے ہیں؟ ان جیسے اکابر صحابہ غلط فہمی کا کیونکر شکار ہو سکتے ہیں؟ اور ایسے لوگ کس طرح باطل کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ بات ممکن ہے؟

مصر کے مشہور دانشور ڈاکٹر طہٰ حسین لکھتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ نے اُس شخص کو یہ جواب دیا:[3]

...حق و باطل کو افراد کی میزان پر نہیں تولنا چاہیے۔ افراد کو معیار بنا کر حق و باطل کو پہچاننا غلط ہے۔ تم شخصیات کی میزان میں حق و باطل کو پہچاننا چاہتے ہو کہ فلاں چیز حق ہے کیونکہ فلاں فلاں اس کے حامی ہیں اور فلاں چیز باطل ہے کیونکہ فلاں فلاں اس کے مخالف ہیں۔ یاد رکھو! لوگوں کو حق و باطل کی میزان نہ بناؤ بلکہ حق و باطل کو شخصیات کی پہچان کی میزان بناؤ۔[4]

۱۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۱۱۔۱۱۲
۲۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۸۲
۳۔ علی و بنوہ ص ۴۰
۴۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۳۴۔۱۳۶

(۲) قاسطین

حضرت علیؑ کے سامنے مشکل ترین مسئلہ نفاق کا تھا۔ کفر کے ساتھ جنگ کرنا آپ کے لیے آسان تھا لیکن نفاق کے ساتھ جہاد کرنا انتہائی مشکل کام تھا کیونکہ کفر کے ساتھ اعلانیہ جنگ کی جا سکتی ہے مگر نفاق کے ساتھ جنگ دراصل پوشیدہ کفر کے ساتھ جنگ ہے۔ نفاق ہمیشہ دو رخی ہوتا ہے۔ اس کا ظاہری رخ اسلام اور مسلمان کا ہوتا ہے جبکہ اس کا باطنی رخ کفر کا ہوتا ہے۔ نفاق کو پہچاننا عام انسانوں کے لیے انتہائی مشکل ہے اور بعض اوقات نفاق کا پہچاننا ناممکن ہوتا ہے۔ اکثر اوقات نفاق کے ساتھ جنگ میں ناکامی ہوتی ہے کیونکہ لوگوں کی قوت ادراک بہت کمزور ہوتی ہے اور اُن کی ظاہر بین آنکھیں نفاق کو نہیں دیکھ پاتیں۔[1]

بنیادی مشکل یہ ہے ... کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے زمانے میں ایک طبقہ تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ طبقہ انقلاب برپا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ آپ نے اُس طبقے کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور دین کا فہم عطا کیا۔ آپ نے انھیں قدم بہ قدم آگے بڑھایا اور اسلام کی تعلیم اُن کی روح میں اتار دی۔ آپ تیرہ برس تک مکہ میں مقیم رہے اور قریش کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرتے رہے مگر آپ نے ہمیشہ صبر کا حکم دیا ... آخر میں آپ نے ہجرت کا حکم دیا۔ کچھ لوگ حبشہ ہجرت کر گئے جو مسلمانوں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی ...

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ کے حالات میں ایک واضح فرق یہ تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقابلہ کفار سے تھا ... جبکہ حضرت علیؑ کا مقابلہ پردوں میں چھپے ہوئے کفر یعنی نفاق سے تھا ...

دوسرا فرق یہ تھا کہ خلفائے ثلاثہ بالخصوص خلیفہ ثالث کے عہد میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی ... چنانچہ اس کی وجہ سے دنیائے اسلام میں خشک قسم کے زاہدوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جو اسلامی تربیت سے نابلد تھا مگر وہ اسلام سے محبت بھی رکھتا تھا۔ یہ گروہ اسلام کی روح سے آشنا نہیں تھا مگر اسلام کے قالب سے چمٹا ہوا تھا۔[2]

جنگ صفین

حضرت علیؑ کی خلافت سے پہلے معاویہ شام میں خلافت پر قبضہ کرنے کی مکمل تیاری کر چکا تھا اور جب حضرت علیؑ خلیفہ بنے تو آپ نے اُس کی معزولی کا فرمان جاری کیا۔ آپ ایک لمحے کے لیے بھی اسے شام کا حاکم نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کے اس اقدام کے نتیجے میں عراق اور شام کی فوجوں کے درمیان صفین کے مقام

۱۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۷۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۵ ۔ ۲۷ ، ۳۲ ۔ ۳۴۔ مجموعہ آثار ج ۳ ، ص ۳۳۵۔ آشنائی با قرآن ج ۲ ۔ ۱ ، ص ۱۹۳ ۔ ۱۹۳

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۹ ۔ ۳۲

پر جنگ ہوئی۔[۱] جب حضرت علیؑ اپنی فوج لے کر صفین میں پہنچے تو آپ نے وہاں پہنچتے ہی جنگ شروع نہیں کی بلکہ اتمام حجت کے لیے معاویہ کو خطوط لکھے اور سفیر بھیجے تاکہ کسی نہ کسی طرح یہ اختلاف ختم ہو جائے... لیکن معاویہ اور اس کے ساتھیوں نے یہ اشتعال انگیز حرکت کی کہ انھوں نے دریائے فرات کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا تاکہ حضرت علیؑ کے سپاہیوں کو پانی نہ ملے اور وہ شدت پیاس سے مجبور ہو کر میدان چھوڑ دیں۔

جب آپ نے اُن کی یہ بزدلانہ حرکت دیکھی تو ایک خط دے کر اپنا نمائندہ معاویہ کے پاس بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اگر تم یہ حرکت نہ کرو تو اچھا ہے۔ آپ نے کئی بار اتمام حجت کی مگر معاویہ نے آپ کا فرمان ماننے سے انکار کر دیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اب جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے تو آپ نے اپنی فوج کے سامنے مختصر خطاب کیا۔[۲] اپنے خطاب کے ذریعے آپ نے اپنے سپاہیوں میں عزم و شجاعت کی نئی روح پھونکی[۳] اور جنگ کا حکم دیا۔ آپ کے سپاہیوں نے اس بے جگری سے جنگ کی کہ شام ہونے سے قبل انھوں نے معاویہ کے لشکر کو پیچھے دھکیل دیا اور گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ اب ہم بھی اُن کو یہاں سے پانی نہیں لینے دیں گے۔[۴] یہ سن کر حضرت علیؑ نے اُن لوگوں سے فرمایا کہ پانی سے روکنا جواں مردی اور مردانگی نہیں ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے تم اُن کے ساتھ وہی کچھ نہ کرو۔

حضرت علیؑ نہیں چاہتے تھے کہ ایک مردانگی کے خلاف کام کے ذریعے کامیابی حاصل کریں۔ بزرگوں کی تاریخ اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔[۵]

(۳) مارقین

خوارج یعنی شورش پسند لوگ... واقعہ تحکیم کی وجہ سے خوارج کا گروہ پیدا ہوا تھا۔ جب جنگ صفین اپنے آخری دن ختم ہونے کے قریب تھی اور حضرت علیؑ کی فتح یقینی تھی تو معاویہ نے عمرو بن عاص کے مشورے سے ایک چال چلی اور اپنے لشکر کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کا حکم دیا۔[۶] حضرت علیؑ اپنی فوج سے کہتے رہے کہ ان پر حملہ جاری رکھو... میں ہی قرآن کی حقیقت اور اس کی سچی تجلی ہوں۔ انھوں نے مخطوط اوراق کو اس لیے بلند کیا ہے کہ اس کے معنی اور حقیقت کو ختم کر سکیں (خوارج نے خود حضرت علیؑ کے خلاف محاذ کھول دیا اور جنگ

۱۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۸۳

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵۱

۳۔ گفتار ہای معنوی ص ۱۸۲۔ انسان کامل ص ۱۰۸۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۳۰۱۔ داستان راستان ج ۱، شمارہ ۱۱۲، ص ۳۳۸

۴۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، خطبہ ۵۱

۵۔ سیری در سیرۂ نبوی ص ۱۳۰۔ ۱۳۱

۶۔ قرآن کو نیزوں پر کیوں بلند کیا گیا تھا؟ اس واقعہ کے تجزیے کے لیے دیکھیے: جاذبہ و دافعہ علی ص ۱۶۹۔ ۱۷۳

روک دی)۔[1] پھر تحکیم کی مجلس تشکیل پائی۔... (دشمن کے لشکر)[2] نے بلا اختلاف عمرو بن عاص کو چنا جو چال چلنے میں طاق تھا۔ ادھر حضرت علیؑ نے اپنی نمائندگی کے لیے ابن عباس جیسے جہاں دیدہ یا مالک اشتر جیسے فداکار اور روشن بین کا نام پیش کیا یا ان جیسے کسی شخص کے تقرر کے لیے کہا مگر یہ لوگ اپنے جیسے کسی احمق کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ابو موسیٰ اشعری جیسے بے تدبیر شخص کا انتخاب کیا جبکہ اُس کے تعلقات بھی حضرت علیؑ سے کشیدہ تھے۔[3]

چند ماہ کی مشاورت کے بعد عمرو بن عاص نے ابو موسیٰ سے کہا کہ مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ نہ علیؑ خلیفہ رہے اور نہ معاویہ خلیفہ بنے۔ ہم کسی تیسرے شخص کو خلیفہ منتخب کرتے ہیں اس کے لیے تیرا داماد عبداللہ بن عمر بہت مناسب ہے ... دونوں نے اس پر اتفاق کر لیا اور اعلان کیا گیا کہ لوگ ثالثوں کا فیصلہ سننے کے لیے جمع ہو جائیں ... ابو موسیٰ نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتارتے ہوئے کہا کہ میں نے جیسے یہ انگوٹھی اپنی انگلی سے اتاری ہے اسی طرح میں علیؑ کو منصب خلافت سے اتارتا ہوں۔ وہ یہ کہہ کر منبر سے نیچے آ گیا۔ اس کے بعد عمرو بن عاص منبر پر آیا اور کہا کہ آپ لوگوں نے ابو موسیٰ کی بات سن لی ہے اور اُس نے علیؑ کو معزول کر دیا ہے۔ میں بھی علیؑ کو معزول کرتا ہوں۔ پھر اس نے اپنی انگوٹھی بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنتے ہوئے کہا کہ میں معاویہ کو خلافت کے لیے ایسے ہی مقرر کرتا ہوں جیسا کہ یہ انگوٹھی میں نے انگلی میں پہنی ہے۔ وہ یہ کہہ کر منبر سے نیچے اتر آیا۔[4] مجلس میں شور مچ گیا۔ لوگوں نے ابو موسیٰ پر حملہ کر دیا۔ کچھ لوگ اسے کوڑے مارنے لگے ... وہ مکہ بھاگ گیا اور عمرو بن عاص شام چلا گیا۔

اس صورت حال کے ذمے دار خوارج تھے ... انھوں نے مذہبی فرقے کی حیثیت اختیار کر کے اپنی تبلیغ شروع کر دی تھی۔[5] جب انھوں نے اپنی ناقص فکر سے ان حالات کا جائزہ لیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ عثمان، علی اور معاویہ ہیں اور یہ تینوں خطاکار اور گناہ گار ہیں۔ ہمیں ان خرابیوں کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ ہمیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا چاہیے۔ چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے خوارج کا مذہب وجود میں آیا۔[6]

۱۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۱۴ ۔ ۱۱۵

۲۔ واقعہ تحکیم کے تینوں مراحل کی تفصیل کے لیے دیکھیے: جاذبہ و دافعہ علیؑ، پاورقی ص ۱۶۳ ۔ ۱۶۴

۳۔ حضرت علیؑ کے حکم سے اسے گورنری سے ہٹایا گیا تھا۔

۴۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۶۲ ۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۳۶

۵۔ حکمت ہا و اندرزہا ص ۱۳۶ ۔ ۱۳۷ ۔ بیست گفتار ص ۵۱ ۔ ۵۳

۶۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۱۸ ۔ ۱۲۱ ۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۳ ۔ ۳۵

تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ فکری جمود کا سلسلہ پیدا ہوا جو خوارج کی صورت میں نمودار ہوا۔[۱] شروع شروع میں ان لوگوں کا خیال تھا کہ لوگوں کو نہ تو امام کی ضرورت ہے اور نہ ہی حکومت کی احتیاج ہے۔ لوگوں کو خود کتاب اللہ پر عمل کرنا چاہیے لیکن بعد میں انھوں نے اس نظریے سے رجوع کر لیا اور عبداللہ بن وہب راسبی کی بیعت کر لی۔[۲]

یہ لوگ شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ صحیح طریقے سے منتخب ہوئے تھے... انھوں نے اپنے عہد حکومت میں غلط کام نہیں کئے تھے۔ وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؑ کے انتخاب کو بھی صحیح سمجھتے تھے مگر کہتے تھے کہ عثمانؓ نے اپنی خلافت کے آخری چھ سالوں میں اپنی سابقہ روش تبدیل کر دی تھی اور مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف کام کرنے لگے تھے ... اور علیؑ نے تحکیم کو قبول کیا اور پھر توبہ نہیں کی لہٰذا (العیاذ باللہ) وہ کافر ہو گئے ہیں اور واجب القتل ہیں۔[۳] باقی خلفاء سے وہ اظہار برأت کیا کرتے تھے اور ہمیشہ ان سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔[۴]

خوارج کی خصوصیات

خوارج کی مخصوص نفسیات تھیں ... ہم اُن کے مثبت پہلو بھی بیان کرتے ہیں اور اُن کے منفی اور خطرناک بلکہ وحشت ناک پہلوؤں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔

اُن کے مثبت پہلو یہ تھے:

(۱) خوارج نفسیاتی طور پر قربانی کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ اپنے عقیدے اور آئیڈیالوجی کے راستے میں بہت جدوجہد کرنے والے لوگ تھے۔

۱۔ اسلام و مقتضیات زمان ج ۱، ص ۱۱۵۔ خوارج کے اصول عقائد سے آگاہی کے لیے دیکھئے: جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۲۴۔ ۱۲۸ اور ۱۵۵۔ ۱۵۷۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۶۔ ۳۹۔ مجموعہ آثار ج ۳، ص ۶۷ اور بیست گفتار ص ۵۷

☆ خوارج دوسرے اسلامی فرقوں سے ممیز ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ خلیفہ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ قرشی یا عربی ہو۔ اسلامی حکومت کے معاملے میں عرب اور عجم سب برابر ہیں۔ خوارج کا عقیدہ ہے کہ جو شخص کبیرہ گناہ کرتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے اور خوارج کی رائے کے مخالف رائے رکھنا اور اجتہاد کرنا گناہ ہے۔ متشدد خارجی گروہ ازارقہ کہتا ہے کہ جو شخص خوارج کی مخالفت کرے وہ مشرک ہے۔ اُس کے خلاف لڑنا چاہیے اور اسے قتل کر دینا چاہیے۔ (رضوانی)

۲۔ ابن اثیر، تاریخ کامل ج ۳، ص ۳۳۶۔ احمد امین مصری، ضحی الاسلام ج ۳، ص ۳۳۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۲، ص ۳۰۸

۳۔ شہرستانی، الملل والنحل

۴۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۹

ابن عبد ربہ نے اُن کے متعلق لکھا ہے:

خوارج دوسرے فرقوں کی نسبت اپنے عقائد میں پختہ اور سخت جدوجہد کرنے والے لوگ تھے۔ وہ ہر وقت موت کو گلے لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ایک خارجی کو نیزہ لگا جس سے وہ شدید زخمی ہوگیا مگر اس حالت میں بھی وہ اپنے اوپر حملہ کرنے والے کا پیچھا کرتے ہوئے یہ آیت پڑھ رہا تھا عَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ خدایا میں تیری طرف جلدی کر رہا ہوں تاکہ تو راضی ہو جائے۔[1] (سورۂ طٰہٰ : آیت ۸۴)

(۲) یہ لوگ بہت عبادت گزار اور زاہد تھے۔ اُن کی راتیں عبادت میں بسر ہوتی تھیں اور دنیا کی زیب و زینت سے انھیں کوئی علاقہ نہیں تھا۔[2]

خوارج اسلام کے ظاہری احکام پر سختی سے عمل کرتے تھے اور جس چیز کو گناہ سمجھتے اُس کے نزدیک بھی نہیں جاتے تھے۔ اُن کا ہر قدم ان کے عقیدے کے بنیاد پر اٹھتا تھا اور وہ اپنے مسلک پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ وہ اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔

خوارج کا باب، تاریخ اسلام بالخصوص تاریخ تشیع کا سبق آموز باب ہے۔

حضرت علیؑ نے خوارج کا قصہ پاک کر دیا تو آپ کو اپنے فوجی اقدام کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں فرمایا تھا: أَيُّهَا النَّاسُ! فَإِنِّي فَقَأْتُ عَيْنَ الْفِتْنَةِ وَلَمْ يَكُنْ لِيَجْتَرِءَ عَلَيْهَا أَحَدٌ غَيْرِي بَعْدَ أَنْ مَاجَ غَيْهَبُهَا وَاشْتَدَّ كَلَبُهَا اے لوگو! میں نے فتنہ و شر کی آنکھ پھوڑ ڈالی ہے اور جب اس کی تاریکیاں موجوں کی طرح تہ و بالا ہو رہی تھیں اور دیوانگی کا مرض شدید ہوگیا تھا تو میرے علاوہ کسی میں جرأت نہ تھی کہ وہ اس کی طرف بڑھتا۔[3]

خوارج کے منفی پہلو یہ تھے:

(۳) خوارج انتہائی جاہل اور نادان لوگ تھے۔ وہ اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے حقائق سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ لوگ اسلامی عقائد کی غلط اور من مانی تفسیر کرتے تھے اور ان کی کج فہمیوں نے بتدریج نئے مذہب کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔[4]

(۴) خوارج انتہائی تنگ نظر تھے۔ یہ لوگ انتہائی گھٹیا سوچ کے مالک تھے۔ انھوں نے اسلام کو اپنی محدود سوچ کی چار دیواری میں محصور کر دیا تھا۔ مذہبی تنگ نظری خوارج کی خصوصیت تھی۔ حضرت علیؑ نے

۱۔ فجر الاسلام ص ۲۶۳ بحوالہ العقد الفرید

۲۔ خوارج کی نفسیات کے لیے ابن عباس کا بیان العقد الفرید ج ۲، ص ۳۸۹ میں دیکھیے۔

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۹۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۳۹۔ ۴۲۔ سیری در نہج البلاغہ ص ۱۸۴۔ ۱۸۶

۴۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۳۵۔ ۱۵۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۴۲۔ ۴۳

ان کی تنگ نظری کو یوں بیان کیا ہے:

فَإِنْ أَبَيْتُمْ إِلَّا أَنْ تَزْعُمُوا أَنِّي أَخْطَأْتُ وَ ضَلَلْتُ فَلِمَ تُضَلِّلُونَ عَامَّةَ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ بِضَلَالِي
وَ تَأْخُذُونَهُمْ بِخَطَئِي وَ تُكَفِّرُونَهُمْ بِذُنُوبِي سُيُوفُكُمْ عَلَى عَوَاتِقِكُمْ تَضَعُونَهَا مَوَاضِعَ الْبُرْءِ وَالسُّقْمِ
وَ تَخْلِطُونَ مَنْ أَذْنَبَ بِمَنْ لَمْ يُذْنِبْ وَ قَدْ عَلِمْتُمْ أَنَّ رَسُولَ اللهِ رَجَمَ الزَّانِيَ الْمُحْصَنَ ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهِ ثُمَّ
وَرَّثَهُ أَهْلَهُ وَ قَتَلَ الْقَاتِلَ وَ وَرَّثَ مِيرَاثَهُ أَهْلَهُ وَ قَطَعَ السَّارِقَ وَ جَلَدَ الزَّانِيَ غَيْرَ الْمُحْصَنِ ثُمَّ قَسَمَ عَلَيْهِمَا
مِنَ الْفَيْءِ وَ نَكَحَا الْمُسْلِمَاتِ فَأَخَذَهُمْ رَسُولُ اللهِ بِذُنُوبِهِمْ وَ أَقَامَ حَقَّ اللهِ فِيهِمْ وَ لَمْ يَمْنَعْهُمْ سَهْمَهُمْ
مِنَ الْإِسْلَامِ وَ لَمْ يُخْرِجْ أَسْمَاءَهُمْ مِنْ بَيْنِ أَهْلِهِ...

اگر تم اس خیال سے باز آنے والے نہیں ہو کہ میں نے غلطی کی اور گمراہ ہو گیا ہوں، تو میری گمراہی کی وجہ سے امت محمد ﷺ کے عام افراد کو کیوں گمراہ سمجھتے ہو اور میری غلطی کی سزا انھیں کیوں دیتے ہو؟ اور میرے گناہوں کے سبب سے انھیں کیوں کافر کہتے ہو؟ تلواریں کندھوں پر اٹھائے موقع و بے موقع ہر جگہ پر وار کئے جا رہے ہو اور بے خطاؤں کو خطا کاروں کے ساتھ ملا رہے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے جب شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا تو اُس کی نماز جنازہ بھی پڑھی اور اُس کے وارثوں کو اس کا ورثہ بھی دلوایا اور قاتل کو قصاص میں قتل کیا تو اُس کی میراث اس کے گھر والوں کو دلائی۔ چور کے ہاتھ کاٹے اور غیر شادی شدہ زانی کو کوڑے لگوائے تو اُس کے ساتھ انھیں مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی دیا اور انھوں نے مسلمان عورتوں سے نکاح بھی کئے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ان کے گناہوں کی اُن کو سزا دی اور جو اُن کے بارے میں اللہ کا حق تھا اسے جاری کیا مگر انھیں اسلام کے حق سے محروم نہیں کیا اور نہ اہل اسلام سے اُن کے نام خارج کئے۔[1]

اس خطبے میں امیرالمومنینؑ نے خوارج کے دو غلط نظریات کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے:

(۱) وہ بے گناہوں کو بھی گناہ گاروں کے ساتھ شامل کر رہے تھے اور اُن کا مؤاخذہ کر رہے تھے۔

(۲) وہ گناہ گاروں کو اسلام سے خارج سمجھ رہے تھے جو سراسر ان کی نادانی تھی۔ خوارج سے آپ کی جنگ چند افراد سے جنگ نہ تھی بلکہ اُن کے طرزِ فکر سے جنگ تھی۔ جب معاویہ نے نیزوں پر قرآن بلند کرایا تھا تو یہ لوگ اپنی تنگ نظری اور کج فہمی کی وجہ سے فریب کھا گئے تھے اور انھوں نے اسلام کے لیے شدید خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ اگر وہ حضرت علیؑ سے اختلاف نہ کرتے اور آپ کو نفاق کی جڑیں کاٹنے سے نہ روکتے تو یقیناً آپ معاویہ کا کام تمام کر دیتے اور آج تاریخ اسلام کی صورت کچھ اور ہوتی مگر انھوں نے جنگ روک کر اسلامی معاشرے کے حالات مخدوش کر دیئے۔[2]

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۷

۲۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۵۷ ۔ ۱۶۱

خوارج کی سرکشی اور اُن کا مسلح قیام

جب خوارج کو یہ احساس ہوا کہ حضرت علیؑ اُن کے مطالبے کے باوجود نہ تو اپنی غلطی ماننے پر تیار ہیں اور نہ اُن کے مطالبے پر توبہ کر رہے ہیں تو انھوں نے اپنا لائحہ عمل تبدیل کر دیا اور مسلح قیام کا فیصلہ کر لیا۔ (جب وہ حضرت علیؑ کو اپنا ہمنوا بنانے سے مایوس ہو گئے تو) انھوں نے اپنے ایک ہم مسلک شخص کے گھر پر اجلاس منعقد کیا جس میں اُس شخص نے سخت اشتعال انگیز تقریر کی اور اپنے ساتھیوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول کے مطابق شورش پر اکسایا۔ (چنانچہ اس تقریر کے بعد) خوارج کی دشمنی کی چنگاریاں شعلوں میں بدل گئیں اور انھوں نے لوٹ مار شروع کر دی، راستے غیر محفوظ بنا دیے اور ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔[۱]

حضرت علیؑ نے ابھی تک خوارج کو مکمل چھوٹ دے رکھی تھی اور اُن کے ساتھ اعلیٰ جمہوری رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ آپ نے انھیں نہ تو قید کیا اور نہ ہی کوڑے لگوائے یہاں تک کہ تمام تر مخالفت کے باوجود آپ نے بیت المال سے اُن کے وظائف بھی بند نہیں کیے۔

حضرت علیؑ کی زندگی کا یہ پہلو زیادہ تعجب خیز نہیں مگر دنیا میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔[۲] یہ لوگ پیٹھ پیچھے آپ کی توہین کرتے تھے مگر آپ ہمیشہ صبر سے کام لیتے تھے۔[۳]

خوارج سے مقابلہ

جب خوارج کی سرگرمیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو اُن کی شرپسندی ناقابل برداشت ہو گئی۔ آپ نے (۳۸ھ اور ایک قول کے مطابق ۳۹ھ) میں اُن کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا۔ اب آپ انھیں آزاد نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ آپ نے ابن عباس کو اُن سے مذاکرات کرنے بھیجا لیکن انھیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد آپ خود بنفس نفیس ان کے پاس تشریف لے گئے اور اُن سے گفتگو کی۔ آپ کی گفتگو کافی مؤثر ثابت ہوئی۔ خوارج کی کل تعداد بارہ ہزار تھی۔ آپ کی گفتگو سن کر آٹھ ہزار افراد اُن سے الگ ہو گئے۔ آپ نے واپس آنے والوں کے لیے امان کا پرچم نصب کر دیا تھا۔[۴] چنانچہ آٹھ ہزار افراد اس پرچم کے نیچے آئے جبکہ چار ہزار افراد اپنی سرکشی پر قائم رہے۔ آپ نے (نہروان کے مقام پر) اُن سے جنگ کی اور چار ہزار میں سے صرف نو افراد

۱۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۴۱، ۱۴۳۔ کامل مبرد ج ۲

۲۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۳۹۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۶۔ ۳۷۔ بیست گفتار ص ۵۹

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۶۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ص ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ مسألہ شناخت ص ۲۲۶۔ ۲۲۹۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۲، ص ۳۱۱

۴۔ آپ نے امن کا پرچم ابو ایوب انصاریؓ کے ہاتھ میں دیا تھا۔ (جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۴۳)

ہی بچ پائے اور باقی سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بچ جانے والے افراد میں عبدالرحمان ابن ملجم جیسا "مقدس مآب" بھی شامل تھا۔[1]

خوارج کا گروہ پہلی صدی ہجری کے چوتھے عشرے میں ایک خطرناک غلط فہمی کی وجہ سے وجود میں آیا تھا مگر ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک یہ گروہ باقی نہ رہا۔ یہ لوگ اپنی بے باکی اور حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت کی وجہ سے خلفاء کے عتاب کا نشانہ بنتے رہے اور اپنی اسی روش کی وجہ سے وہ ختم بھی ہو گئے اور اُن کا مذہب بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ عباسی حکومت کے ابتدائی ایام میں یہ گروہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔[2]

حضرت علیؑ کی شہادت میں قطام کا کردار

عبدالرحمان ابن ملجم جنگ نہروان میں بچ جانے والے تو "خشک مقدس" لوگوں میں سے تھا جو وہاں سے مکہ چلے گئے اور انھوں نے وہاں آپس میں پیمان باندھا۔[3] اُن کا خیال تھا کہ علیؑ، معاویہ اور عمرو بن عاص ہی اسلامی دنیا کی تمام مشکلات کے ذمے دار ہیں چنانچہ انھیں راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔

ابن ملجم کوفہ آیا اور کچھ عرصے تک وعدے کی رات کا انتظار کرتا رہا۔ اس اثنا میں اُس کی قطام نامی لڑکی سے دوستی ہو گئی۔ اتفاق سے وہ لڑکی بھی اُس کی ہم مسلک تھی۔ پھر اُس کی دوستی عشق میں بدل گئی، شاید اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ قتل علیؑ کا کیا ہوا وعدہ فراموش کر دیا تھا۔

ابن ملجم نے قطام کو شادی کا پیغام دیا۔ اُس نے جواب میں کہا کہ میں تجھ سے شادی پر آمادہ ہوں لیکن میرا حق مہر بہت زیادہ ہے۔

ابن ملجم کہنے لگا کہ کوئی بات نہیں۔ تم اپنا حق مہر بتاؤ۔

قطام نے کہا کہ میں نکاح کے عوض تین ہزار درہم، ایک غلام اور ایک کنیز لوں گی۔

عبدالرحمان ابن ملجم نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں تمھاری تینوں شرطیں قبول کرتا ہوں۔

قطام نے کہا کہ میرے نکاح کی چوتھی شرط بھی ہے اور وہ ہے علی بن ابی طالبؑ کا قتل۔ جیسے ہی ابن ملجم نے یہ سنا تو ایک بار وہ چکرا کر رہ گیا اور کہنے لگا کہ ہم شادی کر کے ہنسی خوشی زندگی گزارنا چاہتے ہیں جبکہ علیؑ کے قتل سے ہماری شادی نہیں ہو سکے گی۔

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۳۹۔۴۰

۲۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ ص ۱۳۹

۳۔ تین خارجیوں عبدالرحمان ابن ملجم، برک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر تمیمی نے خانۂ کعبہ میں یہ عہد و پیمان باندھا تھا کہ ابن ملجم حضرت علیؑ کو، برک معاویہ کو اور عمرو بن بکر، عمرو بن العاص کو قتل کرے گا۔

قطام نے کہا کہ اگر میرا وصال چاہتے ہو تو تمہیں علی کو قتل کرنا پڑے گا۔ اگر اس کے بعد تم زندہ رہے تو شادی کر لینا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ عرصے تک ابن ملجم اس مطالبے پر غور کرتا رہا۔ اس دوران اُس نے کچھ اشعار کہے تھے جن میں سے دو شعر یہ ہیں:

ثَلاثَةُ آلافٍ وَ عَبْدٌ و قَيْنَةٌ وَ قَتْلُ عَلِيٍّ بِالْحُسامِ الْمُسَمَّمِ
وَلا مَهْرَ أَغْلىٰ مِنْ عَلِيٍّ وَ إِنْ علا وَلا فَتْكَ إِلّا دونَ فَتْكِ ابْنِ مُلْجَمِ

اُس نے مجھ سے مہر میں تین ہزار درہم، ایک غلام، ایک کنیز اور زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے علیؑ کا کٹا ہوا سر طلب کیا ہے۔ آج تک دنیا میں کسی عورت کا اتنا بھاری مہر نہیں رہا۔

ہر مہر دنیا میں خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو پھر بھی دنیا کا کوئی مہر حضرت علیؑ کے قتل کے برابر نہیں ہو سکتا جبکہ میری بیوی کا مہر حضرت علیؑ کا خون ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی کیا جانے والا قتل ابن ملجم کے قتل کے برابر نہیں ہو سکتا (ہم سمجھتے ہیں کہ اُس نے سچ کہا تھا)۔[۱]

حضرت علیؑ کی زندگی کا حیرت انگیز عرصہ

حضرت علیؑ کی زندگی کے ۴۵ گھنٹے نہایت حیرت انگیز ہیں۔ اگرچہ آپ کی زندگی کے کئی رخ ہیں مثلاً

(۱) ولادت سے بعثت پیغمبرؐ تک

(۲) بعثت سے ہجرت پیغمبرؐ تک

(۳) ہجرت سے وفات پیغمبرؐ تک

(۴) وفات پیغمبرؐ سے آپ کی خلافت تک

(۵) اپنی خلافت سے شہادت تک

آپ کی خلافت کا عرصہ ساڑھے چار برس کا ہے۔ آپ کی زندگی کا ایک اور دور بھی ہے اور وہ دور دونوں سے بھی کچھ کم ہے اور یہ آپ کی زندگی کا انتہائی حیرت انگیز دور ہے یعنی ضربت سے شہادت تک کا دور۔

اس دوران آپ کا انسان کامل ہونا واضح ہوتا ہے یعنی جن لحات میں آپ موت کے روبرو تھے۔ دیکھیں موت کو سامنے دیکھ کر حضرت علیؑ کا پہلا ردعمل کیا تھا؟

جب آپ کے سر پر ضرب لگی اُس وقت لوگوں نے آپ کی زبان مبارک سے دو جملے سنے تھے: ایک جملہ یہ تھا "اس شخص کو پکڑ لو" اور دوسرا جملہ یہ تھا فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔[۲]

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار، ص ۳۹۔ بیست گفتار، ص ۵۷ـ۵۸۔ اسلام و مقتضیات زمان ج ۱، ص ۱۲۲۔ داستان راستان ج ۱ـ۲، ش ۱۱۲، ص ۳۴۴ـ۳۵۳

۲۔ بحار الانوار ج ۲۰، ص ۱۳۸۔ ج ۴۱، ص ۲

آپ کو زخمی حالت میں گھر لایا گیا اور آپ کے علاج کے لیے ایک عرب طبیب اثیر بن عمرو کو بلایا گیا جس نے جندی شاپور (ایران) سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور کوفہ میں رہائش پذیر تھا۔

اُس نے اپنے زمانے میں رائج وسائل سے آپ کے زخم کا معائنہ کیا[1] اور اس زخم کو لاعلاج قرار دیتے ہوئے عرض کیا: اے امیرالمومنینؑ! اگر کوئی وصیت ہو تو کر لیجیے۔

یہاں آ کر حضرت علیؑ کا حیرت انگیز انسانی معجزہ[2] ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے اہل خانہ کو وصیت کی کہ اپنے قیدی کا خیال رکھنا۔ اس کے بعد آپ نے امام حسن مجتبیٰؑ سے فرمایا: بیٹا! میرے بعد اس کا اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر چاہو تو اسے آزاد کر دینا اور اگر چاہو تو قصاص لینا مگر خیال رکھنا کہ اس نے تمہارے بابا کو ایک ضرب ماری ہے لہٰذا تم بھی اسے ایک ہی ضرب لگانا۔ اگر مر جائے تو مر جائے اور بچ جائے تو بچ جائے۔ پھر آپ نے ابن ملجم کے بارے میں پوچھا: کیا تم نے اپنے قیدی کو کھانا کھلایا ہے؟ کیا تم نے اسے پانی پلایا ہے؟ کیا تم نے اس کی خبر گیری کی ہے۔ مولا کے لیے دودھ کا پیالہ لایا گیا۔ آپ نے تھوڑا سا دودھ پیا پھر فرمایا کہ یہ دودھ ابن ملجم کو دے دو تا کہ وہ بھوکا نہ رہے۔

دشمن کے ساتھ آپ کے حسن سلوک کو دیکھ کر مولانا روم نے کہا تھا:

در شجاعت شیر ربا نیستی
در مروت خود کہ داند کیستی

شجاعت میں تو آپ شیر کردگار ہیں۔ مروت کے متعلق کون جانتا ہے کہ آپ کیا ہیں؟

پینتالیس گھنٹوں میں آپ نے جو کچھ فرمایا وہ لہو گرما دینے والا کلام ہے۔ آپ کی آخری وصیت انتہائی پُر جوش ہے اور یہ بیس نکات پر مشتمل ہے۔ آپ نے ساڑھے چار برس حکومت کی اور طلوع فجر کے تھوڑی دیر بعد ۱۹ ماہ رمضان کو آپ کو ضرب لگی اور ۲۱ ماہ رمضان کو نصف شب کے قریب آپ کی روح مقدس عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔[3]

خفیہ تدفین

حضرت علیؑ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کی شہادت کوفہ جیسے بڑے شہر میں ہوئی۔ نہروانی خوارج کے علاوہ باقی تمام اہل کوفہ کی آرزو تھی کہ آپ کے جنازے میں شرکت کریں اور آپ پر گریہ و بکا کریں۔ ماہ رمضان کی اکیسویں کی رات لوگوں کو علم ہی نہیں تھا کہ آپ پر کیا بیت رہی ہے۔ نصف شب کے قریب آپ

۱۔ بیان کیا جاتا ہے کہ گوسفند کے پھیپھڑے کی رگ کو گرم کر کے زخم پر رکھا گیا تھا۔

۲۔ یہاں وہ معجزہ مراد نہیں جو حقانیت کے اثبات کے لیے ہوتا ہے بلکہ وہ معجزہ مراد ہے جو زیادہ تر ایک عالم کے لیے ہوتا ہے۔

۳۔ انسان کامل ص ۱۱۳ ۔ ۱۱۷

نیا سے رخصت ہو گئے۔ جیسے ہی آپ کی شہادت ہوئی تو راتوں رات امام حسنؑ ، امام حسینؑ ، محمد بن حنفیہؒ اور حضرت عباسؑ اور آپ کے کچھ خاص شیعوں نے جن کی تعداد غالباً چھ سات سے زیادہ نہ تھی ، آپ کو غسل اور کفن دیا اور آپ کے جسد اطہر کو دفن کرنے کے لیے اس جگہ لے گئے جہاں آپ نے دفن کرنے کی وصیت کی تھی۔ روایات کہتی ہیں کہ کچھ انبیائے کرامؑ بھی یہاں مدفون ہیں۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں آپ کو وہاں دفن کیا گیا۔ اس کے بعد نشان قبر کو مٹا دیا گیا اور اس کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتایا گیا۔ دوسرے دن لوگوں کو معلوم ہوا کہ کل رات حضرت علیؑ دفن ہو چکے ہیں۔

پوچھا گیا کہ انھیں کہاں دفن کیا گیا؟ جواب دیا گیا کہ اس کا جاننا ضروری نہیں یہاں تک کہ کچھ مؤرخین نے یہ لکھا ہے کہ امام حسن مجتبیٰؑ نے ایک تابوت بنا کر مدینہ بھیج دیا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ حضرت علیؑ کو دفن کے لیے مدینہ بھیجا گیا ہے۔

آخر اس تدبیر کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے جسم اطہر کو خوارج کے شر سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ خوارج کو آپ سے اتنی شدید عداوت تھی کہ اگر انھیں آپ کی قبر کا علم ہو جاتا تو وہ قبر کی بے حرمتی کرتے اور آپ کے جسم اطہر کو قبر سے نکال لیتے۔

چنانچہ جب تک خوارج دنیا میں موجود رہے اس وقت تک حضرت علیؑ کی اولاد یعنی ائمہ اطہارؑ کے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ کہاں دفن ہیں اور جب ایک صدی کے بعد خوارج کا زور ٹوٹ گیا اور بنی امیہ کی حکومت ختم ہو گئی اور بنی عباس کا دور شروع ہوا اور کسی کی طرف سے بے ادبی کا ڈر باقی نہ رہا تو امام جعفر صادقؑ نے پہلی بار کھل کر امیر المومنینؑ کی قبر مبارک کا انکشاف کیا۔

خوارج کی مشکل آپ کی زندگی تک محدود نہ تھی بلکہ آپ کی وفات کے بعد ایک صدی تک ان کے خوف کی وجہ سے آپ کی قبر مخفی رکھی گئی تھی۔[۱]

بحث کے چیدہ نکات

(۱) خلفاء پر حضرت علیؑ کی تنقید ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ ان پر آپ کی تنقید ذاتیات اور تعصب پر مبنی نہیں تھی بلکہ آپ کی تنقید تحلیلی اور منطقی تھی۔ نہج البلاغہ میں پائی جانے والی تنقید کہیں کلی ہے اور کہیں جزئی ہے۔ کلی اور ضمنی تنقید تو وہی ہے جس کا آپ نے کھل کر اظہار کیا ہے کہ مجھ سے میرا قطعی اور مسلمہ حق چھینا گیا ہے۔

(۲) خطبہ شقشقیہ میں حضرت ابوبکرؓ پر جو تنقید کی گئی ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل دو جملوں میں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ سیری در سیرہ ائمہ اطہارؑ ص ۵۲۔ ۵۳۔ انسان کامل ص ۱۳۳۔ ۱۳۶

(الف) خلیفہ اول کو بخوبی علم تھا کہ میں اُن کی نسبت خلافت کا زیادہ حق دار ہوں اور خلافت کا پیراہن صرف میرے ہی جسم پر برابر آتا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے خلافت چھینی تھی۔

(ب) انھوں نے اپنا جانشین کیوں مقرر کیا تھا؟ جبکہ وہ اپنے دورِ حکومت میں لوگوں سے کہتے تھے کہ مجھے حکومت سے سبکدوش کردو۔

(۳) خطبۂ شقشقیہ میں جہاں خلیفہ اول و ثانی پر مشترکہ تنقید کی گئی ہے وہاں آپ نے خلیفہ ثانی کی ان اخلاقی خصوصیات پر تنقید کی ہے:

(۱) خلیفہ ثانی تند خو، پُر ہیبت اور سخت مزاج آدمی تھے۔

(۲) آپ حضرت عمرؓ کی جلد بازی پر بھی تنقید کرتے تھے کیونکہ وہ رائے قائم کرنے میں جلد بازی سے کام لیتے تھے اور پھر بہت جلد اپنی رائے بدل دیتے تھے۔

(۴) آپ نے خطبۂ شقشقیہ میں کھل کر تنقید کی ہے جبکہ دوسرے مقامات (مثلاً عثمان بن حنیف کے نام اپنے مکتوب میں یا مکتوب ۲۸ اور ۶۲) پر کلی طور پر یا کنایۃً تنقید کی ہے۔

(۵) نہج البلاغہ میں پانچ خطبات ایسے ہیں جن میں آپ نے قتل عثمانؓ سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔ ایک جگہ آپ نے طلحہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ قتل عثمانؓ میں شریک ہے اور دو جگہ آپ نے فرمایا ہے کہ معاویہ نے عثمانؓ کی خاطر خواہ مدد نہیں کی تھی اور قتل عثمانؓ کے معاملے میں وہ قصوروار ہے۔

(۶) نہج البلاغہ میں حضرت عثمانؓ پر جو تنقید کی گئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

(الف) جب خلیفہ نے حضرت ابوذرؓ کو جلاوطن کیا تو آپ نے حضرت ابوذرؓ سے ملاقات کی اور اُن سے گفتگو کی جس میں آپ نے اُن کے اعتراضات کو حق بجانب قرار دیا اور حکومت عثمانؓ کو ذمے دار ٹھہرایا۔

(ب) خطبہ ۳۰ میں آپ نے حضرت عثمانؓ پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے ظلم کا راستہ اپنایا اور امت کے لوگوں پر اپنے رشتے داروں کو ترجیح دی۔

(ج) حضرت عثمانؓ کمزور ارادے کے آدمی تھے ... مروان بن حکم جسے رسول خدا ﷺ نے مدینہ سے جلاوطن کیا تھا ... اسے انھوں نے اپنا چیف سکریٹری بنا لیا تھا اور وہ اُن کے نام سے جو چاہتا، کر گزرتا تھا۔

(د) خطبۂ شقشقیہ میں اُن پر انتہائی تند و تیز تنقید کی گئی ہے۔

(۷) آپ نے مسلح جدوجہد سے گریز کیا تھا اور مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد برقرار رکھنے کے لیے خاموشی اختیار کی تھی۔ اس کا ثبوت نہج البلاغہ کے حسب ذیل مقامات سے ملتا ہے:

(۱) ابو سفیان کے جواب میں آپ نے جو خطبہ دیا۔ خطبہ ۵

(۲) حضرت عثمانؓ کے انتخاب اور چھ رکنی شوریٰ کی کارروائی پر آپ نے فرمایا۔ خطبہ ۷۲

(۳) مالک اشترؓ کے نام خط میں مسلح جدوجہد نہ کرنے کی آپ نے وضاحت کی۔ مکتوب ۶۲

(۸) حضرت عثمانؓ کی حکومت سے نالاں اور عثمانی حکام کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے لوگ قتل عثمانؓ کے بعد جلوس کی صورت میں حضرت علیؑ کے دروازے پر آئے اور یک زبان ہو کر کہا کہ خلافت کے لائق بس آپ ہی ہیں۔

(۹) حضرت علیؑ نے سماجی انصاف کے قیام اور طبقاتی نظام کے خاتمے کے لیے خلافت قبول کی تھی کیونکہ اس سے پہلے معاشرہ امیر اور غریب طبقات میں بٹ چکا تھا۔

(۱۰) حضرت علیؑ کی سیاسی حکومت کی چند خصوصیات یہ تھیں:

(الف) طبقاتی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ

(ب) سیاست میں سچائی

(ج) بے لاگ انصاف

(د) سماجی حقوق کی ادائیگی کا اہتمام

(ہ) ایفائے عہد

(و) بیت المال کی تقسیم میں مساوات

(ز) حکام کی کڑی نگرانی

(ح) لوگوں کی مشکلات معلوم کر کے انھیں حل کرنا

(ط) عوام سے براہ راست رابطہ

(۱۱) آپ نے خلیفہ بنتے ہی دو نکات پر خاص توجہ دی تھی:

(الف) عوام کی روحانی اور اخلاقی تربیت اور معارف الٰہی کا بیان

(ب) طبقاتی نظام کے خلاف جنگ

(۱۲) اقتدار کے پہلے دن ہی آپ نے مساوات کا اعلان کیا تھا جس کی وجہ سے اشرافیہ نے آپ کی مخالفت شروع کر دی اور اس کا باقاعدہ اظہار جنگ جمل کی شکل میں ہوا۔ جب طلحہ اور زبیر کے مالی مفادات خطرے میں پڑے اور آپ نے اُن کی خواہش پر انھیں کوفہ اور بصرہ کا حاکم نہ بنایا تو انھوں نے آپ کے خلاف طبل جنگ بجا دیا۔ جنگ جمل کے بعد معاویہ سے جنگ ہوئی جسے جنگ صفین کہا جاتا ہے۔ پھر خوارج سے نہروان کے مقام پر جنگ ہوئی۔

(۱۳) حضرت علیؑ نے اپنے کچھ اصحاب کے یہ دو مشورے اخلاقی طور پر قبول نہیں کیے:
(الف) بیت المال کی تقسیم میں عرب و عجم، آقا و غلام، قریشی وغیر قریشی کے فرق کو قائم رکھیں۔
(ب) سیاست کی بساط کو پر پیچ ہی رہنے دیں اور سچ کی سیاست سے گریز کریں۔

(۱۴) آپ اجتماعی معاملات میں کسی طرح کی رُو رعایت کے قائل نہ تھے مگر ذاتی معاملات میں درگزر سے کام لیتے تھے۔ آپ کی نظر میں وعدہ وفا کرنا ایک انسانی اور عمومی مسئلہ تھا۔

(۱۵) آپ کے بے لاگ انصاف اور عدل کی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کے جانی دشمن ہو گئے تھے اور انھوں نے آپ کے خلاف جنگ جمل اور جنگ صفین برپا کی تھیں۔ آخر میں جہالت و فکری جمود کا ہاتھ آستین سے نکلا جسے خوارج کا نام دیا گیا۔ آپ انہی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

(۱۶) آپ عمال کے نام اپنے خطوط میں انھیں حکم دیتے کہ عوام کی مشکلات کے ازالے کے لیے کھلی کچہریاں لگائیں اور اس میں ان کے مسائل حل کریں اور ایسی کچہریوں میں پولیس اور دیگر سرکاری حکام کو دور رکھیں تاکہ عوام کسی ڈر خوف کے بغیر اپنے مسائل بیان کر سکیں کیونکہ اُس قوم میں پاکیزگی نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا۔

(۱۷) آپ کی حکومت کے لیے پہلی مشکل حضرت عثمانؓ کا قتل تھا جو انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور وہ اُنھیں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ پھر ان انقلابیوں نے آپ کی بیعت کی تھی۔

(۱۸) آپ کی کچھ مشکلات کا تعلق ایک طرف سے تو آپ کی روش سے تھا (کیونکہ آپ بے لاگ انصاف کے قائل تھے اور کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتے تھے) اور دوسری طرف مسلمانوں کی جانب سے مرور زمانہ کے ساتھ پیدا ہونے والی تبدیلیاں تھیں۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد طبقاتی نظام وجود میں آچکا تھا اور اشرافیہ و امراء کا ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا جبکہ آپ طبقاتی نظام کے شدید مخالف تھے۔

(۱۹) آپ سیاست میں سچ کے قائل تھے۔ اس کی وجہ سے آپ کے دوستوں نے بھی آپ پر اعتراض کیا تھا۔

(۲۰) آپ نے کئی محاذوں پر جہاد کیا لیکن منافقت کے خلاف جنگ آپ کی زندگی کا مشکل ترین جہاد تھا۔ یہ کفر کے خلاف جہاد سے بھی زیادہ مشکل تھا کیونکہ منافق کے دو چہرے ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر اسلام کا اظہار کرتا ہے جبکہ اس کے باطن میں کفر چھپا ہوتا ہے۔
عوام کی نگاہیں ظاہر بین ہوتی ہیں اور وہ منافقین کو نہیں پہچان سکتیں۔

(۲۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ کے حالات میں یہ دو بنیادی فرق تھے:
(الف) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کافروں کے خلاف جنگ کی تھی جبکہ حضرت علیؑ کو اُن لوگوں سے

جنگ کرنا پڑی جو بظاہر مسلمان تھے مگر نفاق کے پردوں میں کفر کو چھپائے ہوئے تھے۔

(ب) (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) خلفاء نے لوگوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دی تھی جس کے نتیجے میں مقدس مآب اور خشک زاہدوں کا ایک گروہ منظر عام پر آیا۔ یہ گروہ اسلام کے ظواہر پر بہت زور دیتا تھا جبکہ اسلام کی روح سے سراسر نابلد تھا۔

(۲۲) خوارج ابتدا میں تو صرف حضرت علیؑ پر زبانی تنقید کرتے تھے۔ جب وہ آپ کے توبہ کرنے سے مایوس ہوگئے تو انھوں نے اپنی پالیسی تبدیل کردی۔ مجبور ہوکر آپ کو اُن سے مقابلہ کرنا پڑا۔ آپ نے انھیں دلائل کے ذریعے اُن کی غلطی کی طرف متوجہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بارہ ہزار مسلح افراد میں سے آٹھ ہزار افراد اپنی روش پر پشیمان ہوئے اور وہ خوارج کی جماعت سے الگ ہوگئے۔ پھر چار ہزار خوارج سے آپ کی جنگ ہوئی اور آپ نے اُن کا قلع قمع کردیا۔ اُن میں سے نو افراد زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور عبدالرحمان ابن ملجم بھی اُن میں شامل تھا۔

(۲۳) ابن ملجم نے خانۂ کعبہ میں حضرت علیؑ کو شہید کرنے کا عہد کیا اور اس نیت سے کوفہ آیا۔ یہاں وہ قطام پر فریفتہ ہوگیا جو اُس کی ہم مسلک تھی۔ ابن ملجم نے اُس کو نکاح کا پیغام دیا تو اُس نے قتل علیؑ کو اپنا مہر قرار دیا۔ حضرت علیؑ نے چار سال اور چند ماہ حکومت کی تھی۔ ۱۹ رمضان کی صبح ابن ملجم نے آپ پر تلوار کا کاری وار کیا جو کہ آپ کے سر اطہر پر لگا اور ۲۱ رمضان کو نصف شب کے قریب آپ کی روح مقدس عالم بالا کی طرف پرواز کرگئی۔

(۲۴) حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے دوران درج ذیل تین گروہوں سے جنگیں کی تھیں:

(الف) اصحاب جمل جنھیں ناکثین کہا جاتا ہے۔

(ب) اصحاب صفین جنھیں قاسطین کہا جاتا ہے۔

(ج) اصحاب نہروان جنھیں مارقین کہا جاتا ہے۔

(۲۵) ناکثین (جنگ جمل کے محرکین) دولت پرست لوگ تھے۔ یہ اسلام کے مساویانہ نظام کی بجائے طبقاتی نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کے عدل و مساوات پر دیئے گئے خطبات میں زیادہ تر مخاطب یہی لوگ تھے۔

(۲۶) قاسطین، سیاست دان اور منافقین پر مشتمل تھے۔ یہ لوگ اقتدار پرست تھے اور اقتدار پر قبضہ کرکے حضرت کی حکومت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے ساتھ جنگ دراصل نفاق کے خلاف جنگ تھی۔

(۲۷) مارقین یعنی خوارج ناجائز عصبیت رکھنے والے لوگ تھے۔ یہ لوگ بظاہر مقدس نظر آتے تھے جبکہ یہ بدترین جہالت میں مبتلا تھے۔

(۲۸) جب جنگ صفین اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوگئی اور حضرت علیؑ کی فتح یقینی نظر آنے لگی تو عین اُس وقت مارقین کا وجود منظر عام پر آیا۔

(۲۹) خوارج شیخین اور حضرت عثمانؓ و حضرت علیؑ کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے مگر اس کے ساتھ اُن کا یہ خیال تھا کہ حضرت عثمانؓ نے خلافت کے آخری چھ سالوں میں غلط روش اپنائی تھی جس سے مسلمانوں کے مصالح کو نقصان پہنچا تھا اور جب حضرت علیؑ نے تحکیم کو قبول کیا اور توبہ نہ کی تو انھوں نے کہا کہ حضرت علیؑ واجب القتل ہیں۔ یہ لوگ دیگر خلفاء سے بیزاری کا اعلان کرتے تھے اور ہمیشہ اُن سے برسرپیکار رہتے تھے۔

(۳۰) خوارج کی نفسیات میں جہاں تنگی تھی وہاں ان میں کچھ خوبصورتی بھی پائی جاتی تھی۔ اُن میں مثبت اور منفی دونوں پہلو موجود تھے:

(الف) یہ لوگ مجاہدانہ ذہنیت رکھتے تھے اور اپنے عقیدے پر مرمٹنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

(ب) یہ عابد و زاہد اور شب زندہ دار لوگ تھے اور دنیوی زیب و زینت سے نفرت کرتے تھے اور اسلام کے ظاہری احکام کے بڑے پابند تھے۔

(ج) یہ لوگ جاہل اور نادان تھے۔ وہ اپنی جہالت و حماقت کی وجہ سے حقائق کو برا خیال کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کی کج فکری نے باقاعدہ ایک مذہب کی صورت اختیار کرلی تھی۔

(د) یہ انتہائی تنگ نظر تھے۔ یہ لوگ انتہائی درجے کی کج فکری میں مبتلا تھے اور اسلام کو اپنی کج فکری کے دائرے میں محدود سمجھتے تھے۔

(۳۱) جب تک دنیا میں خوارج رہے اُس وقت تک ائمہ اطہارؑ کے علاوہ کسی کو حضرت علیؑ کی قبر مطہر کا نشان معلوم نہیں تھا۔ جب یہ لوگ ختم ہوگئے اور بنی امیہ کی حکومت بھی رخصت ہوگئی تو امام جعفر صادقؑ نے حضرت علیؑ کی قبر مطہر کی نشاندہی کی۔

maablib.org

پانچواں باب

ائمہ طاہرینؑ بنی امیہ کے دور میں

امَوی حکومت کی خصوصیات اور سیاسی روش

صلح امام حسنؑ اور اس کے اسباب و نتائج

قیام عاشورا اور اس کے اسباب و نتائج

امام سجادؑ اور امام باقرؑ کی حیاتِ مبارکہ

اموی حکومت کی خصوصیات اور سیاسی روش

تمہید

رسول اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں بنی امیہ کو کوئی کلیدہ عہدہ نہیں دیا تھا۔ آپ کی رحلت کے بعد بنی امیہ نے آہستہ آہستہ اسلامی دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ حضرت عمرؓ سے ایک تاریخی اور سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ اُنھوں نے یزید بن ابوسفیان کو شام کا حاکم مقرر کیا۔ یزید کے مرنے پر معاویہ کو شام کا حاکم بنایا گیا اور وہ بیس برس یعنی حضرت عثمانؓ کے قتل تک شام کا حاکم رہا۔ اُس وقت کے شام میں موجودہ شام، لبنان، فلسطین اور ترکی شامل تھے۔ یوں بنی امیہ کو اسلامی سیاست میں قدم جمانے کا بھرپور موقع ملا۔[۱]

حضرت عمرؓ کسی حاکم کو زیادہ عرصہ ایک جگہ تعینات نہیں رکھتے تھے۔ وہ حکام کا تبادلہ کرتے رہتے تھے اور بعض کو معزول کر دیتے تھے مگر یہ بات آج تک ایک تاریخی معمہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی خلافت کے دوران معاویہ کو نہ تو عہدے سے معزول کیا اور نہ ہی اُس کا دوسری جگہ تبادلہ کیا۔[۲]

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے۔ اگرچہ وہ ذہنی اعتبار سے دیگر بنی امیہ سے مختلف تھے (اُن میں اور ابوسفیان میں کافی فرق تھا) پھر بھی وہ اول و آخر اُموی ہی تھے۔ اُن کے خلیفہ بننے سے دنیائے اسلام میں بنی امیہ کو پاؤں پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اُنھوں نے مصر، عراق (کوفہ و بصرہ) جیسے اہم مقامات بنی امیہ کے اختیار میں دے دیے حتیٰ کہ طرید رسولؐ مروان بن حکم کو اپنا چیف سکریٹری بنا لیا۔ ان مناصب پر فائز ہونے کے بعد بنی امیہ نے اپنے مقاصد کی طرف پیش قدمی کی۔ معاویہ نے اس دوران اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم بنایا۔ حضرت عثمانؓ کی زندگی میں معاویہ کے پاس دو طاقتیں تھیں۔ پہلی طاقت کلیدی ''سیاسی'' عہدوں کی اور دوسری بیت المال کی ''اقتصادی'' قوت کی۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد معاویہ کے ہاتھ تیسری قوت بھی آگئی۔ اُس نے اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کا وارث ظاہر کیا اور اُن کی مظلومیت کا واویلا مچایا تو بہت سے دینی اور مذہبی

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۶۳ ـ ۲۶۵۔ ج ۳، ص ۱۶ ـ ۱۷

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۱۶

گروہوں (کم از کم شام کی حد تک) کی حمایت بھی اُسے حاصل ہوگئی۔[1]

اس تمہیدی گفتگو میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی نو تشکیل معاشرہ کبھی بھی مکمل طور پر متحد اور متفق نہیں ہوتا اگرچہ عوامل وحدت کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔[2]

فطری سی بات ہے کہ جس معاشرے میں مختلف نسلوں، عادتوں اور طبیعتوں کے لوگ رہتے ہوں جنھوں نے مختلف اخلاق و آداب اور عقائد کے سائے میں پرورش پائی ہو اُس معاشرے کے تمام افراد کی ایک نہج پر دینی تربیت نہیں ہوسکتی لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اساس پر وجود میں آنے والے معاشرے کو کئی صدیوں تک ایک خاص رژیم کے ماتحت رکھنا آسان کام نہیں ہے۔[3]

جب تک رسول اکرم ﷺ زندہ رہے بنی امیہ کے ضعیف الایمان، مؤلفۃ القلوب یا منافق افراد اسلامی معاشرے میں پاؤں نہ جما سکے لیکن افسوس آپ کے بعد اُنھوں نے تدریجاً کلیدی مناصب حاصل کر لیے خصوصاً حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بنی امیہ بیت المال اور کلیدی مناصب پر براجمان ہوگئے[4] اور اُنھوں نے اسلامی مملکت کے تمام وسائل اپنے قبضے میں لے لیے۔ چنانچہ معاویہ کے اسلامی خلافت و روحانیت پر تسلط کا بھی راز تھا۔ اس کے کچھ دیگر عوامل بھی تھے جو درج ذیل ہیں:

(۱) ان لوگوں کی ذہانت و فطانت

(۲) سابق خلفاء کی غلط پالیسیاں جن کی وجہ سے بنی امیہ کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا

(۳) عوام کی سادہ لوحی اور نادانی[5]

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۶۵

۲۔ کیا یہاں یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ فتوحات کے سلسلے میں اتنی تیزی نہ دکھائی جاتی تو بہتر ہوتا۔ اگر مسلمان صبر کر لیتے تو اسلام طبیعی طور پر خود بخود قریبی علاقوں میں پھیل سکتا تھا۔ اس جلد بازی کی وجہ سے بہت سے اختلافات نے جنم لیا۔ رسول اکرمؐ نے بھی یہ وصیت نہیں کی تھی کہ میرے بعد تم فتوحات شروع کر دینا۔ یہ سچ ہے کہ فتوحات کا ذائقہ انتہائی شیریں ہوتا ہے لیکن عقل اس کی تائید نہیں کرتی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت علیؑ خلیفہ ہوتے تو کیا وہ فتوحات کو درست قرار دیتے یا نہیں؟ یا پھر داخلی اصلاح پر توجہ دیتے۔ فتوحات کی وجہ سے فاتح عربوں کا اُخلاق تباہ ہوا۔ چنانچہ فتوحات میں جلد بازی کی وجہ سے ایک نامناسب معاشرہ وجود میں آیا جس نے عربوں کی اُخلاقی حالت کو تباہ کر دیا تھا۔

۳۔ گستاولیبان نے اپنی کتاب "تطور عقائد ملل" میں نفسیاتی تبدیلی کا تدریجی ہونا قرار دیا ہے۔

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۲۰۔ ۲۲

۵۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۲۳۔ ۲۴

بنی امیہ کے متعلق حضرت علیؑ کی پیش گوئی

امیرالمومنینؑ نے بنی امیہ کے ظلم و استبداد اور چیرہ دستیوں کی پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

(۱) آج تمھیں میری حکومت میں جو عدل و مساوات میسر ہے بنی امیہ کی حکومت میں اس کا نام و نشان تک تمھیں نہ ملے گا۔[۱] اسلامی مساوات کو مکمل طور پر پامال کر دیا جائے گا۔ اسلام کی وجہ سے ہر شخص کو جو مساوات حاصل ہوئی تھی بنی امیہ کے دور میں اُس کا کہیں وجود تک نہ ہوگا اور انسانوں کو آقا و غلام کے طبقات میں تقسیم کر دیا جائے گا اور تم لوگ عملی طور پر اُن کے غلام بن کر رہ جاؤ گے۔ حَتّٰی لَا یَکُوْنَ انْتِصَارُ اَحَدِکُمْ مِنْهُمْ اِلَّا کَانْتِصَارِ الْعَبْدِ مِنْ رَبِّهٖ تمہارے لیے اُن سے داد خواہی ایسی ہی مشکل ہو جائے گی جیسے غلام کے لیے اپنے آقا سے۔[۲]

(حضرت کی یہ پیش گوئی اُس وقت پوری ہوئی جب) مسلم بن عقبہ نے واقعۂ حرہ کے بعد اہل مدینہ سے اس شرط پر بیعت لی کہ تم یزید کے غلام ہو اور وہ تمہارا آقا ہے۔[۳]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی امیہ کے متعلق یہ پیش گوئی فرمائی تھی: اِذَا بَلَغَ بَنُو الْعَاصِ اِتَّخَذُوا مَالَ اللّٰهِ دُوَلًا وَ عِبَادَ اللّٰهِ خَوَلًا وَ دِیْنَ اللّٰهِ دَخَلًا[۴] جب اولاد عاص (مروان بن حکم اور اموی خلفاء کا مورث اعلیٰ) کی تعداد تیس ہو جائے گی تو یہ اللہ کے مال کی بندر بانٹ کریں گے، بندگانِ خدا کو اپنا غلام بنا لیں گے اور خدا کے دین میں دخل اندازی کریں گے۔[۵]

(۲) امیرالمومنینؑ نے فرمایا تھا کہ بنی امیہ تمہارے نیک، ذہین اور روشن فکر افراد کو قتل کریں گے۔ چنانچہ جس بھی سر میں دماغ ہوگا اور دماغ میں کچھ روشنی ہوگی اُسے تن سے جدا کر دیں گے۔

آپ نے فرمایا تھا: خدا کی قسم![۶] میرے بعد تم بنی امیہ کو اپنے لیے بدترین حکمران پاؤ گے۔ وہ تو اُس بوڑھی اور سرکش اونٹنی کے مانند ہیں جو منہ سے کاٹتی ہو اور اِدھر اُدھر پیر مارتی ہو اور دوہنے والے پر ٹانگیں چلاتی ہو اور دودھ دینے سے انکار کر دیتی ہو۔ وہ برابر تمہارا قلع قمع کرتے رہیں گے یہاں تک کہ صرف اُسے چھوڑیں گے جو اُن کے مفید مطلب ہو یا کم از کم اُن کے لیے نقصان رساں نہ ہو اور اُن کو مصیبت اس طرح گھیرے رہے گی کہ ان سے داد خواہی ایسی مشکل ہو جائے گی جیسے غلام کے لیے اپنے آقا سے مشکل ہوتی ہے۔

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۲۷

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۹۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۶۷۔ بحار الانوار ج ۳۳، ۶۰۸۔ ج ۷۷، ۲۶۰

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۲۷

۴۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸

۵۔ مجموعہ آثار ج ۲، ص ۱۳۶

۶۔ مجموعہ آثار ج ۲، حاشیہ ص ۵۳ ۔ ۵۴

(۳) حضرت علیؑ نے بنی امیہ کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کے دور میں احکام اسلام کی حرمت ختم ہو جائے گی۔ ان کے دور میں ہر حرام حلال ہو جائے گا۔

وَاللّٰهِ لَا يَزَالُوْنَ حَتّٰى لَا يَدَعُوا لِلّٰهِ مُحَرَّمًا إِلَّا اسْتَحَلُّوْهُ وَلَا عَقْدًا إِلَّا حَلُّوْهُ وَحَتّٰى لَا يَبْقٰى بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا دَخَلَهُ ظُلْمُهُمْ (وَنَزَلَ بِهِ عَيْثُهُمْ) وَنَبَا بِهِ سُوْءُ رَعْيِهِمْ...[1]

خدا کی قسم! وہ ہمیشہ یونہی ظلم ڈھاتے رہیں گے اور کوئی اللہ کی حرام کی ہوئی چیز ایسی نہ ہوگی جسے وہ حلال نہ سمجھ لیں گے اور ایک بھی عہد و پیمان ایسا نہ ہوگا جسے وہ توڑ نہ ڈالیں گے یہاں تک کہ کوئی اینٹ پتھر کا گھر اور اون کا خیمہ اُن کے ظلم کی زد سے محفوظ نہ رہے گا اور اُن کی بری طرز نگہداشت سے لوگوں کا اپنے گھروں میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔

(آپ کی پیش گوئی پوری ہو کر رہی چنانچہ) جب عبداللہ بن حنظلہ شام جا کر آیا تو اُس نے کردار یزید کے متعلق یہ گواہی دی: "ہم اُس کے پاس سے ہو کر آرہے ہیں جو اپنی ماؤں بہنوں سے شادی رچاتا ہے۔ يَنْكِحُ الْأُمَّهَاتِ وَالْأَخَوَاتِ

(۴) حضرت علیؑ نے بنی امیہ کے متعلق یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ یہ لوگ اسلامی تعلیمات میں رد و بدل کریں گے اور غیر اسلامی افکار کو اسلام میں رائج کریں گے[2] اور ان کے دور میں اسلام اس بھرے ہوئے برتن کی مانند ہو جائے گا جسے الٹا دیا گیا ہو اور اس سے سارا محلول بہہ گیا ہو۔ اسلام کے کچھ احکام ایسے بھی ہیں جو دوسرے احکام کے لیے ظرف کی مانند ہیں۔ ایسے احکام کی مثال پانی کی سی ہے جس کے لیے ظرف کا ہونا ضروری ہے اگر ظرف ہوگا تو پانی ضائع نہ ہوگا اور اگر ظرف میں پانی نہ رہے تو ظرف کا فائدہ ہی نہیں ہے۔

امیر المومنینؑ نے ظرف کی مثال دے کر دراصل یہ پیغام دیا تھا کہ بنی امیہ اسلام کو کھوکھلا کر دیں گے اسلام کا مغز نکال لیں گے اور لوگوں کے لیے خالی چھلکا رہنے دیں گے۔[3]

اموی حکومت کی خصوصیات اور سیاسی روش

دور حاضر کے وہ محققین جو اُصول عمرانیات سے آگاہ ہیں وہ ایک نکتے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ سنی محقق عبداللہ علائلی کہتے ہیں: دوسرے عرب قبائل کے برعکس بنی امیہ صرف ایک قبیلہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک منظم پارٹی کی طرح کام کرتے تھے۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۹۸

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۲۸۔ ج ۱، ص ۲۶۸

۳۔ اسلام مقتضیات زمان ج ۱، ص ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ج ۳، ص ۲۷

گزشتہ مؤرخین نے بنی امیہ کو چالاک اور شیطان صفت لکھا ہے اور آج اس کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ وہ گروہ تھا جسے ظہور اسلام سے دوسروں کی نسبت زیادہ خطرہ محسوس ہوا اور اُنھوں نے اسلام کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا تھا۔ اُنھوں نے اپنی پوری طاقت سے اسلام کے خلاف جنگیں لڑی تھیں۔ پھر جب مکہ فتح ہوا تو اُنھیں یقین ہوگیا کہ اب اسلام سے جنگ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا وہ ظاہری طور پر اسلام لے آئے۔ حضرت عمارؓ نے اُن کے متعلق کہا تھا مَا اَسْلَمُوْا وَلٰکِنِ اسْتَسْلَمُوْا... یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے البتہ اسلام کے سامنے سرنگوں ہو گئے تھے۔[۱]

(۲) نسلی اور طبقاتی تفریق

ہم جانتے ہیں کہ بنی امیہ نے ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک تقریباً ایک صدی عالم اسلام پر حکومت کی تھی۔[۲] اس پورے عرصے میں معاویہ اور بنی اُمیہ نے اسلام کے دو اُصولوں کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ اُنھوں نے عالم اسلام میں نسلی امتیاز کو فروغ دیا اور عربوں کو غیر عرب اقوام پر ترجیح دی۔ دوسرا کام اُنھوں نے یہ کیا کہ معاشرے کو امیر اور غریب طبقات میں تقسیم کر دیا جس نتیجے میں ایک طرف عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر جیسے لوگ دولت مند ہوگئے اور دوسری طرف نان شبینہ کا محتاج طبقہ وجود میں آیا۔[۳]

(۳) جاہلی ادب کا احیاء

اُموی حکومت کی ایک اور خصوصیت اشعار بالخصوص جاہلی اشعار کا فروغ تھا۔ اُنھوں نے زمانہ جاہلیت کی ثقافت کے احیاء کے لیے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ ان اشعار میں حکمت مضمر ہے البتہ حکیمانہ اشعار سے استشہاد کرنا کوئی بری بات نہیں لیکن معاویہ کے اس قول کی ہرگز تائید نہیں کی جاسکتی کہ اِجْعَلُوا الشِّعْرَ اَکْبَرَ هَمِّکُمْ (شعرگوئی کو ترجیح دو) معاویہ کی یہ سوچ انتہائی خطرناک تھی کیونکہ حکیمانہ اور فحش اشعار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔[۴]

(۴) تحریف حدیث اور وضع حدیث

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ مطلق العنان خلیفہ بن گیا اور تمام اختیارات اُس کے ہاتھ میں

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۶۳ ۔ ۲۶۴

۲۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۵۸۴

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۲۴ ۔ ص ۲۴ ۔ ۳۰ اور ۷۶ ۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۵۸۴

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۷۶ ۔ ۷۸

مرتکز ہو گئے۔ اُس نے علماء کو اپنا مزدور بنایا اور حضرت عثمانؓ اور شیخین کی فضیلت میں احادیث گھڑنے کا حکم جاری کیا۔[۱] معاویہ سمجھتا تھا کہ اس طرح کی جعلی احادیث کا فروغ اُس کے لیے فائدہ مند اور حضرت علیؑ کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کام پر اُس نے بھاری رقم خرچ کی تھی۔[۲]

(۵) حضرت علیؑ پر سب وشتم

معاویہ نے اپنے دورِ حکومت میں ہمیشہ حضرت علیؑ کی فکر کا مقابلہ کیا۔[۳] جب حضرت علیؑ کی شہادت ہوئی اور معاویہ پورے عالم اسلام کا بلا شرکت غیرے حکمراں بنا تو اُس نے سمجھا کہ وہ حضرت علیؑ شہادت کے بعد اپنی پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ جمعہ اور عیدین کے خطبات میں منبر سے حضرت علیؑ پر سب وشتم کیا جائے۔

(۶) شیعیانِ علیؑ کا قتل

معاویہ نے حضرت علیؑ کے مخلص دوستوں کو قتل کرایا۔[۴] اُس نے حکم دیا کہ جس آدمی پر علیؑ کے شیعہ ہونے کا شبہ ہو اُسے گرفتار کر لیا جائے اور ہر قیمت پر حضرت علی کے فضائلؑ بیان کرنے پر پابندی عائد کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو حضرت علیؑ کی مذمت میں احادیث وضع کی جائیں اور وضعی احادیث میں بنی امیہ کی تعریف کی جائے۔ اُس نے حجر بن عدی اور عمرو بن حمق خزاعی کو محبت علیؑ کے جرم میں شہید کرایا اور اگر کوفہ میں میثم تمار اور رُشید ہجری کو ابن زیاد نے قتل کرایا تو اُس نے یہ سب کچھ معاویہ کے وضع کردہ اُصول کے مطابق کیا تھا...[۵]

۱۔ معاویہ نے سمرہ بن جندب کو آٹھ ہزار دینار رشوت دے کر کہا کہ تم یہ حدیث بتاؤ کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا تھا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ کی آیت حضرت علیؑ کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کی شان میں نازل ہوئی تھی۔ (اسلام و مقتضیات زمان ج ۱، ص ۱۳۱ علاوہ ازیں اُس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث يَا عَمَّارُ تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ میں بھی تحریف کرائی تھی۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۶۷ ـ ۶۹)

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۶۶ ـ ج ۳، ص ۲۲ ـ اسلام و مقتضیات زمان ج ۱، ص ۱۳۰ ـ ۱۳۱

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۶۹

۴۔ معاویہ نے اپنے مخالفین کو زہر دے کر قتل کرنے کو رواج دیا تھا۔ بعد میں آنے والے خلفاء نے بھی اُس کی پیروی کی تھی۔ معاویہ نے امام حسنؑ، مالک اشترؒ، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کو جو اُس کا بہترین دوست تھا، زہر دے کر قتل کرایا تھا۔ (حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۹، ۱۱۹)

۵۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۲۵

(۷) اسلامی شخصیت کو مٹانا

بنی امیہ نے مسلمانوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ اُن کی بہادری اور جواں مردی ختم ہوگئی اور وہ احساس کمتری کا شکار ہوتے گئے۔

کوفہ اسلامی فوج کا مرکز تھا لیکن اہل کوفہ کی بزدلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جیسے ہی اُنھوں نے ابن زیاد کو دیکھا تو سب کے سب بھاگ گئے۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن زیاد کئی برسوں تک کوفہ کا گورنر رہا تھا۔ اُس نے اہل کوفہ کی آنکھیں نکلوائی تھیں، اُن کے ہاتھ پاؤں کٹوائے تھے، پیٹ پھڑوائے تھے اور اُنھیں زندانوں میں ڈالا تھا اور بہت سوں کو زندانوں میں ہی تہ تیغ کرایا تھا۔

ان تمام مظالم کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے دلوں سے غیرت وحمیت ہی رخصت ہوگئی لہٰذا جیسے ہی اُنھیں پتا چلا کہ ابن زیاد آگیا ہے تو بیوی نے شوہر کا ہاتھ پکڑا، ماں نے بیٹے کا ہاتھ تھاما، بہن نے بھائی کا ہاتھ پکڑا اور باپ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور مسلم کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

اہل کوفہ نے ہی امام حسینؑ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی اور اُنھوں نے ہی آپ کو شہید کیا تھا۔ اُس دور میں یہ ضرب المثل سامنے آئی قُلُوبُهُمْ مَعَهُ وَسُيُوفُهُمْ عَلَيْهِ ان کے دل امام حسینؑ کے ساتھ تھے اور اُن کی تلواریں امام حسینؑ کے خلاف تھیں۔[۱]

بنی امیہ نے مسلمانوں کو بے حمیت اور پست ہمت بنا دیا تھا۔ اسی لیے افراد ملت کے دلوں سے احساسات ختم ہو کر رہ گئے تھے۔[۲]

(۸) اسلام کو مٹانے کی کوششیں

بنی امیہ بالخصوص ابوسفیان کو اسلام اور قرآن سے دو وجوہات کی بنا پر سخت دشمنی تھی۔

(۱) نسلی رقابت جو مسلسل تین نسلوں سے جاری تھی۔

(۲) اسلامی قوانین اور قریش کے قوانین میں سخت تضاد پایا جاتا تھا۔ اسلامی قوانین بنی امیہ کی روش سے متصادم تھے۔ قرآن نے اسے قریش کی مخالفت کی اصل وجہ قرار دیا ہے۔[۳]

علاوہ بریں بنی امیہ کے مزاج اور اُن کی طینت میں مفاد پرستی اور مادہ پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی

۱۔ مقرم، مقتل الحسینؑ ص ۳۰۲۔ تاریخ طبری ج ۶، ص ۲۱۸۔ ابن اثیر، کامل ج ۶، ص ۱۶۔ شیخ مفید، الارشاد ص ۲۱۸۔ ابن شہر آشوب، مناقب ج ۴، ص ۱۹۵۔ کشف الغمہ ج ۲، ص ۳۲

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۷۰۔ ۱۷۱

۳۔ سورۂ سبا، سورۂ زخرف، سورۂ واقعہ، سورۂ مومنون اور سورۂ ہود

تھی اور اس طبیعت کے لوگوں پر الٰہی تعلیمات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔[۱]

معاویہ نے اپنے ایک گورنر مغیرہ بن شعبہ سے کھل کر کہا تھا کہ میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کو دفن کر کے رہوں گا۔ معاویہ کی اس رازدارانہ گفتگو کو مغیرہ کے بیٹے مطرف نے فاش کیا تھا۔[۲]

(۹) خلافت کو ملوکیت میں بدلنا

حضرت عثمانؓ کی حکومت میں اموال و مناصب کو غصب کرنے کی رسم پڑ گئی۔ معاویہ کی حکومت میں حضرت علیؑ پر لعنت اور سب و شتم کو رواج دیا گیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ باندھ کر خلافت کو ملوکیت[۳] میں بدل دیا گیا اور نسل پرستی کو فروغ دیا گیا۔

پھر یزید برسر اقتدار آیا تو اُس کی حکومت، اسلام اور مسلمانوں کے لیے کلنک کا ٹیکا ثابت ہوئی۔[۴]

عباس محمود عقاد لکھتے ہیں کہ معاویہ چاہتا تھا کہ یزید کو اپنے بعد خلیفہ بنا کر خلافت کو اُموی سلطنت میں بدل دے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور ممکن ہے یزید کو خلیفہ مقرر کرنے سے پہلے مر جائے چنانچہ اُس نے مروان بن حکم کو خط لکھا کہ تم یزید کے لیے لوگوں سے بیعت لو۔ مروان خود خلافت کا امیدوار تھا لہٰذا اُس نے معاویہ کا حکم نہیں مانا بلکہ الٹا لوگوں کو یزید کے خلاف اُکسانا شروع کر دیا۔ تب معاویہ نے مروان کو عہدے سے ہٹا دیا اور سعید بن عاص کو حاکم بنایا اور اسے حکم دیا کہ وہ یزید کے لیے لوگوں سے بیعت لے۔

سعید بن عاص نے "بیعت مبہم" کا آغاز کیا لیکن کسی نے بھی اُس کی حمایت نہ کی۔ پھر معاویہ نے امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن جعفر کو خطوط بھیجے اور سعید کو حکم دیا کہ وہ ان سے جواب لکھوا کر اُس

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۱۹ ۔ ۲۰

۲۔ مسعودی، مروج الذہب ج ۳، ص ۴۵۳ ماخوذ از مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۱۷۳ ۔ ۱۷۵

۳۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے تو ان کے گھر میں ابوسفیان نے بنی امیہ سے کہا تھا: يَا بَنِي أُمَيَّةَ تَلَقَّفُوهَا تَلَقُّفَ الْكُرَةِ: أَمَا وَالَّذِي يَحْلِفُ بِهِ أَبُو سُفْيَانَ مَا زِلْتُ أَرْجُوهَا لَكُمْ وَلَتَصِيرَنَّ إِلَى صِبْيَانِكُمْ وِرَاثَةً اے بنی امیہ! اب خلافت کو اپنے درمیان گیند کی طرح اچھالو۔ اُس کی قسم جس کی قسم ابوسفیان کھایا کرتا ہے میں تو ہمیشہ سے تمہارے لیے اس منصب کی امید کیا کرتا تھا۔ اب تم اس منصب کو وراثت بنا کر اپنے بچوں میں منتقل کر دو۔

ابوسفیان کی یہ آرزو پوری ہوئی، ابتدا میں تو معاویہ کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ آرزو پوری ہو سکے گی جبکہ امام حسینؑ نے بہت پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ لوگ گیند کی طرح خلافت سے کھیلنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ منصب خلافت کو موروثی حق بنا کر اپنے لڑکوں کو اس عہدے پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ جب بنی امیہ نے خلافت کو موروثی حق میں تبدیل کیا تو امام عالی مقام نے سخت مزاحمت کی۔ (حماسۂ حسینی ص ۲۹)

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۳۰

کے پاس بھیج دے (لیکن کسی نے بھی اُس کو جواب دینا مناسب نہ سمجھا)۔

سعید نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح عوام کو اور خاص طور پر مذکورہ شخصیات کو یزید کی بیعت کے لیے راضی کرے (لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی)۔

معاویہ (ظاہراً) مکہ کے ارادے سے نکلا (مگر در پردہ اُس کا مقصد یزید کے لیے بیعت لینا تھا)۔ وہ پہلے مدینہ آیا اور اُس نے ان سرکردہ افراد کو اپنے پاس بلایا اور اُنھیں نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کی (لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچا)۔ پھر وہ غصے میں کہنے لگا کہ اگر تم میں سے کسی نے میری بات کی تردید کی تو میرے جواب دینے سے پہلے تلوار سے اُس کی گردن کاٹ دی جائے گی۔ پھر اُس نے پولیس کے سربراہ کو طلب کر کے ہدایت دی کہ ان میں سے ہر شخص کے پاس دو دو مسلح سپاہی کھڑے کردو اور جب میں منبر پر تقریر کروں اور ان میں سے کوئی میری تکذیب یا تصدیق کے لیے زبان کھولے تو فوراً اُس کا کام تمام کردو۔

مذکورہ انتظامات کے بعد معاویہ منبر پر گیا اور اُس نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد کہا:

یہ مسلمانوں کے بزرگ اور نیک جماعت کے سرکردہ افراد ہیں۔ کوئی بھی کام ان کے مشورے کے بغیر انجام نہیں پاتا اور ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام کرنا بھی نہیں چاہیے۔ ان سب بزرگوں کا خیال ہے کہ یزید کی بیعت ہونی چاہیے اور یہ لوگ خود بھی بیعت کر چکے ہیں۔[1]

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۱۲۶ ۔ ۱۲۸ ۔ ج ۲، ص ۱۷ ۔ ۱۸

صلح امام حسنؑ اور اس کے اسباب و نتائج

امام حسنؑ ۱۵ رمضان ۳ھ کو مدینہ منورہ[۱] میں پیدا ہوئے اور دس سالہ مدت امامت کے بعد ۴۸ برس کی عمر میں ۲۸ صفر ۵۰ھ[۲] کو شہید کر دیئے گئے۔ آپ کی ایک بیوی جعدہ بنت اشعث بن قیس نے معاویہ کے ایماء پر آپ کو زہر دیا جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی اور آپ قبرستان بقیع میں مدفون ہوئے۔

آپ کی سیاسی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں آپ نے شرکت کی تھی۔ آپ کا انفرادی و اجتماعی کردار انسانیت کی رہگذر پر چلنے والوں کے لیے بےنظیر رہنما ہے۔

آپ کی چند خصوصیات یہ تھیں:

(۱) عبادت کے باب میں آپ کا رخ انور تاریخ بشریت کے ماتھے کا جھومر ہے۔

(۲) آپ کی سخاوت اور عفو و درگزر کے متعدد واقعات مورخین بیان کرتے آئے ہیں۔

(۳) آپ کی اعلیٰ صفات میں حلم و بردباری اور ریا سے دوری اور آپ کے تقویٰ کو اہم مقام حاصل ہے۔

(۴) دینی حوالے سے آپ نے امامت کی ذمے داریاں نبھائیں اور آپ نے لوگوں کو کتابت حدیث کی ترغیب دی۔

(۵) جب معاویہ کسی دینی مسئلے کا جواب نہ دے پاتا تو آپ اُس کا جواب دیتے تھے اور وہ ایسے مسائل ہوتے تھے جن کے جواب سے محدثین اور درباری علماء عاجز ہوتے تھے۔[۳]

تاریخ اسلام بیان کرتی ہے کہ مخصوص شرائط اور حالات میں مسلمانوں کے پیشوا کے لیے صلح کرنا جائز ہے جبکہ بعض مقامات پر صلح واجب ہوجاتی ہے۔

حضرت رسول اکرم ﷺ نے بھی کئی بار صلح کی تھی۔ آپ نے صرف اہل کتاب کے ساتھ نہیں بلکہ

۱۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۵

۲۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۱۵۔ کچھ روایات میں آیا ہے کہ آپ کی شہادت ماہ ربیع الاول ۴۹ھ میں ہوئی تھی جبکہ کچھ مورخین نے آپ کی شہادت ربیع الاول ۵۰ھ تحریر کی ہے۔ (انساب الاشراف ج ۳، ص ۶۶)

۳۔ یاد ایام ج ۲۔ شورای سیاست گزاری ائمہ جمعہ ص ۸۰، ۸۲

مشرکین کے ساتھ بھی صلح کی تھی۔ آپ نے مخالفین سے کبھی صلح کی تھی تو کچھ مواقع پر جنگ کی تھی۔ دنیا میں بہت سی ایسی جنگیں ہوئی ہیں جو مکمل صلح کا ذریعہ ثابت ہوئی تھیں اور ایسی صلح بھی ہوئی ہیں جنھوں نے کامیاب جنگ کے لیے زمین ہموار کی تھی۔ اب ہم اس نکتے پر بحث کرتے ہیں کہ[1] امام حسنؑ کے زمانے میں حالات کیسے تھے اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ آپ نے کن شرائط پر معاویہ سے صلح کی تھی جبکہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپ نے مجبور ہوکر صلح کی تھی۔ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ امام حسنؑ کے زمانے کی شرائط میں اور امام حسینؑ کے زمانے کی شرائط میں کیا فرق تھا جس کی وجہ سے امام حسینؑ نے صلح نہیں کی۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے زمانے کا فرق

(۱) مسند خلافت۔ دونوں بھائیوں کے زمانے میں ایک واضح فرق یہ تھا کہ امام حسنؑ مسند خلافت پر متمکن تھے اور معاویہ کی حیثیت ایک عامل سے زیادہ نہ تھی۔ اُس وقت معاویہ نے خلافت کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا اور لوگ بھی اُسے "امیرالمومنین" کہہ کرنہیں پکارتے تھے۔ امام حسنؑ کی حیثیت اُس خلیفۃ المسلمین کی تھی جس کے خلاف ایک باغی گروہ نے بغاوت کر رکھی ہو اور اگر اس حالت میں آپ باغی فوج کے ہاتھوں شہید ہوجاتے تو یہ مرکز خلافت کی شکست ہوتی اور اگر آپ آخری لمحات تک مزاحمت جاری رکھتے تو آپ کی مزاحمت حضرت عثمانؓ کی مزاحمت کی مانند ہوتی جبکہ امام حسینؑ کی حیثیت حکومت مخالف احتجاج کرنے والے کی تھی۔[2] اگر آپ اس جدوجہد میں شہید ہو جاتے (اور آپ شہید بھی ہوگئے) تو آپ کی شہادت افتخار آمیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے قیام کو تاریخ میں افتخار آمیز اور جرأت مندانہ قیام قرار دیا گیا ہے۔

(۲) جنگ کا بے نتیجہ ہونا۔ حسنین کریمینؑ کے اقدامات میں ایک فرق یہ بھی تھا کہ عراقی یعنی کوفی فوج کمزور ہو چکی تھی لیکن اتنی کمزور بھی نہ تھی کہ اُن کا ادارہ ہی ختم ہوگیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو معاویہ بزور طاقت پورے عراق کو فتح کر لیتا۔ کوفہ کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ یہاں خوارج کا گروہ[3] پیدا ہو چکا تھا جنھیں امیرالمومنینؑ سابقہ

۱۔ شیخ راضی آل یاسین کی عربی کتاب صلح الحسنؑ کا سید علی خامنہ ای نے صلح امام حسنؑ پر شکوہ ترین نرمش قہرمانانہ تاریخ کے نام سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ (مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۹۲ ـ ۱۳۹)

۲۔ فی الوقت میں یہ بحث نہیں کر رہا کہ امام حسینؑ نے اثبات حق کے لیے تحریک چلائی تھی اور امام حسنؑ خلیفہ برحق تھے جبکہ آپ کا مخالف باطل پر تھا۔ میں صرف اجتماعی پہلو پر گفتگو کر رہا ہوں۔

۳۔ شیخ مفید لکھتے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰؑ کی فوج میں حسب ذیل قسم کے عناصر شامل تھے۔ (۱) امیرالمومنینؑ کے مخلص شیعہ (۲) خوارج (۳) دنیا طلب افراد (۴) شکی مزاج اور دو غلے افراد (۵) ایسے لوگ جو صرف قبائلی عصبیت اور سردار قبیلہ کی خوشنودی کے لیے جنگ میں شامل ہوئے تھے۔ (شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۱۰ ـ ۱۱)

خلفاء کی بیجا فتوحات کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔

حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ اگر امام حسنؑ جنگ کرتے تو آپ کی فوج شکست کھا جاتی اور یہ بات دانش مندی کے خلاف تھی کہ امام دشمن سے دو تین سال جنگ کرتے جس میں فریقین کے لاکھوں افراد کھیت رہتے اور نتیجہ آپ کی شکست کی صورت میں نکلتا یا دونوں لشکر تھک ہار کر اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جاتے یا آپ مغلوب ہو کر شہید ہو جاتے۔ اس لیے آپ نے جنگ کو بے نتیجہ سمجھ کر صلح کی تھی جبکہ امام حسینؑ کے پاس بہتر ساتھی تھے اس کے باوجود آپ نے انھیں واپس جانے کی اجازت بھی دی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں بھائیوں کے حالات میں بڑا فرق تھا۔ قیام امام حسینؑ کے تین بنیادی اسباب تھے۔ جب ہم ان تینوں اسباب کو دیکھتے ہیں تو امام حسن مجتبیٰؑ کے زمانے میں ان کی نوعیت بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

(۳) مسئلہ بیعت۔ امام حسینؑ کے قیام کا پہلا سبب یہ تھا کہ اس وقت کی ظالم حکومت نے آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا جواب یہ تھا کہ میں بیعت نہیں کروں گا جبکہ امام حسن مجتبیٰؑ کے سامنے ایسی صورت حال نہیں تھی کیونکہ شرائط صلح میں یہ شرط نہیں تھی کہ امام حسنؑ معاویہ کی بیعت کریں گے۔ اس کی بجائے شرائط صلح میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ معاویہ آپ سے بیعت کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ صلح کے بعد امام حسنؑ نے معاویہ کی بیعت کی ہو۔ مسئلہ بیعت جس وجہ سے امام حسینؑ نے قیام کیا تھا امام حسنؑ کو سرے سے درپیش ہی نہیں تھا۔

(۴) مسئلہ دعوت۔ اہل کوفہ جنھوں نے بیس سال تک معاویہ کے مظالم برداشت کیے تھے اب اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور ان حالات کی وجہ سے بعض افراد کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ کوفہ انقلاب کے لیے سو فیصد آمادہ ہے[۱] لیکن ایک غیر متوقع واقعہ کی وجہ سے حالات بگڑ گئے۔ اہل کوفہ نے امام حسینؑ کو اٹھارہ ہزار خطوط لکھے تھے جن میں اپنی پوری آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس طرح امام حسینؑ پر اتمام حجت کی گئی تھی۔ اگر بالفرض حالات سازگار نہ ہوتے تب بھی آپ اس اتمام حجت سے اغماض نہیں برت سکتے تھے لیکن امام حسنؑ کے لیے اس طرح کے حالات نہیں تھے۔ آپ کے زمانے کے حالات قیام کی بجائے صلح کے متقاضی تھے کیونکہ اُس وقت کوفہ کے حالات آپ کے لیے انتہائی ناسازگار تھے۔ آپ اہل کوفہ سے شدید خطرہ محسوس کرتے اور ہر وقت محتاط رہتے تھے۔ جب آپ کسی کام کے لیے یا نماز کے لیے گھر سے نکلتے تو اپنے لباس کے نیچے زرہ پہنتے تھے۔

(۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مسئلہ۔ ان حالات و واقعات سے قطع نظر ایک ایسا مسئلہ بھی درپیش تھا جس سے امام حسینؑ کے لیے قیام کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض امام حسینؑ سے بیعت کا تقاضا نہ کیا جاتا اور اہل کوفہ آپ کو خطوط لکھ کر

۱۔ جیسا کہ "شہید جاوید" کے مؤلف کا خیال ہے۔

اپنے ہاں آنے کی دعوت نہ دیتے تب بھی آپ کے لیے قیام کرنا ضروری تھا۔ آخر وہ مسئلہ کیا تھا؟

وہ مسئلہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تھا۔ معاویہ نے اپنی بیس سالہ حکومت میں جتنے بھی کام کیے تھے وہ سب کے سب غیر اسلامی تھے۔ وہ انتہائی ظالم شخص تھا۔ سب لوگوں نے اُس کا ظلم وستم دیکھ رکھا تھا اور سب لوگ جانتے تھے کہ اُس نے اسلام مخالف کام کیے تھے، احکام اسلام میں تبدیلی کی تھی اور مسلمانوں کے بیت المال میں ناجائز تصرف کیا تھا، ناحق خون بہایا تھا اور اُس نے ایک ایسا گناہ کیا تھا جو اُس کے تمام گناہوں سے بھاری تھا یعنی یزید کی ولی عہدی کا گناہ کیونکہ یزید شرابی، جواری اور کتوں کا شیدائی تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اُس کی تمام غلط حرکتوں کی کھل کر مذمت کریں۔

امام حسنؑ کو معاویہ کے متعلق کوئی شک نہیں تھا۔ آپ اُس کے باطن سے پوری طرح آگاہ تھے۔ معاویہ حضرت علیؑ کے عہد خلافت میں کہتا تھا کہ میں صرف خون عثمانؓ کے قصاص کا دعویدار ہوں اور امام حسنؑ کے سامنے وہ یہ عہد کر رہا تھا کہ میں قرآن، سنت رسولؐ اور خلفائے راشدین کی سیرت پر سو فیصد عمل کروں گا، کسی کو اپنا جانشین نہیں بناؤں گا، میرے بعد حسنؑ بن علیؑ خلیفہ ہوں گے اور اُن کے بعد حسینؑ بن علیؑ خلیفہ ہوں گے۔

مقصد یہ ہے کہ وہ اُن کے حقوق کا اعتراف کر رہا تھا البتہ اس کے لیے شرط یہی ہے کہ حکومت اُس کے حوالے کردی جائے، اُس نے اپنے دستخط کر کے ایک سادہ کاغذ بھیجا اور کہا کہ اس کاغذ پر حسنؑ بن علیؑ جو بھی شرائط لکھیں گے میں اُن کو قبول کروں گا، مجھے صرف حاکم ہونا مطلوب ہے۔ میں تمام اسلامی احکام پر عمل کروں گا۔

الغرض امام حسینؑ کے قیام کے تینوں اسباب ایسے تھے جو امام حسنؑ کو درپیش نہیں تھے۔ دونوں بھائیوں کے زمانے کے حالات میں فرق تھا (اسی لیے ایک بھائی نے صلح کی اور دوسرے بھائی نے جنگ کی۔ بالفاظ دیگر ہمیں صلح اور جنگ کے اسباب امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی سیرت میں نہیں بلکہ معاویہ اور یزید کے طرز عمل میں ڈھونڈنے چاہئیں)۔

شرائط صلح

اب میں شرائط صلح کے چند نکات بیان کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کن شرائط پر صلح ہوئی تھی۔

صلح کی شرائط حسب ذیل تھیں:

(۱) حکومت اس شرط پر معاویہ کے حوالے کی جائے گی[۱] کہ وہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنتؐ اور خلفائے راشدین کی سیرت پر عمل کرے گا۔

(۲) معاویہ کے بعد حکومت امام حسنؑ کو منتقل ہوجائے گی۔ اگر انھیں کوئی حادثہ پیش آیا تو حکومت امام حسینؑ

۱۔ حکومت یا حکومتی امور فارسی اور اردو تعبیر ہے، عربی میں تسلیم امر کے الفاظ ہیں یعنی کام اُس کے سپرد ہوں گے۔

کے سپرد کی جائے گی۔ معاویہ کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

(۳) معاویہ نماز جمعہ اور عیدین کے خطبات میں حضرت علیؑ پر سب وشتم نہیں کرے گا اور حضرت علیؑ کو نیکی سے یاد کیا جائے گا۔

معاویہ نے اس شرط پر دستخط کیے لیکن اس نے باقی شرائط کی طرح اس شرط کو بھی اپنے قدموں تلے روند دیا اور نوے سال تک منبروں سے حضرت علیؑ پر سب وشتم کیا جاتا رہا۔

(۴) کوفہ کے بیت المال میں اس وقت جو پچاس لاکھ درہم موجود ہیں وہ معاویہ کی تحویل میں نہیں دیے جائیں گے۔ معاویہ ہر سال بیس لاکھ درہم حسنؑ بن علیؑ کو بھیجا کرے گا۔

آپ نے یہ شرط اس لیے رکھی تھی تاکہ شیعیان علیؑ مالی طور پر معاویہ کے محتاج نہ ہوں اور اس رقم سے اُن کی کفالت کی جاسکے اور اگر شیعیان علیؑ کو مالی معاونت کی ضرورت ہو تو امام حسنؑ و حسینؑ اُن کی معاونت کریں۔

اس ضمن میں یہ شرط بھی تھی کہ معاویہ بخشش اور وظائف میں بنی ہاشم کو بنی اُمیہ پر ترجیح دے گا اور جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے جو ساتھی شہید ہوئے تھے اُن شہداء کے پسماندگان میں دس لاکھ درہم تقسیم کیے جائیں گے۔ یہ تمام رقم خراج کے مقام "دار ابجرد" سے ادا کی جائے گی۔

(۵) لوگوں کو اللہ کی سرزمین میں خواہ شام ہو یا عراق، یمن ہو یا حجاز مکمل امان ہوگی نیز ہر کالے گورے کو بھی امان ہوگی۔ معاویہ کسی بھی شخص کو سابقہ غلطیوں کے بہانے سزا دینے کا مجاز نہ ہوگا۔ امام علیؑ کے اصحاب جہاں بھی ہوں گے اُنھیں مکمل امان ہوگی۔ حسنؑ بن علیؑ اور اُن کے بھائی حسینؑ بن علیؑ اور اہلبیت رسولؐ میں سے کسی بھی فرد کے خلاف خفیہ یا علانیہ سازش نہیں کی جائے گی۔

مذکورہ شرائط میں پانچویں اور تیسری شق اگرچہ پہلی شرط میں آچکی تھیں پھر بھی اُنھیں خصوصی طور پر علیحدہ رکھا گیا۔ لوگ جانتے تھے کہ ان شرائط کا تعلق معاویہ کے رویے سے ہے اور وہ اُن کی خلاف ورزی کرتا رہا ہے۔ اب معاویہ کے لیے اپنے اس عمل کی کسی توجیہ کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ ان شرائط کے ذریعے سے اُسے یہ پیغام دیا گیا تھا کہ ہم تیری روش سے نالاں ہیں۔

معاویہ نے عبداللہ بن عامر کو خط دے کر امام حسنؑ کی خدمت میں بھیجا جس میں اپنے دستخط کے ساتھ لکھا تھا کہ آپ جو بھی شرائط مقرر کریں گے ہمیں سب منظور ہوں گی۔ میں اللہ اور رسولؐ کو ضامن قرار دیتا ہوں کہ اگر میں نے ان پر عمل نہ کیا تو میں ایسا ویسا قرار پاؤں گا۔ پھر اُس نے صلح نامے پر دستخط کیے۔[۱]

امام حسنؑ نے جن شرائط پر صلح کی تھی اُن میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی لہٰذا صلح حسنؑ اور قیام

۱۔ شیخ راضی آل یاسین، صلح الحسنؑ ص ۲۵۹۔۲۶۱

حسینؑ کو ایک دوسرے کے متضاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر امیرالمومنینؑ کے بعد امام حسنؑ کی بجائے امام حسینؑ خلیفہ ہوتے تو آپ بھی ان شرائط پر صلح کر لیتے اور اگر معاویہ کی موت کے بعد امام حسنؑ زندہ ہوتے تو وہ بھی امام حسینؑ کی طرح قیام کرتے کیونکہ معاویہ کے بعد حالات بہت بدل چکے تھے۔

اسی وجہ سے تاریخ کے تجزیہ نگاروں نے لکھا ہے کہ امام حسنؑ کی صلح نے امام حسینؑ کے قیام کی راہ ہموار کی تھی۔ ضروری تھا کہ امام حسنؑ کچھ عرصے کے لیے کنارہ کش ہوجائیں تاکہ بنی اُمیہ کا حقیقی چہرہ سامنے آجائے اور قیام کی راہ ہموار ہوسکے نیز تاریخ میں قیام حسینیؑ کے اسباب بھی واضح ہوسکیں۔

سوال و جواب

سوال ۱: اگر حضرت علیؑ امام حسنؑ کی جگہ ہوتے تو کیا صلح کرتے؟ جبکہ آپ نے فرمایا تھا کہ میں معاویہ کی حکومت ایک دن کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس شخص کی حکومت کو حضرت علیؑ ایک دن برداشت کرنے پر تیار نہ تھے امام حسنؑ نے اُس کی حکومت کو کیسے قبول کرلیا؟

جواب: اس سوال کا سرسری جواب نہیں دیا جاسکتا البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر حضرت علیؑ کو وہی حالات درپیش ہوتے جو امام حسنؑ کو تھے تو آپ بھی صلح کرلیتے۔ اگر اُنھیں امام حسنؑ کی طرح یہ یقین ہوجاتا کہ خلافت پر قائم رہے تو اُموی لشکر کے ہاتھوں قتل ہوجائیں گے تو وہ بھی صلح کرلیتے لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے حالات ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اگر جنگ صفین میں خوارج کا گروہ سامنے نہ آیا ہوتا تو صفین میں آپ کی کامیابی یقینی تھی۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس میں دو رائے نہیں ہوسکتی۔ رہا یہ سوال کہ حضرت علیؑ معاویہ کی حکومت ایک دن برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے تو امام حسنؑ نے اُس کی حکومت کو کیسے مان لیا؟

اس سوال میں دو باتوں کو خلط ملط کیا گیا ہے۔ حضرت علیؑ اس بات پر تیار نہیں تھے کہ وہ ایک دن کے لیے بھی معاویہ کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے شام میں حاکم برقرار رکھیں۔ صلح کے ذریعے امام حسنؑ بھی معاویہ کو اپنا نائب اور جانشین مقرر نہیں کر رہے تھے بلکہ آپ چاہتے تھے کہ خود حکومت سے علیحدہ ہوجائیں۔ امام حسنؑ کی صلح کنارہ کشی تھی، معاویہ کی خیرخواہی اور وفاداری نہیں تھی۔

سوال ۲: آپ حضرات کہتے ہیں: ''اگر امام حسنؑ صلح نہ کرتے تو تاریخ اُنھیں ملامت کرتی کیونکہ معاویہ نے کورے کاغذ پر دستخط کرکے اُن کے پاس بھیجا تھا کہ آپ جو شرائط چاہیں لکھ دیں۔'' آپ حضرات کی یہ بات درست دکھائی نہیں دیتی کیونکہ لوگوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ کورا کاغذ بھیجنا معاویہ کی چالاکی ہے۔ دراصل وہ یہ پیغام بھیج رہا تھا کہ آپ کا جو جی چاہے لکھ دیں مگر میں کسی بات کو ماننے کا پابند نہیں ہوں۔ حضرت علیؑ کی زندگی میں ہی لوگ معاویہ کی حقیقت جان چکے تھے۔

جواب : معاویہ نے سادہ کاغذ پر دستخط کر کے دراصل ایک اور فریب کاری کی تھی۔ سادہ کاغذ بھیج کر دراصل وہ لوگوں کو یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ لو اب تم خود ہی دیکھ لو کہ امام حسنؑ اسلامی شرائط لکھتے ہیں یا غیر اسلامی شرائط لکھتے ہیں؟

معاویہ چاہتا تھا کہ امام حسنؑ ایسی شرائط لکھیں جن کا تعلق اُن کی ذات سے ہو، اسلام سے اُن کا کوئی تعلق نہ ہو جبکہ امام حسنؑ چاہتے تھے کہ وہ اسلامی شرائط لکھ کر معاویہ کو اُن کا پابند بنائیں اور دنیا کو دکھائیں کہ ہماری شرائط کا تعلق ہمارے ذاتی مفادات سے ہے یا مسلمانوں کے مفادات سے ہے؟

جب امام نے ایسی شرائط لکھیں جو سراسر اسلام کے مفاد میں تھیں تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ امام کے سامنے ذاتی مفادات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ اسلام کے مفاد کو عزیز رکھتے ہیں۔ اب اگر امام حسنؑ کورے کاغذ پر شرائط نہ لکھتے تو لوگ کہتے کہ معاویہ کتنا اچھا انسان ہے جو صلح کے لیے کورے کاغذ پر دستخط کر دیتا ہے اور اس کے مقابلے پر امام حسنؑ جنگ کو ترجیح دے رہے ہیں۔

معترض کا یہ کہنا کہ لوگ حضرت علیؑ کی زندگی میں معاویہ کی فریب کاریاں جان چکے تھے ایک حد تک درست ہے لیکن معاملے کی ایک اور نوعیت بھی تھی کہ لوگوں میں معاویہ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اچھا انسان نہیں مگر بہت اچھا حاکم ہے۔ کوفہ کے لوگ بھی اسی لیے ست پڑ گئے تھے کہ معاویہ حلم و بردباری کے لیے مشہور تھا جبکہ معاویہ کا حلم بھی اُس کی ایک سیاسی چال تھی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اگر معاویہ اہل کوفہ کے ساتھ سیاسی برداشت کا مظاہرہ کرتا تو اُس کے حق میں بہتر ہوتا اور اگر وہ ایسا کرتا تو معنوی طور پر بھی کامیاب ہو جاتا۔

امام حسن مجتبیٰؑ نے معاویہ سے صلح کر کے اُس کی حقیقت دنیا کے سامنے کھول دی کہ سب دیکھ لیں کہ بطور حاکم یہ کس کردار کا مالک ہے۔[1]

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۸۲ ۔ ۱۰۸

قیام عاشورا اور اس کے اسباب و نتائج

امام حسینؑ ۳ رشعبان ۴ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے اور گیارہ برس امامت کی ذمے داریاں انجام دینے کے بعد ۵۷ برس کی عمر میں ۱۰ رمحرم ۶۱ھ کو کربلا میں شہید کر دیے گئے اور کربلا میں ہی دفن ہوئے۔

امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ

امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا تھا اور اس کے اسباب کیا تھے؟ اس کی تین طرح کی تفسیر کی جا سکتی ہے۔

(۱) (نعوذ باللہ) ہم یہ کہیں کہ آپ کے قیام کی نوعیت ایک عام تحریک کی سی تھی اور آپ اس طرح ذاتی مفادات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ قیام امام حسینؑ کی ایسی تفسیر ہے جس پر یقیناً کوئی بھی مسلمان راضی نہیں ہوسکتا اور یہ تفسیر تاریخی حقائق و مسلمات کے خلاف ہے۔

(۲) دوسری تفسیر وہ ہے جو اکثر لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہو چکی ہے کہ امام حسینؑ اس لیے شہید ہوئے تھے تاکہ امت کے گناہ بخشے جائیں۔

یہ عقیدہ عیسائیوں کے عقیدے کے مماثل ہے (کہ حضرت عیسیٰؑ اس لیے مصلوب ہوئے تھے کہ اُن کے پیروکاروں کے گناہ معاف ہو جائیں)۔ یہ طرز فکر انتہائی خطرناک ہے۔

(۳) تیسری تفسیر یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ امام حسینؑ نے قیام کرنا فرض سمجھا کیونکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے قیام کے بغیر اسلام کی حفاظت کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

آپ کا قیام حق و حقیقت کے راستے کے لیے تھا۔ آپ کی جنگ مسلک اور عقیدے کی جنگ تھی۔

آپ کی جنگ حق و باطل کی جنگ تھی۔

حق و باطل کی جنگ صرف امام حسینؑ پر ہی فرض نہیں تھی بلکہ ہر مسلمان پر فرض تھی۔ آپ نے سفر کربلا کے دوران اپنے اصحاب سے فرمایا تھا: اَلَا تَرَوْنَ اَنَّ الْحَقَّ لَا یُعْمَلُ بِهٖ وَاَنَّ الْبَاطِلَ لَا یُتَنَاهٰی عَنْهُ، لِیَرْغَبِ

الْمُؤْمِنُ فِي لِقَاءِ اللّٰهِ مُحِقًّا[1] کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے روکا نہیں جا رہا۔ پس ان حالات میں مومن کو چاہیے کہ وہ خدا سے ملنے کی تیاری کرے یعنی راہِ شہادت کو اختیار کرے۔[2]

امام حسینؑ نے منیٰ و عرفات کے اجتماعات سے بھی استفادہ کیا اور حاجیوں کے سامنے اپنے خطبات میں تمام اسلامی اہداف یوں بیان فرمائے:

پروردگار! تو جانتا ہے کہ ہماری تحریک، ہماری جدوجہد اور ہماری جنگ کا مقصد اقتدار کا حصول نہیں۔ ہماری جدوجہد کا مقصد کسی فرد واحد کے لیے طاقت حاصل کرنا نہیں۔ ہمارا مقصد جاہ طلبی نہیں۔ اس سے دنیا کے مال و منال کا جمع کرنا اور دنیا کے مال و منال میں اضافہ بھی مقصود نہیں۔

وَلٰكِنْ لِنَرُدَّ الْمَعَالِمَ مِنْ دِيْنِكَ وَ نُظْهِرَ الْاِصْلَاحَ فِي بِلَادِكَ فَيَأْمَنَ الْمَظْلُومُونَ مِنْ عِبَادِكَ وَ تُقَامَ الْمُعَطَّلَةُ مِنْ حُدُوْدِكَ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تیرے دین کے قوانین کو اس کے مقام پر لوٹا سکیں اور تیری زمین میں اصلاح کریں تاکہ تیرے مظلوم بندوں کو امن نصیب ہو اور تیرے جن حدود کو معطل کیا جا چکا ہے انھیں پھر سے نافذ کیا جا سکے۔[3]

کسی تحریک کے مقدس ہونے کی شرائط

واقعۂ عاشورا کے جہاں بہت سے اسباب ہیں وہیں اس کے بہت سے اعلیٰ مقاصد بھی ہیں لیکن ہم مسلمانوں اور امام حسینؑ کے شیعوں نے اس واقعہ میں اسی طرح تحریف کی ہے جیسی معاویہ نے عمارؓ کے متعلق قول پیغمبرؐ تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ میں تحریف کی تھی۔

مطلب یہ کہ امام حسینؑ کی نظر میں آپ کے قیام کے جو اغراض و مقاصد تھے ہم نے اُن کی جگہ کچھ دوسرے اہداف و مقاصد تراش لیے ہیں۔

امام حسینؑ نے انتہائی بلند مقاصد کے لیے جدوجہد کی تھی اور کسی بھی جدوجہد اور تحریک کے مقدس

۱۔ تحف العقول ص ۲۴۵

۲۔ دو گفتار ص ۲۴۷۔ ۲۵۰

۳۔ پیرامون جمہوری اسلامی ص ۸۰۔ ۸۳۔ امام حسینؑ کے قیام کے اجمالی مقاصد یہ تھے:

(۱) معاشرے کو حقیقی اسلام لوٹانا اور سیرت رسول و سیرت علیؑ کی پیروی

(۲) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے ظالموں سے مقابلہ

(۳) دینی احکام و قوانین کا احیاء اور اجراء

(۴) عوام کی زندگی کو بہتر بنانا اور بالآخر امر امت کی اصلاح

ہونے کی جتنی شرائط ہیں وہ سب آپ کی جدوجہد میں موجود ہیں اور آپ کے قیام کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔[1]
آیئے دیکھیں تقدس کی شرائط کیا ہیں؟

(۱) ہدف، اجتماعی اور کلی ہونا چاہیے

مقدس قیام کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا مقصد ذاتی اور انفرادی نہ ہو بلکہ کلی ہو اور پوری انسانیت کے لیے ہو۔ یہ جدوجہد سماج، انسانیت، حقیقت، حق، توحید، انصاف اور مساوات کے لیے ہو، اپنی ذات کے لیے نہ ہو۔

(۲) محکم دانش و بصیرت[2]

مقدس قیام کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ گہری دانش و بصیرت پر مبنی ہو۔ بعض اوقات لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے ایک چیز کا ادراک نہیں کرتے مگر اُسی معاشرے میں رہنے والا ایک دانشور اُن مسائل کا ادراک کرتا ہے اور لوگوں کے درد کو خود اُن سے کئی گنا بہتر سمجھتا ہے۔ اصطلاحی طور پر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب عام لوگوں کو آئینے میں بھی کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو تو بابصیرت شخص خشت خام میں بھی حالات کا عکس دیکھ لیتا ہے۔ لوگوں کو بیس، تیس، پچاس سال کے بعد جب ہوش آتا ہے تب اُنھیں پتا چلتا ہے کہ فلاں شخص کے قیام کے مقاصد انتہائی بلند تھے۔

اس کی مثال کے لیے مرحوم سید جمال الدین افغانی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔[3]

(۳) جدوجہد میں انفرادیت ہونی چاہیے

جدوجہد کے مقدس ہونے کی تیسری شرط یہ ہے کہ وہ سکوت شکن ہو۔ جب کسی معاشرے پر سکوت طاری ہو، ہر طرف جبر کا راج ہو، کسی میں حرف حق کہنے کا یارا نہ ہو، ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی ہو اُس سناٹے میں ایک مرد خدا اُٹھے، اُس خاموشی کو توڑ ڈالے اور منجمد معاشرے کو متحرک کر دے اور شب تاریک میں بجلی کی مانند روشنی پھیلا دے اور لوگ اُس کے نقش قدم پر چلنے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھیں۔[4]

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۳۹، ۱۴۲۔ ج ۲، ص ۲۶۴ ـ ۲۶۶

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۵۷

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۷۰ ـ ۷۳۔ ج ۳، ص ۴۱ ـ ۵۵

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۷۵

قیام حسینؑ کے اہم اسباب

قیام امام حسینؑ کے مختلف اسباب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعۂ کربلا اگرچہ واقعات کے اعتبار سے زیادہ طویل نہیں تھا مگر تفسیر اور ماہیت کے ادراک کے لحاظ سے دنیائے تاریخ کا بہت بڑا اور محیر العقول واقعہ ہے۔[1]

(۱) بیعت

معاویہ رجب ۶۰ھ میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ یزید، مدینہ کے گورنر (ولید بن عتبہ بن ابی سفیان) کو ایک خط بھیجتا ہے جس میں وہ اپنے باپ کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ تم لوگوں سے میرے لیے بیعت لو۔ حسینؑ بن علیؑ کو طلب کرو اور اُن سے بھی بیعت لو اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو اُن کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دو۔[2]

مذکورہ خرابیوں کے علاوہ یزید کی بیعت میں دو مزید خرابیاں تھیں حتیٰ کہ وہ معاویہ میں بھی نہیں تھیں۔

پہلی خرابی یہ تھی کہ اگر امام حسینؑ یزید کی بیعت کر لیتے تو وہ آپ کی طرف سے موروثی خلافت پر مہر تصدیق ہو جاتی... دوسری خرابی کا تعلق یزید کی ذات سے تھا۔ وہ صرف فاسق و فاجر ہی نہیں تھا بلکہ علانیہ فسق و فجور کیا کرتا تھا نیز سیاسی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ معاویہ اور بنی عباس کے بہت سے خلفاء بھی فاسق تھے مگر ... وہ اپنی حکومت کی بقاء کے لیے ظاہری طور پر احکام شریعت کا بھرم رکھتے تھے... لیکن یزید میں یہ شعور بھی نہیں تھا۔ وہ کھلم کھلا گناہ کرتا تھا... شاید معاویہ بھی شراب پیتا تھا (میں نے لفظ "شاید" اس لیے کہا ہے کہ مجھے تاریخ میں اس کے شواہد نہیں ملے۔ ممکن ہے کوئی محقق اس کے شواہد تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے)[3] لیکن تاریخ کے صفحات میں یہ بات کہیں دکھائی نہیں دیتی کہ معاویہ نے کسی بھری بزم میں شراب پی ہو اور شراب کی وجہ سے بدمست ہوا ہو جبکہ یزید کے متعلق تمام مؤرخین گواہی دیتے ہیں کہ وہ عام محفلوں میں شراب پیتا تھا اور اتنا بلا نوش تھا کہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔ وہ بندروں کے ساتھ کھیلتا تھا... اسی لیے امام حسینؑ نے فرمایا تھا: وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيدَ اگر یزید جیسا شخص مسلمانوں کا حاکم ہو تو پھر اسلام کا خدا ہی حافظ ہے۔[4] الغرض یزید ہر لحاظ سے اسلام کا مخالف تھا اور وہ مخالف اسلام ہونے کے باوجود امام حسینؑ سے بیعت کا طلب گار تھا...

مدینہ کے گورنر نے امام کو دربار میں طلب کیا۔ جب اُس کا قاصد پیغام لے کر آیا اُس وقت آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ عبداللہ بن زبیر بھی آپ کے قریب بیٹھے تھے۔ قاصد نے آ کر دونوں کو حاکم کا پیغام پہنچایا اور

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۸۶ ـ ۱۸۷ ـ ج ۲، ص ۱۴ ـ ۱۵ ـ ۱۷ ـ ج ۳، ۱۰۱ ـ ۱۱۳ ـ ۱۷۳ ـ ۲۲۰

۲۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۳۲ ـ ۳۳

۳۔ الغدیر ج ۱۰، ص ۱۷۹ دیکھیے، وہاں تاریخ سے اس جرم کے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

۴۔ مقرم، مقتل الحسین ص ۱۳۶

اُنھیں حاکم کے پاس جانے کے لیے کہا۔ عبداللہ بن زبیر نے امام حسینؑ سے کہا کہ اس بلاوے کا کیا مقصد ہے؟

امام نے فرمایا: أَظُنُّ أَنَّ طَاغِيَتَهُمْ قَدْ هَلَكَ میرا خیال ہے کہ اُن کا فرعون مرگیا ہے اور اُنھوں نے ہمیں بیعت کے لیے طلب کیا ہے۔

عبداللہ بن زبیر نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب آپ کیا کریں گے؟

امام حسینؑ نے فرمایا کہ میں اُس کے پاس چلا جاؤں گا...

عبداللہ بن زبیر اسی رات غیر معروف راستے سے مکہ بھاگ گئے اور وہاں حرم میں پناہ لے لی۔

امام حسینؑ نے بنی ہاشم کے چند جوانوں کو ساتھ لیا اور ولید کے دربار کی طرف روانہ ہوئے۔ جب آپ دارالامارہ پہنچے تو جوانوں سے فرمایا کہ تم یہاں رک جاؤ۔ اگر اندر سے میری آواز بلند ہو اور "تیرے یزید پر" کے الفاظ سنو تو اندر آجانا اور اگر میری آواز بلند نہ ہو تو اندر مت آنا۔

بنی امیہ کا پلید شخص مروان بن حکم جو معاویہ کے زمانے میں کچھ عرصہ مدینہ کا گورنر رہا تھا اُس وقت دربار میں موجود تھا۔[1] گورنر نے یزید کا خط امام کو پڑھ کر سنایا... پھر کہا کہ مدینہ کے لوگ یزید کی بیعت کر چکے ہیں۔ اسلام کی مصلحت کے لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی بیعت کرلیں... امام نے فرمایا: تم مجھ سے کس لیے بیعت لینا چاہتے ہو؟ لوگوں کی خاطر تم مجھ سے بیعت کا مطالبہ کررہے ہو یعنی خدا کے لیے تو تم مجھ سے مطالبہ نہیں کررہے... تمہارا مقصد یہ ہے کہ میں بیعت کروں تاکہ مجھے دیکھ کر باقی لوگ بھی بیعت کریں۔ ولید نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ دربار میں تو اس وقت ہم صرف تین افراد موجود ہیں۔ یہاں پر میری بیعت سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ ولید نے کہا کہ آپ نے بجا فرمایا۔ بعد میں کرلیجئے گا... اس کے بعد امام حسینؑ نے مدینہ میں مزید تین راتیں گزاریں اور ہر رات رسول اللہ ﷺ کی قبر مطہر پر جاتے رہے۔ آپ تیسری رات رسول اللہ ﷺ کی قبر پر جاتے ہیں[2] اور ایک خواب دیکھتے ہیں اور یہ خواب آپ کے لیے

۱۔ مروان کافی عرصے تک مدینہ کا گورنر رہا۔ اتفاق سے اُس نے مدینہ میں زراعت کو بھی ترقی دی تھی۔ مدینہ میں مروان کے جاری کردہ ایک چشمے کا پانی اب بھی بہہ رہا ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کا مدفن مقدس آپ کا گھر اور بی بی عائشہؓ کا حجرہ تھا۔ آپ اس حجرے کے جنوبی کونے میں مدفون ہیں اور حضرت ابوبکرؓ آپ کے پشت سر مدفون ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ مورخین نے لکھا ہے اور اُن کے دلائل کافی وزنی ہیں کہ حضرت عمرؓ آپ کے پائنتی کی جانب مدفون ہیں۔ حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد بی بی عائشہؓ نے حجرے کے درمیان میں دیوار کھڑی کروی تھی اور خود حجرے کے شمالی حصے میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ حجرے کی جنوبی دیوار میں ایک دروازہ بنایا گیا تھا جہاں سے زائرین قبر مطہر کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ جب امام حسینؑ آنحضرت ﷺ کی زیارت کے لیے گئے اُس وقت بی بی عائشہؓ وفات پا چکی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کا روضۂ اطہر اُسی زمانے میں زیارت گاہ بن گیا تھا اور اس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔

وحی و الہام کا درجہ رکھتا تھا۔[1] آپ نے اُس رات کی صبح کو رخت سفر باندھا اور شاید ۲۷ رجب[2] کا دن تھا جب آپ نے مدینہ چھوڑا اور مکہ کی جانب عازم سفر ہوئے۔[3] آپ نے مکہ جانے کے لیے عام شاہراہ کا انتخاب کیا۔ آپ ۳ رشعبان کو مکہ پہنچے اور شعبان، رمضان، شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ کی ۸ رتاریخ تک... مکہ ہی میں قیام پذیر رہے۔[4] مکہ سے آپ نے اس ترتیب سے سفر کیا۔ تنعیم، صفاح، ذات عرق، حاجز بطن زمہ، زرود، ثعلبیہ، زبالہ، بطن عقبہ، شراف، ذوحسم، عذیب الھجانات، قصر بنی مقاتل اور آخر میں نینوا پہنچے۔[5]

(۲) دعوت

امام حسینؑ نے بیعت یزید سے انکار کرتے ہوئے رجب کے آخری عشرے میں مدینہ چھوڑ دیا اور مکہ تشریف لائے۔ مکہ حرم الٰہی اور جائے امن ہے، صرف جائے امن ہی نہیں مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع کا مرکز بھی ہے۔ رجب اور شعبان عمرہ کے مہینے ہیں۔ اس کے بعد حج کے ایام شروع ہوتے ہیں اور وہ دن تبلیغ کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ پھر دو ماہ کے اندر اہل کوفہ کے خطوط امام کے پاس مکہ میں پہنچنا شروع ہوگئے۔ حالات و واقعات کے تناظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل کوفہ کی دعوت اس جدوجہد کا بنیادی محرک تو نہیں البتہ اسے ایک ذیلی سبب کہا جا سکتا ہے۔ اہل کوفہ کی دعوت کا اثر اس حد تک ضرور ہوا کہ اس دعوت نے لوگوں کی نظر سے اور آئندہ کے تاریخی فیصلے کے لیے امام کو مناسب موقع فراہم کیا تھا۔

اہل کوفہ کی دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ نے مکہ چھوڑ دیا اور مکہ کو اپنا مرکز نہیں بنایا۔ ابن عباسؓ نے آپ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ کوفہ کی بجائے یمن چلے جائیں اور وہاں کے پہاڑی علاقوں کو اپنی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کریں لیکن اہل کوفہ کے خطوط کی وجہ سے آپ نے ابن عباس کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ آپ نے مدینہ کو بھی اپنی تحریک کا مرکز نہیں بنایا تھا۔ اس کی بجائے آپ نے کوفہ جانے کو ترجیح دی تھی۔

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۰ ۔ ۲۶ ۔ ج ۱، ص ۷۵، ۱۸۷ اور ۲۶۹ ۔ ۲۷۲

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۸۷

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۶ ۔ ج ۳، ص ۱۵۱ ۔ ۱۵۲۔

آپ نے ۲۸ رجب کی رات کو مدینہ سے کوچ فرمایا تھا اور آپ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (سورۂ قصص : آیت ۲۱) آپ اپنے خاندان اور تمام بنی ہاشم کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ ۳ رشعبان ۶۰ھ کو شب جمعہ مکہ میں وارد ہوئے۔ (شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۳۴ ۔ ۳۵)

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۷۰

۵۔ سید جعفر شہیدی، زندگانی علی بن الحسین ص ۴۹

(۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر[۱]

یہ امام کی اپنی بتائی ہوئی قیام کی علت ہے۔ تاریخ بیان کرتی ہے کہ آپ کے سفر سے پہلے آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ کا ہاتھ مفلوج ہو چکا تھا اس لیے وہ آپ کے ساتھ شریک نہ ہو سکے۔ امام نے وصیت نامہ لکھ کر اُن کے سپرد کیا اور اس وصیت نامے میں اپنے قیام کے مقصد کو یوں بیان فرمایا: إِنِّي مَا خَرَجْتُ أَشِرًا وَلَا بَطِرًا وَلَا مُفْسِدًا وَلَا ظَالِمًا إِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي، أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَسِيرَ بِسِيرَةِ جَدِّي وَأَبِي عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ میں نہ تو تکبر و سرکشی کے لیے نکلا ہوں اور نہ ہی فساد اور ظلم کرنے کے لیے نکل رہا ہوں۔ میں اس لیے نکلا ہوں کہ امت جد کی اصلاح کر سکوں۔ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اپنے نانا اور اپنے بابا علی بن ابی طالبؑ کی سیرت کو قائم کرنا چاہتا ہوں۔[۲]

آپ نے اپنے قیام کے جو اغراض و مقاصد بیان کئے تھے اس میں اہل کوفہ کی دعوت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس ارشاد کا سیدھا مطلب یہی نکلتا ہے کہ امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ اگر یہ مجھ سے بیعت طلب نہ کرے تب بھی میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ اہل دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ حسینؑ بن علیؑ جاہ و جلال، مقام و منزلت اور دولت و ثروت کے طلب گار نہیں تھے۔ آپ فتنہ گر و ستم گر ہرگز نہیں تھے۔ آپ ایک مصلح تھے۔ آپ نے کئی مواقع پر اپنا موقف بیان کیا تھا۔ آپ سے جب یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے ولید کے دربار میں اپنا موقف واضح کیا۔ آپ نے معاویہ کو خط لکھ کر اپنے موقف کا اظہار کیا۔ آپ نے منیٰ میں خطبہ دیا اور اس میں بھی اپنے موقف کو بیان کیا تھا۔[۳]

یہ تین اسباب اپنی اہمیت کے لحاظ سے برابر نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر سبب ایک مخصوص حد تک امام کی جدوجہد کی قدر و قیمت کو بڑھاوا دیتا ہے۔

(۱) دعوت کس حد تک مؤثر ہے؟

اس سبب کی قدر و قیمت بہت ہی سادہ اور عمومی ہے (البتہ امام کے عمل کی سطح پر سادہ اور عمومی ہے ہمارے کاموں کی سطح پر نہیں)۔ دعوت کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص علاقے یا ایک صوبے کے لوگوں کو قائل کیا جا سکتا ہے اور وہ اپنی آمادگی ظاہر کر سکتے ہیں، اس کی کامیابی کا امکان پچاس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔

(۲) آپ کا بیعت نہ کرنا کس حد تک مؤثر تھا؟

اہل کوفہ کی دعوت آپ کے قیام میں اتنی مؤثر نہیں تھی جتنا کہ آپ کا بیعت سے انکار اہمیت رکھتا ہے

۱۔ سید جعفر شہیدی، زندگانی علی بن الحسینؑ ج ۱، ص ۱۸۸ ۔ ۱۸۹ ۔ ج ۲، ص ۱۳۰ ۔ ۱۳۵ ۔ ج ۳، ص ۲۲۱ ۔ ۲۲۸

۲۔ خوارزمی، مقتل الحسینؑ ج ۱، ص ۱۸۸۔ بحار الانوار ج ۴۴، ص ۳۲۹

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۷ ۔ ۳۲۔ مقتل الحسینؑ ج ۱، ص ۱۸۸

کیونکہ ابھی یزید کی حکومت کی ابتدا ہے۔ ابھی تک کسی نے امام کی حمایت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ ۲۰ برس تک ایک جابر حکومت مسلط رہی تھی جس نے لوگوں پر ظلم کی انتہا کردی تھی (اب امام سے بیعت طلب کی جا رہی تھی)۔ ایسے سخت حالات میں یزید خلیفہ بنتا ہے جو نوجوان، مغرور اور سفاک ہے اور اُسے سیاسی حالات کی بھی کوئی پروا نہیں ہے۔ ایسی سخت حکومت کے سامنے "نہیں" کہنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

اس لحاظ سے امام تنہا ایک جابر قوت کے مقابل کھڑے ہیں۔ اس وقت کوئی ناصر و یاور بھی نہیں ہے۔ آپ کا یہ اقدام اہل کوفہ کی دعوت سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل اور موثر تھا۔

(۳) امر بالمعروف کس حد تک آپ کے قیام میں موثر تھا؟

مذکورہ بالا دونوں اسباب کی نسبت اس سبب کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ سے آپ کے قیام میں اتنا نکھار پیدا ہوا کہ آپ کی تحریک ہمیشہ کے لیے امر ہوگئی کیونکہ آپ کی تحریک کا انحصار صرف اہل کوفہ کی دعوت اور بیعت سے انکار پر نہیں تھا۔

عامل (دعوت) کے مطابق چونکہ اہل کوفہ نے آپ کو بلایا ہے اور پچاس فیصد یا اس سے کچھ کم کامیابی ہوسکتی ہے اس لیے امام کوفہ کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں... عامل (بیعت) کے مطابق امام سے بیعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور (امام) فرماتے ہیں کہ میں تمہاری بیعت نہیں کروں گا... اس عامل سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر آپ سے بیعت نہ مانگی جاتی تو آپ چین سے اپنی جگہ بیٹھے رہتے اور کربلا کا اندوہناک واقعہ پیش نہ آتا۔ امام حسین کی جدوجہد کا تیسرا سبب امر بالمعروف ہے۔ آپ حکومت وقت سے اختلاف کرتے ہیں اور حاکم پر تنقید کرتے ہیں کیونکہ اموی حکام نے ہر جگہ فساد مچا رکھا تھا۔ اُنھوں نے حلال خدا کو حرام اور حرام خدا کو حلال قرار دے رکھا تھا۔ مسلمانوں کا بیت المال نااہل افراد کے ہاتھوں میں تھا اور بیت المال کا پیسہ ایسے کاموں میں خرچ کیا جا رہا تھا جن سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا فرمان ہے: جو شخص ایسے حالات کو دیکھے... مگر اُن کو بدلنے کی کوشش نہ کرے... تو خدا ایسے شخص کو وہاں بھیج دے گا جہاں ظالموں، جابروں، ستم گروں اور دین خدا کو بدلنے والوں کو بھیجا گیا ہوگا اور اُس کا انجام بھی اُن جیسا ہوگا۔[1]

حسینی جدوجہد میں اہل بیتؑ کا کردار

تاریخ اس بات کی تائید کرتی ہے اور اخبار و احادیث میں بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے کہ امام حسینؑ اس پرخطر سفر میں اپنے اہل بیت کو ساتھ کیوں لے کر گئے تھے؟ جبکہ اس سفر کے خطرات کی سب لوگ پیش گوئی

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۸۶، ۱۸۹۔ ج ۲، ص ۳۹ ۔ ۴۳۔ فروع کافی ج ۴، ص ۵۶ ۔ ج ۵، ص ۵۹۔ تاریخ طبری ج ۴، ص ۳۰۴

کر رہے تھے۔ تمام مصلحت اندیش افراد نے اہل حرم کے آپ کے ساتھ جانے کو خلاف مصلحت قرار دیا تھا۔[۱]
امام عالی مقام نے بھی کئی مواقع پر اُن کے خدشات کی تصدیق کی تھی[۲] اور آپ یہ شعر پڑھتے تھے:

سأمضي وما بالموت عارٌ على الفتیٰ — اذا ما نوی حقًا و جاهدَ مسلمًا
و واسَی الرّجالَ الصّالحینَ بنفسِه — و فارقَ مثبورًا و خالفَ مُجرمًا
أُقدِّمُ نفسي لا أُریدُ بقائَها — لِتَلقیٰ خمیسًا فی الهیاجِ عَرَمْرَمًا
فان عِشتُ لم أُندَمْ و اِن مِتُّ لم اُلَمْ — کَفَیٰ بك ذُلًّا ان تعیشَ و تُرغَما[۳]

میں جاؤں گا۔ جوان کے لیے موت ننگ و عار کا باعث نہیں ہے جبکہ وہ حق کا مقصد رکھتا ہو اور مسلمان کی حیثیت سے جہاد کی نیت رکھتا ہو۔ اپنی طرف سے نیک لوگوں سے ہمدردی کرے اور ہلاک ہونے والوں سے جدا ہو جائے اور مجرمین کی مخالفت کرے۔ میں اپنے آپ کو آگے لے آؤں گا۔ میں اپنی بقا کا خواہش مند نہیں ہوں۔ میں اپنی جان کو سخت جنگ کے شعلوں میں جھونک دوں گا۔ اگر میں زندہ رہا تو میں نادم نہیں ہوں گا اور اگر میں مرگیا تو میں قابل ملامت قرار نہیں پاؤں گا جبکہ تیری ذلت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ تو زندہ رہے اور بے عزت ہوتا رہے۔

ان اشعار کے ذریعے (امام حسینؑ) نے معنوی پہلو کو بیان کیا... آپ نے اس خواب سے استناد کیا جو فیصلہ کن وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ آپ نے فرمایا: میرے نانا نے عالم خواب میں مجھ سے فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ شَاءَ اَنْ یَّرَاكَ قَتِیْلًا اللہ نے چاہا ہے کہ تجھے اپنی راہ میں قتل ہوتا دیکھے۔[۴] لوگوں نے کہا کہ یہ بات ہے تو پھر آپ عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر کیوں جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میرے نانا نے مجھ سے فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ شَاءَ اَنْ یَّرَاهُنَّ سَبَایَا اللہ کی مشیت یہ ہے کہ وہ قید ہوں۔[۵]

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۱۶، ۳۱۶، ۲۷۲، ۲۷۵۔ ج ۲، ص ۵۸۔ ج ۳، ص ۱۵۶، ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ قیام و انقلاب مہدی (عج) از دیدگاہ فلسفۂ تاریخ ص ۸۵۔ ۸۷۔ اس تحریک میں تبلیغی پہلو یعنی پیغام رسانی بھی ہے۔ یہ ایک تعارف اور اسلام شناسی ہے۔ (حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۸۹)

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۷۲

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ فی رحاب اہل البیت ج ۳، ص ۹۷۔ مناقب ابن شہر آشوب ج ۴، ص ۶۹

۴۔ بحار الانوار ج ۴۴، ص ۳۶۴۔ مقرم، مقتل الحسین ص ۱۹۵

۵۔ قرآن کریم میں لفظ مشیت و ارادہ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اصطلاحی طور پر ایک کو "ارادۂ تکوینی" اور دوسرے کو "ارادۂ تشریعی" کہا جاتا ہے۔ جس چیز کا تعلق اللہ کی حتمی قضا و قدر سے ہو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہو سکتا اور ارادۂ تشریعی سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی رضا اس میں ہے۔ (حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۱۷)

یہ بات معلوم ہے کہ امام حسینؑ کا معاملہ طے شدہ تھا۔ یہ ایک ذمے داری تھی۔ امام حسینؑ کے اصحاب میں سے عبداللہ بن عمیر کلبی، جنادہ بن حرث انصاری اور مسلم بن عوسجہ کے سوا کسی کے اہل و عیال ساتھ نہیں تھے۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا کردار[1]

تاریخ کربلا ایسی تاریخ ہے جس میں مردوں کے ساتھ خواتین کا بھی کردار ہے۔ مردوں نے اپنے اور خواتین نے اپنے دائرہ کار میں رہ کر تحریک کربلا میں حصہ لیا۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاصر دنیا اسے قبول کرے اور دوزخ کو قبول نہ کرے۔ دنیا کو آخرکار اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔[2]

ہماری مذہبی اور دینی تاریخ میں بہت سے ہیرو گزرے ہیں جنھوں نے مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ تاریخ اسلام کی وہ خواتین جو پوری انسانیت کے لیے سرمایہ افتخار ہیں ان میں حضرت زینب کبریٰ سرفہرست ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کربلا کے خونی واقعات نے شہزادی کو آبدیدہ فولاد کی طرح مضبوط کر دیا تھا۔[3]

جس زینبؑ نے دامن زہراؑ اور تربیت علیؑ سے عظمت پائی تھی وہ اور تھی[4] اور جو زینبؑ کربلا میں وارد ہوئی وہ اور تھی اور جو زینبؑ شام سے لوٹ کر مدینہ میں آئی وہ اور تھی۔ جب زینبؑ شام سے واپس آئیں تو آپ رُشد یافتہ اور خالص تر تھیں۔[5] کربلا کے بعد زینب کبریٰؑ کی شخصیت پہلے سے زیادہ عظمت کے ساتھ نمودار ہوئی[6] جب امام حسینؑ زندہ تھے اور معاملات کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں نہیں تھی تو وہ زینبؑ اور تھیں اور بھائی کی شہادت کے بعد جب آپ قید ہوگئیں اور تمام قیدیوں کی ذمے داری آپ کے کاندھوں پر پڑی تو آپ بھائی کی زندگی والی زینبؑ نہ رہیں۔[7]

امام حسینؑ اپنے اہل بیت کو ساتھ لے کر سفر کرتے ہیں... تاکہ اس عظیم تاریخ کی تعمیر میں اُن کا براہ راست حصہ ہو... عصر عاشور سے زینب کبریٰؑ جلوہ فگن ہوتی ہیں... آپ سردار قافلہ ہیں کیونکہ اس قافلے میں واحد مرد امام زین العابدینؑ ہیں جو سخت بیمار ہیں اور جنھیں تیمار دار کی ضرورت ہے۔

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۳۸۰ ۔ ۳۸۱

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۳۱۶ ۔ ۳۱۸

۳۔ بیست گفتار ص ۱۹۵

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۷۶

۵۔ بیست گفتار ص ۱۹۵

۶۔ حماسہ حسینی ج ۱، ص ۱۷۶

۷۔ بیست گفتار ص ۱۹۵

۱۱ محرم عصر کے وقت قیدیوں کو لایا گیا اور اُنھیں ایسی سواریوں پر بٹھایا گیا جن کے پالان لکڑی کے تھے۔ اس کا مقصد آل محمدؐ کو زیادہ سے زیادہ اذیت دینا تھا... جب وہ مقتل سے گزارے گئے تو اُنھوں نے اپنے آپ کو بے اختیار سواریوں سے گرادیا...

عمر سعد[1] نے اپنے سپاہیوں کے نجس لاشے دفن کرائے لیکن امام حسینؑ کے ساتھیوں کو دفن نہ کیا گیا۔ بعد میں قیدیوں کو کربلا سے نجف لایا گیا۔ یہ تقریباً بارہ فرسخ کا فاصلہ تھا۔ وہ ۱۲ محرم کو طبل اور ڈھول بجاتے اپنی فتح کا جشن مناتے قیدیوں کو کوفہ لے آئے۔ اُنھوں نے بزعم خویش خاندان پیغمبرؐ پر یہ آخری ضرب لگائی تھی۔

یزیدی لشکر آل محمدؐ کو قید کر کے کوفہ میں داخل ہوا۔ ان قیدیوں میں حضرت زینبؑ بھی شامل تھیں جو ۹ محرم سے آرام نہیں کر سکی تھیں۔ (طلوع آفتاب کے دو تین گھنٹوں بعد) قیدیوں کو کوفہ لایا گیا تو حکم دیا گیا کہ قیدیوں کے استقبال کے لیے شہدائے کربلا کے مقدس سروں کو لایا جائے۔ ایک عجیب صورت حال تھی جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت زینب کبریٰؑ نے کوفہ کے دروازے پر خطبہ دیا۔ راوی کہتا ہے: وَلَمْ اَرَ وَاللّٰهِ خَفِرَةً قَطُّ اَنْطَقَ مِنْهَا خدا کی قسم میں نے کسی باحیا پردہ دار بی بی کو اُن سے بڑھ کر گفتگو کرنے والا نہیں دیکھا۔[2] آپ کے خطبے میں زنانہ حیا اور شجاعت علیؑ دونوں جمع تھیں۔

یہ وہی کوفہ ہے جہاں بیس سال پہلے حضرت علیؑ خلیفہ تھے... اہل کوفہ میں آپ کے خطبات ابھی تک ضرب المثل کا درجہ رکھتے تھے۔ روای کہتا ہے... جیسے علیؑ زندہ ہو گئے ہوں اور بی بی کی زبان سے بول رہے ہوں۔ جب بی بی کا خطبہ جو طویل نہیں تھا (دس بارہ سطروں سے زیادہ نہیں تھا) تمام ہوا[3] تو اہل کوفہ دانتوں تلے انگلیاں دبانے لگے۔ اسلام عورت کے اس کردار کا متقاضی ہے کہ وہ حیا، عفت اور پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے کلمۂ حق بلند کرے۔[4]

بیان کیا جاتا ہے کہ آل محمدؐ کے قیدیوں کا قافلہ ۲ رصفر کو شام پہنچا۔ اس حساب سے حضرت زینبؑ کو قید ہوئے ۲۲ دن گزر چکے تھے۔ اس پورے عرصے میں آپ نے مسلسل دُکھ درد جھیلے تھے۔ بی بی کو یزید کے دربار میں لایا گیا... غم پہ غم اُٹھانے والی زینبؑ جب یزید کے دربار میں پہنچیں تو آپ کی روح میں ایک ایسی شجاعت در آئی کہ یزید اپنی تمام تر فصاحت و بلاغت کے باوجود گنگ ہو کر رہ گیا۔ یزید اس وقت (عبداللہ) ابن زبعری (سہمی) کے اشعار پڑھ کر اپنی کامیابی پر فخر کر رہا تھا۔ یکایک حضرت زینبؑ کی آواز گونجی۔

۱۔ ابن سعد کے لشکر کی کیفیت جاننے کے لیے حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۱۶۷ ۔ ۱۶۸ کا مطالعہ فرمائیں۔

۲۔ بحار الانوار ج ۴۵، ص ۱۰۸ ۔ مقرم، مقتل الحسین ص ۳۰۲ ۔ مقتل خوارزمی ج ۲، ص ۴۰ ۔ سید ابن طاوس، لہوف ص ۶۳

۳۔ احمد بن ابی طاہر المعروف بہ ابن طیفور، بلاغات النساء ص ۲۳ ۔ سید جعفر شہیدی، قیام حسینؑ ص ۱۸۲

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۳۳۲ ۔ ۳۳۷ ۔ ص ۱۸۳ ۔ ۱۸۹

... اے یزید! تو کن خیالوں میں ہے۔ تیرے دماغ میں بہت ہوا بھر گئی ہے شمخت بأنفك تو ذلیل و رسوا ہو۔ تو نے ہمیں قید کر کے اور ہم پر زمین تنگ کر کے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم تیرے کارندوں کی مٹھی میں آچکے ہیں اور تو یہ خیال کر رہا ہے کہ خدا کی طرف سے تجھے نعمت اور فضیلت مل چکی ہے؟ خدا کی قسم! تو اس وقت بھی میری نگاہوں میں بہت حقیر، ذلیل اور پست ہے۔ میں تجھے ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتی۔[1]

... یزید اسی شام، میں اپنی روش بدلنے پر مجبور ہو گیا (چنانچہ شام میں اہل حرم کی آمد کے چند دن بعد اُس نے حکم دیا کہ) قیدیوں کو احترام کے ساتھ (نعمان بن بشیر کی سرکردگی) میں مدینہ بھیج دیا جائے۔ اور یہ کہ وہ قتل امام حسینؑ سے اپنی بیزاری کا اعلان کرے اور کہے کہ خدا ابن زیاد پر لعنت کرے، میں نے اُسے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ اُس نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا۔[2] یزید کو اپنی روش بدلنے پر کس نے مجبور کیا تھا؟ یہ کام حضرت زینب کبریٰؑ نے کیا تھا۔

سیدہ زینبؑ نے اپنے خطبے میں فرمایا:

... اے یزید میں تجھ سے کہتی ہوں کہ تو نے جو بھی مکر و فریب کرنا ہے، کر لے اور اپنی سی پوری کوشش کر کے دیکھ لے۔ خدا کی قسم! تو ہمارے نام کو دنیا سے مٹا نہ سکے گا۔ ہمارا نام مٹنے والا نہیں ہے۔ اس کی بجائے تو ہی مٹ جائے گا۔[3]

قیام حسینی کو زندہ رکھنے کا فلسفہ

ائمہ طاہرینؑ کے اس حکم کا فلسفہ کیا ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کی یاد کو ہمیشہ زندہ اور قائم رکھا جائے اور اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے...

ہم شیعوں کے عقیدے کے مطابق دین کا کوئی بھی حکم حکمت اور فلسفے سے خالی نہیں ہوتا۔[4] ائمہ اطہارؑ (حتیٰ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے) نے فرمایا کہ اس قیام کو ہمیشہ زندہ رکھنا چاہیے اور اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ لوگوں کو امام حسینؑ پر گریہ کرنا چاہیے۔ آخر اس فرمان کا مقصد کیا ہے؟

ہم نے اس کے حقیقی مقصد کو مسخ کر دیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پرسہ دینے سے حضرت زہراؑ کی تسلی ہوتی ہے حالانکہ وہ اپنے عظیم فرزند کے ساتھ جنت میں ہیں... بھلا اس سے بڑھ کر حضرت زہراؑ کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے؟...

۱۔ بحار الانوار ج ۴۵، ص ۱۳۳۔ مقرم، مقتل الحسینؑ ص ۳۶۲۔ سید ابن طاؤس، لہوف ص ۷۶

۲۔ سید جعفر شہیدی، قیام حسینؑ ص ۱۸۷۔ ۱۸۹

۳۔ حماسہ حسینی ج ۱، ص ۱۷۷۔ ۱۷۹۔ بحار الانوار ج ۴۵، ص ۱۳۵۔ لہوف ۷۷

۴۔ دو گفتار ص ۲۲۷۔ حماسہ حسینی ج ۲، ص ۹۰۔ ۹۳

ائمہ طاہرینؑ نے عزائے حسینؑ کو ہر حال میں زندہ رکھنے کا جو حکم دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ امام حسینؑ کا ہدف مقدس تھا۔[۱] ائمہ طاہرینؑ چاہتے تھے کہ شہادت حسینؑ ایک مکتب اور ایک شمع فروزاں کی طرح ہمیشہ باقی رہے کیونکہ یہ حق، حقیقت دوستی اور حقیقت خواہی کا چراغ ہے۔ یہ حق طلبی اور آزادی کی پکار ہے۔ یہ حریت کے علاوہ ظلم کے ساتھ ٹکرانے کا مکتب ہے۔ اسی لیے ائمہ طاہرینؑ چاہتے تھے کہ یہ مکتب ہمیشہ زندہ رہے۔

ائمہ طاہرینؑ کے زمانے میں یہ حکم جاری ہوا تو ذکر حسینؑ ایک زندہ و فعال تحریک اور انقلاب کا سبب بن گیا۔ نام حسینؑ ظلم کے خلاف انقلاب کی علامت بن گیا۔ اس سے کیت اسدی اور دعبل خزاعی جیسے انقلابی شعراء پیدا ہوئے... کیت اسدی کے اشعار بنی امیہ کے لیے کسی بھی لشکر کے حملے سے کم نہیں تھے...

عبداللہ بن حسن بن (حسن بن) علی جنھیں ''عبداللہ محض'' کہا جاتا ہے وہ کیت کے اشعار سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے اپنے زرعی اراضی کی ملکیت اُن کے نام لکھ دی...

ان آتشین اشعار اور مرثیہ گوئی کی وجہ سے کیت کو کیا کیا تکالیف اٹھانی پڑیں اور اُنھیں کس بے دردی سے قتل کیا گیا تھا؟ اس مرد حق کو بنی امیہ کے حکام نے گرفتار کیا اور (حاکم کوفہ) یوسف بن عمر ثقفی کے گھر میں آٹھ افراد نے اُنھیں اذیتیں دیں اور اُن کے جسم پر تلواروں کے وار کیے۔ کیت کے آخری الفاظ یہ تھے:

''خدایا اہل بیت پیغمبرؐ۔ خدایا اہل بیت پیغمبرؐ...''

کیا آپ حضرات دعبل بن علی خزاعی کو جانتے ہیں؟ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں پچاس سال سے اپنی صلیب اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے چل رہا ہوں... ان شعراء نے بنی اُمیہ اور بنی عباس پر اتنی سخت تنقید کی کہ اُن کے ہوش اُڑ گئے... ائمہ اطہارؑ نے امام حسینؑ کے نام نامی اور اُن کی عزاداری کو زندہ رکھنے کا حکم دیا جس کی وجہ سے کیت اور دعبل جیسے شعراء پیدا ہوئے اور جنھوں نے متوکل عباسی جیسے ظالم حکمراں کو پریشان کیے رکھا۔ متوکل جانتا تھا کہ ان میں سے ہر شاعر اُس کے خلاف ایک لشکر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ائمہ اطہارؑ نے اپنے ارشادات اور احکامات کے ذریعے امام حسینؑ کے نام اور کام کو مرنے نہیں دیا۔ اُنھوں نے امام حسینؑ کو ایک فکر، ایک مکتب اور ظلم کے خلاف جہاد کی علامت کے طور پر زندہ رکھا۔[۲]

عاشورا کے تاریخی شعار

شعار دراصل اُس شعر یا نثر کے جملے کو کہا جاتا ہے جو جنگ میں پڑھا جاتا تھا... جب دو افراد آپس میں جنگ کرتے تو اُن کے سر پر خود ہوتا تھا اور وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اُن کی پہچان کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قوم

۱۔ حماسہ حسینی ج ۱، ص ۷۸ ۔ ۸۰

۲۔ دہ گفتار ص ۲۵۱ ۔ ۲۵۴ ۔ حماسہ حسینی ج ۱، ص ۸۰

اور ہر لشکر اپنے لیے ایک شعار مخصوص کر لیتا تھا... اس طرح طرفین کے لشکریوں کی پہچان ہو جاتی تھی اور کوئی سپاہی اپنے لشکر کے آدمی پر تلوار نہیں اٹھاتا تھا...

جب سپاہی اپنے لشکر کا شعار بلند کرتا تو اپنا ذاتی تعارف بھی کراتا تھا...

عاشورا کے واقعات میں ہمیں بہت زیادہ شعار دکھائی دیتے ہیں... خصوصاً امام حسینؑ کے اپنے شعار جو انتہائی موثر ہیں جبکہ لوگ عام طور پر اپنا تعارف ایک رجز یا ایک رباعی سے کراتے تھے۔ بعض اوقات ایسے کلمات بھی کہتے تھے جن سے اپنی جدوجہد کا تعارف مقصود ہوتا تھا۔ اہم مسئلہ یہ ہے کہ امام حسینؑ نے روز عاشور بہت سے شعار دیے تھے جن میں آپ نے اپنی جدوجہد کا مقصد بیان کیا تھا۔

عاشورا میں ہمیں دو قسم کے شعار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جن میں صرف اپنی ذات کا تعارف کرایا گیا ہے... لیکن دوسری طرح کے شعار وہ ہیں جن میں اپنی ذات کے علاوہ اپنی تحریک، اپنی فکر اور اپنے نظریے اور آئیڈیالوجی کا تعارف بھی کرایا گیا ہے... امام حسینؑ نے روز عاشور مختلف اشعار پڑھے تھے۔ آپ نے مختلف آہنگ کے اشعار کہے تھے۔[1]

امام حسینؑ کے شعار احیائے اسلام کے شعار تھے۔[2]

(۱) تحریک کربلا کا تعارف، اقوالِ امام حسینؑ کی روشنی میں

(الف) اَلَا وَاِنَّ الدَّعِیَّ ابْنَ الدَّعِیِّ قَدْ رَکَزَ بَیْنَ اثْنَتَیْنِ بَیْنَ السِّلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَهَیْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ یَاْبَی اللّٰهُ ذٰلِکَ لَنَا وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَحُجُوْرٌ طَابَتْ وَطَهُرَتْ[3] اے لوگو! یہ حرام زادے باپ کا حرام زادے بیٹے نے مجھے دو باتوں کے درمیان لا کھڑا کیا ہے موت یا ذلت میں سے ایک کا انتخاب جبکہ ذلت ہم سے کوسوں دور ہے... کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بھی اُس جیسا ہوں اور اُس کے ماں باپ جیسے ماں باپ کی گود میں پل کر بڑا ہوا ہوں؟ خدا کو ہماری ذلت منظور نہیں۔ کیا وہ زنا زادہ نہیں جانتا کہ میں نے کس دامن میں پرورش پائی ہے؟ میں نے دامن پیغمبرؐ میں بڑا ہوا ہوں۔ میں علی مرتضیٰؑ کی گود کا پالا ہوں۔ میں نے فاطمہ زہراؑ کا دودھ پیا ہے۔ کیا فاطمہ زہراؑ کا دودھ پینے والا ابن زیاد کے سامنے ذلت قبول کر سکتا ہے؟[4]

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۰۹ ۔ ۲۱۵

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۲۲

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۳۲ ۔ تحف العقول ص ۲۴۱

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۱۶ ۔ ۲۱۷

(ب) أَلَا تَرَوْنَ أَنَّ الْحَقَّ لَا يُعْمَلُ بِهِ وَأَنَّ الْبَاطِلَ لَا يُتَنَاهَى عَنْهُ لِيَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فِي لِقَاءِ اللَّهِ مُحِقًّا[1]
اے لوگو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ قوانین خدا کو پامال کیا جا رہا ہے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر طرح کی برائیاں اور خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں مگر کوئی ان سے روکنے والا نہیں؟ ان حالات میں مومن کو چاہیے کہ وہ اپنی جان سے گزر جائے اور لقائے پروردگار کی خواہش کرے۔[2]

(ج) النَّاسُ عَبِيدُ الدُّنْيَا وَالدِّينُ لَعْقٌ عَلَى أَلْسِنَتِهِمْ يَحُوطُونَهُ مَا دَرَّتْ مَعَايِشُهُمْ فَإِذَا مُحِّصُوا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الدَّيَّانُونَ لوگ دنیا کے غلام ہیں اور دین اُن کی زبان کا ایک چسکا ہے۔ جب تک اُن کی زندگی چین میں گزرتی ہے وہ دین کی حمایت کرتے ہیں اور جب امتحان کا وقت آتا ہے تو دین دار کم رہ جاتے ہیں۔[3]

(د) لَا وَاللَّهِ لَا أُعْطِيكُمْ بِيَدِي إِعْطَاءَ الذَّلِيلِ وَلَا أَفِرُّ فِرَارَ الْعَبِيدِ[4] میں اپنا ہاتھ ذلت کے ساتھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح میدان سے بھاگوں گا۔[5]

(ہ) إِنِّي لَا أَرَى الْمَوْتَ إِلَّا سَعَادَةً وَالْحَيَاةَ مَعَ الظَّالِمِينَ إِلَّا بَرَمًا[6] میری نظر میں موت سعادت ہے میں راہ حق میں مرنے کو سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو ذلت سمجھتا ہوں۔ میری روح کسی بھی ظالم کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔[7]

(و) أَيُّهَا النَّاسُ! مَنْ رَأَى سُلْطَانًا جَائِرًا مُسْتَحِلًّا لِحُرَامِ اللَّهِ، نَاكِثًا لِعَهْدِ اللَّهِ مُسْتَأْثِرًا لِفَيْءِ اللَّهِ، مُعْتَدِيًا لِحُدُودِ اللَّهِ، فَلَمْ يُغَيِّرْ عَلَيْهِ بِقَوْلٍ وَلَا فِعْلٍ كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مُدْخَلَهُ. أَلَا وَإِنَّ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ قَدْ أَحَلُّوا حَرَامَ اللَّهِ وَحَرَّمُوا حَلَالَهُ، وَاسْتَأْثَرُوا فَيْءَ اللَّهِ اے لوگو! جو کوئی ایسے ظالم بادشاہ کو دیکھے جو حرام خدا کو حلال جانتا ہو، خدا کے ساتھ عہد کو توڑ ڈالتا ہو، فے کو (خاندان پیغمبرؐ کا مخصوص حق) اپنے لیے مخصوص کرنے والا ہو اور حدود الٰہی کو پامال کرنے والا ہو، اس کے باوجود اگر کوئی اپنے قول و فعل سے اس کی مخالفت نہ کرے تو خدا کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ایسے شخص کو اسی ظالم کی سی سزا دے۔ اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ بنی اُمیہ نے حرام خدا کو حلال اور حلال خدا کو حرام بنا لیا ہے اور اُنھوں نے مال فے کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔[8]

۱۔ بحار الانوار ج ۴۴، ص ۱۹۲۔ تحف العقول ص ۲۴۵
۲۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۱۳۳
۳۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۵۱۔ تحف العقول ص ۲۵۰۔ مقرم، مقتل الحسین ص ۲۳۱۔ خوارزمی، مقتل الحسین ص ۲۳۷
۴۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۹۷۔ مقرم، مقتل الحسین ص ۲۸۰ و ۲۸۷۔ سید ابن طاؤس، لہوف ص ۴۱
۵۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۲۹۸
۶۔ بحار الانوار ج ۴۴، ص ۱۹۲۔ لہوف ص ۷۹۔ تحف العقول ص ۲۴۵
۷۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۱۳۴
۸۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۱۳۴۔ تاریخ طبری ج ۴، ص ۳۰۴

(۲) اپنے تعارف کے جملے اور اقوال

أنا الحسين بن علي آليت أن لا أنثني
أحمي عيالات أبي أمضي على دين النبي

میں علیؑ کا بیٹا ہوں۔ میں قسم کھا چکا ہوں کہ واپس نہ جاؤں گا۔ میں اپنے بابا کے خاندان کی حفاظت کروں گا اور دین پیغمبرؐ پر قائم رہوں گا۔[1]

امام کے شعار مختلف آہنگ کے ہیں۔ جب میدان جنگ میں تنہا کھڑے ہوتے تو بلند آواز میں شعار پڑھتے جن کا وزن طولانی ہوتا تھا مثلاً

أنا ابن علي الطهر من آل هاشم كفاني بهذا مفخرًا حين أفخر

میں صاحب تطہیر علیؑ کا فرزند ہوں۔ میرا تعلق بنی ہاشم سے ہے۔ جب میں فخر کرنا چاہوں تو میرے فخر کے لیے یہی کافی ہے۔[2]

جب آپ حملہ کرتے تو حملے کی مناسبت سے شعار پڑھتے مثلاً

ألموت أولى من ركوب العار والعار أولى من دخول النار

ننگ و عار قبول کرنے سے موت بہتر ہے اور دوزخ میں جانے سے ننگ و عار کا قبول کرنا بہتر ہے۔[3]

قیام امام حسینؑ کے نتائج

(۱) روز عاشور بیعت مقتدرہ کے خلاف پہلا چیلنج

امام حسینؑ کو اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ روز عاشور جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ سب خدا کے نام پر دے دیا جائے۔ پھر روز عاشور سے ہی میری بوئی ہوئی فصل تیار ہونا شروع ہوگی۔ چنانچہ جو کچھ آپ نے سوچا تھا وہی ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی امام حسینؑ شہید ہوئے لوگوں کو خاندان نبوت سے ہمدردی پیدا ہوئی اور بنی امیہ کے خلاف نفرت کے تلاطم خیز جذبات پیدا ہونا شروع ہوئے۔

سب سے پہلے یہ کام لشکر اعداء سے تعلق رکھنے والی ایک عورت نے کیا۔ عصر عاشور جب اُس نے دیکھا کہ لشکر اہل حرم کے خیموں پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہا ہے تو اُس نے ایک لکڑی اُٹھائی اور دوڑتی ہوئی

۱۔ مقرم، مقتل الحسین ص ۳۳۵

۲۔ منتہی الآمال ج ۱، ص ۲۸۲

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۲۲۳۔ مقرم، مقتل الحسین ص ۳۳۵

خیام کے دروازے پر آئی۔ وہ اپنے قبیلے بکر بن وائل کو آوازیں دینے لگی: اے آل بکر بن وائل! اے میرے قبیلے والو! اے میرے رشتے دارو! کہاں ہو؟ ادھر آجاؤ اور آکر دیکھو کہ یہ لوگ حرم رسولؐ کا لباس بھی لوٹنا چاہتے ہیں۔[1]

(۲) کوفہ میں حکومت کے خلاف احتجاج

کوفہ میں حضرت علیؑ کے ایک صحابی تھے جن کا نام عبداللہ بن عفیف تھا۔ اُن کی ایک آنکھ جنگ جمل میں اور دوسری جنگ صفین میں ضائع ہوگئی تھی۔ وہ امام حسینؑ کے حامیوں میں سے تھے۔

(امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب) ابن زیاد نے مسجد کوفہ میں فتح کا اعلان کیا اور امام حسینؑ کو ناسزا کہا تو عبداللہ بن عفیف نے کھڑے ہوکر ابن زیاد کو سر عام رُسوا کیا۔ ابن زیاد نے اُنھیں سزا دینا چاہا تو اُن کی قوم والے اُنھیں بچا لے گئے۔ ابن زیاد نے اُن کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ روانہ کیا۔ عبداللہ نے دستے کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ آخرکار اُن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور شہادت پائی۔[2]

(۳) اسلامی معاشرے کے ضمیر کا احیاء

ہمیں اپنے آپ سے یہ ضرور پوچھنا چاہیے کہ امام حسینؑ کی شہادت اور اسلام کی تقویت اور دین کے اُصول وفروع کے زندہ ہونے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ معاویہ[3] سیاسی اور اقتصادی سختی کے ذریعے مسلمانوں کو تنگ کرتا تھا۔ اُس نے قتل و غارت، ایذا رسانی اور بھوک و افلاس مسلط کر کے لوگوں کو اپنی مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہونے سے باز رکھا ہوا تھا۔ اُس کی سیاست کا ایک پہلو نسلی تفریق کو ہوا دینا اور قبائل کی رقابت کو ازسرنو زندہ کرنا تھا۔ اُس نے لوگوں کو اُن کے ذاتی اور نسلی جھمیلوں میں ایسا غرق کیا کہ اُنھیں گرد و پیش کے حالات پر سوچنے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ اس طرح کی پالیسی کے ذریعے اُس نے لوگوں کی قوت کو بہت کمزور کر دیا تھا تاکہ اُس کی حکومت کو کسی طرف سے خطرہ نہ ہو۔

۱۔ محمود عقاد لکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد یزید پانی کا ایک گھونٹ بھی سکون کے ساتھ نہیں پی سکا کیونکہ واقعہ کربلا کے بعد اُسے اہل مدینہ سے جنگ کرنا پڑی تھی۔ اس سے عبداللہ بن زبیر نے خوب فائدہ اُٹھایا اور اُس نے بنی اُمیہ کے خلاف دل کھول کر پروپیگنڈا کیا۔ پھر مکہ کا واقعہ پیش آیا۔ بعد میں اُموی حکومت کے اختتام تک یعنی مسلسل ساٹھ برس تک یالثارات الحسین کے نعرے بلند ہوتے رہے اور ان نعروں نے بنی اُمیہ کی حکومت کی چولیں ہلا ڈالیں۔

(حماسہ حسینی ج ۳، ص ۱۵۵ ـ ۱۵۶)

۲۔ حماسہ حسینی ج ۲، ص ۱۷۳ ـ ۱۷۴۔ قیام امام حسینؑ کے نتائج کے لیے حسب ذیل کتابوں کی طرف فرمائیں۔ یاد ایام ج ۲، ص ۳۸ ـ ۵۰۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۲۲۰۔ ابن جریر طبری، تاریخ طبری ج ۶، ص ۲۶۳

۳۔ حماسہ حسینی ج ۲، ص ۱۱۱، ۱۵۷

اس کے علاوہ معاویہ نے درباری ملاؤں کے ذریعے جھوٹی احادیث بنوائیں اور دنیا طلب لوگوں کی زبانی آیات قرآن کی من پسند تاویل و تفسیر کو رائج کیا۔ اس طرح وہ لوگوں کو فریب دینے میں کامیاب ہوا اور انھیں یہ باور کرایا کہ اُس کی حکومت شرعی اور قانونی ہے۔ الغرض اس طرح کی غیر اسلامی سیاست کے ساتھ اس نے جبریہ اور مرجئہ جیسے فرقوں کی خوب حوصلہ افزائی کی جو عقیدے کے اعتبار سے سیاست معاویہ کے عین مطابق تھے۔ اُس کی ایسی پالیسیوں نے اسلامی معاشرے پر انتہائی برے اثرات مرتب کئے اور ان کی وجہ سے اسلامی معاشرے پر سکوت مرگ چھا گیا تھا۔

اس غلط سیاست کی وجہ سے اسلامی معاشرے کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا اور اسلام کے اعلیٰ اقدار ختم ہو گئے تھے اور ظلم و ستم کو چیلنج کرنے والے مسلمان بزدل، مفاد پرست اور حکومت کے کاسہ لیس بن گئے تھے۔[1] امام حسینؑ کی شہادت نے عالم اسلام میں نئی روح پھونکی۔ اسلام کا کھویا ہوا وقار بحال ہوا۔ اسلامی معاشرے میں یہ تبدیلی اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ نے اپنے دلیرانہ اقدامات سے مسلمانوں کی روح کو زندہ کیا تھا۔ آپ نے معاشرے میں سنت شہادت کا از سرِ نو احیاء کیا تھا اور دورِ عثمانؓ اور دورِ معاویہ میں جو غلامانہ ذہنیت پیدا ہوئی تھی اور جس نے پورے اسلامی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا آپ کے جرأت مندانہ اقدامات سے وہ غلامانہ ذہنیت کمزور ہوئی اور خوف مرگ سے لوگوں کو آزادی ملی۔ احساس ذلت ختم ہوا۔ چنانچہ آپ کی شہادت کی وجہ سے اسلامی معاشرے کی نشاۃ ثانیہ ہو گئی۔

(۴) ہیئت مقتدرہ کی رسوائی

بنی اُمیہ کے حکمران اپنی حکومت کو دینی رنگ دیتے تھے اور اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے نام سے اسلامی حکومت پر قابض تھے اور یہ لوگ مختلف طریقوں سے اپنی دینی حیثیت کو تسلیم کراتے تھے۔ امام حسینؑ کے قیام نے اس حکومت کے چہرے سے نقاب الٹ دی اور اس وقت کی ہیئت مقتدرہ کو رسوا کیا۔[2]

(۵) خلفاء اور ہیں، اسلام اور ہے

امام حسینؑ کے قیام کا بہت بڑا اثر یہ ہوا کہ آپ نے اپنے قیام کے ذریعے پوری دنیا کو یہ باور کرایا کہ خلیفہ کے خلاف قیام اور بات ہے اور اسلام کے خلاف قیام اور چیز ہے (دونوں لازم و ملزوم نہیں ہیں لہٰذا خلیفہ کے خلاف قیام کو اسلام کے خلاف قیام نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ خلیفہ اور ہے اور اسلام اور ہے)۔ اگر امام حسینؑ یزید کے خلاف قیام نہ کرتے تو یہ بھی ممکن تھا کہ یزید کی خرابیوں اور غلط سیاست کی وجہ سے ایسے لوگ یزید کے خلاف قیام کرتے جن کا اسلام سے کوئی واسطہ ہی نہ ہوتا۔

۱۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۱۳۶ (معمولی تلخیص کے ساتھ)

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۶۱ ۔ ۱۶۳۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۲۱۳

اگرچہ ہمیں تاریخ اسلام میں خلفاء کے خلاف بہت سی تحریکیں دکھائی دیتی ہیں مگر ان میں حمایت اسلام کا پہلو بھی موجود تھا جیسا کہ بنی اُمیہ کے خلاف اہل ایران کا قیام۔ ہمیں یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ امام حسینؑ ہی دنیائے اسلام کی پہلی شخصیت تھے جنھوں نے ظالم خلیفہ کے خلاف مسلح جدوجہد کی تھی اور آپ نے پہلی بار دنیا کو یہ بتایا کہ اسلام اور ہے، حکمران اور ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے خلافت کے خلاف قیام کو اسلامی نظر سے واضح کیا تھا۔ چنانچہ آپ کا قیام دوسروں کے لیے نمونہ قرار پایا۔ خلفاء کے متعلق جو یہ تصور پایا جاتا تھا کہ وہ اسلام کے نمائندے ہیں آپ کے اقدام نے اس تصور کو مٹا دیا اور ثابت کیا کہ خلیفہ ہمیشہ دین کا حامی نہیں ہوتا بلکہ وہ دین کا مخالف بھی ہوسکتا ہے۔[1]

(۶) عثمان بن زیاد کا اعتراض

عبید اللہ ابن زیاد جیسے بدبخت کے بھائی عثمان نے ابن زیاد سے کہا: بھائی! کاش زیاد کی تمام اولاد فقر ذلت، بدبختی اور افلاس سے دوچار ہوتی لیکن ہمارے خاندان نے اتنا سنگین جرم نہ کیا ہوتا۔ ابن زیاد کی ماں مرجانہ ایک بدکار عورت تھی مگر جب اُس کے بیٹے نے امام حسینؑ کو شہید کرایا تو اُس نے اپنے بیٹے سے کہا: بیٹا! تو نے یہ کام تو کرلیا ہے لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جنت کی خوشبو بھی تیرے مشام تک نہیں پہنچے گی۔

(۷) دربار یزید میں مخالفت

شقی ازلی مروان بن حکم کے بھائی یحییٰ بن حکم نے دربار یزید میں امام حسینؑ کے قتل پر احتجاج کرتے ہوئے کہا: سبحان اللہ! سمیہ کی بیٹیاں تو محترم قرار پائیں لیکن تو آلِ محمدؐ کو اس حالت میں دربار میں لایا ہے؟ جی ہاں ان ظالموں کے گھروں سے بھی حسینی صدا بلند ہوئی۔

(۸) یزید کی بیوی کا احتجاج

آپ حضرات نے یزید کی بیوی ہند کی داستان سنی ہوئی ہے۔ وہ محل سے نکل کر دربار میں آئی اور اُس نے قتل امام اور اہل حرم کی اسیری پر سخت احتجاج کیا۔ مجبور ہوکر یزید کو یہ کہنا پڑا کہ میں اس کام پر ہرگز راضی نہیں تھا۔ میں نے یہ کام نہیں کیا۔ یہ سب کچھ عبید اللہ بن زیاد کا کیا دھرا ہے۔[2]

(۹) بنی امیہ کا زوال

بنی امیہ نے امام حسینؑ کو شہید اور اُن کے سر اطہر کو بدن سے جدا کرکے اپنے تئیں یہ سمجھا تھا کہ امام کی شہادت سے لوگوں کے دلوں میں اُن کی حکومت کی دھاک بیٹھ جائے گی اور اُن کی حکومت مضبوط ہوگی لیکن یہ اُن کی بھول تھی۔ اُنھیں بعد میں پتا چلا کہ زندہ حسینؑ کی نسبت شہید حسینؑ اُن کے لیے زیادہ خطرناک ثابت

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۳، ص ۹۷۔ ۹۸

۲۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۸۶

ہو رہے ہیں۔ تربت حسینؑ اہل دل کا کعبہ ہے۔ حضرت زینبؑ نے بھی یزید سے یہی فرمایا تھا۔[۱]

اُس زمانے کے مرثیہ گو موجودہ دور کے مرثیہ گو حضرات کی مانند نہیں تھے۔ اُس دور کے مرثیہ گو کمیت اور دعبل خزاعی جیسے شعراء تھے۔

جی ہاں یہ وہی دعبل ہیں جنھوں نے کہا تھا کہ میں پچاس سال سے اپنی صلیب اپنے کندھے پر اُٹھائے پھر رہا ہوں۔ اُنھوں نے کچھ اس انداز سے مرثیے کہے کہ اُموی اور عباسی خلفاء کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ محتشم جیسے نہ تھے۔ ہمارے شعراء تو چرخ و فلک کو شہادت امام حسینؑ کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔

ظالم خلفاء نے دیکھا کہ قبر حسینؑ اُن کے لیے دردسر بن چکی ہے تو اُنھوں نے آپ کی قبر مبارک کے نشان کو مٹانے کا ارادہ کیا۔ متوکل نے سترہ بار امام عالی مقام کی قبر مطہر کے تمام آثار مٹا دیئے تھے۔ اُس نے قبر کی زمین کو برابر کردیا تھا اور قبر پر پانی بہا دیا تھا تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہوسکے کہ قبر حسینؑ کس مقام پر تھی لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ قبر حسینؑ کی زیارت کے لیے لوگوں کی آمدورفت پہلے سے بھی بڑھ گئی۔

متوکل کی ایک بڑی مغنیہ تھی۔[۲] ایک مرتبہ متوکل نے اُس کو بلا بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ متوکل نے حکم دیا کہ پتا چلایا جائے کہ وہ کہاں گئی ہے؟ بتایا گیا کہ وہ کہیں سفر پر روانہ ہوئی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مغنیہ امام حسینؑ کی زیارت کے لیے گئی تھی۔ یہ سن کر متوکل کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اُسے یقین ہوگیا کہ وہ نام حسینؑ کو ہرگز لوگوں کے دلوں سے نہیں نکال سکتا۔[۳]

امام حسینؑ کی آخری پیش گوئی یہ تھی کہ یزید عنقریب اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔[۴] آپ کی شہادت کے بعد یزید نے دو تین سال حکومت کی لیکن اپنی حکومت کے دوران ذلت اور رسوائی اُس کا مقدر بن گئی تھی۔ پھر وہ مرگیا۔ معاویہ بن یزید اُس کا ولی عہد ہوا کیونکہ معاویہ بن ابی سفیان نے موروثی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ الغرض معاویہ بن یزید چالیس دن کے بعد منبر پر گیا اور لوگوں سے یوں خطاب کیا:

اے لوگو! میرے دادا معاویہ نے علی بن ابی طالبؑ سے ناحق جنگ کی جبکہ حق علیؑ کے ساتھ تھا۔

۱۔ بحار الانوار ج ۴۵، ص ۱۳۵۔ سید ابن طاؤس، الہوف ص ۷۷

۲۔ بڑی مغنیہ سے وہ عورت مراد ہے جو متوکل کے سامنے رقص کرتی اور گانا گاتی تھی اور دوسری رقاصاؤں کو تیار کرتی تھی۔ وہ تمام رقاصاؤں کی سربراہ تھی۔

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۲۵ ۔ ۱۲۶

۴۔ صرف یزید ہی نہیں مرا بلکہ خاندان ابوسفیان کا بہت جلد خاتمہ ہوگیا۔ بنی اُمیہ کی حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بنی عباس نے اُن سے اقتدار چھین لیا اور پانچ سو برس تک حکومت کی۔

(حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۸۵۔ الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ)

پھر میرے والد یزید نے حسینؑ بن علیؑ سے جنگ کی جبکہ حسینؑ حق پر تھے۔ میں اپنے باپ سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں اور میں اپنے آپ کو خلافت کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں اپنے باپ دادا کی طرح گناہوں کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا لہٰذا میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں۔

اُس نے اپنے اعلان پر عمل کیا اور خلافت سے کنارہ کش ہوگیا۔ یہ سب حسینؑ بن علیؑ کی طاقت تھی۔ یہ حقیقت کی طاقت تھی جس نے دوست و دشمن سب کو متاثر کیا تھا۔[۱]

(۱۰) واقعۂ حرہ

شہادت امام حسینؑ کے بعد واقعۂ حرہ اُمویوں کے بدترین جرائم میں سے ایک ہے۔ یہ واقعہ ۶۳ھ کو ذی الحجہ کی ۲۶ یا ۲۷ تاریخ کو پیش آیا۔

اہل مدینہ یزید کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یزید نے سپاہِ شام کو بھیج کر اہل مدینہ کو خاک و خون میں نہلا دیا تھا۔ یزید کے حکم سے مدینہ سپاہِ شام کے لیے حلال قرار پایا تھا۔ سپاہِ شام نے تین دن تک اہل مدینہ کا قتل عام کیا، اُن کے گھر لوٹے اور اُن کی عصمتیں برباد کیں اور اُنھوں نے ہر قسم کا ظلم و ستم ڈھایا۔

اُس وقت اہل مدینہ کو پتا چلا کہ یزید کون ہے اور اُس کی اصلیت کیا ہے؟

واقعۂ حرہ کا پس منظر کچھ یوں ہے۔

جب امام حسینؑ شہید ہوئے تو اہل مدینہ میں ایک اضطراب پیدا ہوا کہ حسینؑ بن علیؑ کو کیوں شہید کیا گیا؟ اہل مدینہ کے اکابرین کی ایک جماعت کو یزید اور اُس کی حکومت کا جائزہ لینے کے لیے شام بھیجا گیا (ان میں منذر بن زبیر بن عوام، عبیداللہ بن ابی عمرو مخزومی اور عبداللہ بن حنظلہ وغیرہ سرفہرست تھے)۔ اس وفد کے سربراہ عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ تھے۔ یہ لوگ مدینہ سے شام پہنچے اور دربار یزید میں گئے۔ کچھ عرصے تک شام میں قیام پذیر رہے۔ تب اُنھیں پتا چلا کہ معاملے کی اصلیت کیا ہے۔ پھر وہاں سے مدینہ[۲] واپس آئے۔ اہل مدینہ نے اپنے اکابرین سے پوچھا کہ تم نے شام میں کیا دیکھا؟

اُنھوں نے کہا: ہم تمھیں صرف اتنا ہی بتا سکتے ہیں کہ ہم جتنا عرصہ شام میں رہے ہمیں ہر وقت یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں آسمان سے ہمارے سروں پر پتھروں کی بارش نہ ہوجائے۔ اہل مدینہ پوچھنے لگے کہ بات کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ ہم ایسے خلیفہ کے پاس سے ہو کر آرہے ہیں جو علانیہ شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے، اُس نے شکار کے لیے چیتے سدھائے ہوئے ہیں، وہ کتوں اور بندروں سے کھیلتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ محارم سے زنا کرتا ہے۔

۱۔ حماسۂ حسینی ج ۲، ص ۸۶ - ۸۷

۲۔ اس وفد کا ایک رکن منذر بن زبیر بصرہ چلا گیا تھا۔ باقی سارے افراد مدینہ واپس آئے تھے۔

عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کے آٹھ بیٹے تھے۔ اُنھوں نے اہل مدینہ سے کہا کہ تم لوگ یزید کے خلاف قیام کرو یا نہ کرو، میں اپنے آٹھ بیٹوں سمیت اُس کے خلاف قیام کا اعلان کرتا ہوں۔ اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا اُس پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ واقعۂ حرہ[1] میں اُنھوں نے اپنے بیٹوں کو خود سے پہلے یزیدی لشکر سے مقابلے کے لیے بھیجا۔ وہ سب کے سب شہید ہوئے۔ اُن کے بعد وہ خود بھی شہید ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ دو تین سال قبل جب امام حسینؑ مدینہ سے یہ کہتے ہوئے نکل رہے تھے وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيدَ جب امت کا حاکم یزید جیسا شخص ہو تو اسلام کا خدا حافظ ہے[2] اُس وقت عبداللہ بن حنظلہ کہاں تھے؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) عبداللہ بن حنظلہ اُس وقت تک یزید کے کردار سے ناواقف تھے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ حسینؑ شہید ہوں تاکہ عالم اسلام میں اضطراب پیدا ہو اور عبداللہ بن حنظلہ اور اُن جیسے مدینہ و کوفہ اور دیگر مقامات پر رہنے والے سیکڑوں مسلمانوں کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ امام حسینؑ درست فرما رہے تھا۔[3]

(۱۱) توابین کا قیام

واقعۂ کربلا کے تین سال اور مرگ یزید کے ایک سال بعد کوفہ میں سلیمان بن صرد خزاعی کی قیادت میں ایک تحریک چلی جس کا نعرہ یالثارات الحسین (خونِ حسینؑ کے انتقام کے لیے اُٹھو) تھا۔ اس میں عراق کے اکابر شیعہ مثلاً مسیب بن نجبہ فزاری، رفاعہ بن شداد بجلی، عبداللہ بن سعد نفیل ازدی، عبداللہ بن وال تیمی اور بصرہ اور مدائن کے کچھ معززین مثلاً مثنی بن مخرمہ عبدی اور سعد بن حذیفہ یمانی شامل تھے (اور توابین کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی گئی)۔ اُن لوگوں نے جمادی الاوّل اور ایک روایت کے مطابق ربیع الاوّل ۶۵ھ میں قیام کیا تھا۔[4]

پانچ ہزار "تواب" کوفہ سے اس تحریک میں شامل ہوئے۔ وہ کوفہ سے امام حسینؑ کی قبر مطہر پر گئے اور وہاں عزاداری کی، گریہ کیا اور اپنے قصور پر خدا سے توبہ کی اور کہا کہ جب تک ہم خون حسینؑ کا انتقام نہیں لیں گے اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس راہ میں یا ہم خود مر جائیں گے یا قاتلانِ امام سے انتقام لیں گے۔ چنانچہ توابین نے بہت سے قاتلین حسینؑ کو قتل کیا۔ اس تحریک کی شروعات عصر عاشور اور ۱۲ محرم سے ہی ہو گئی تھی۔ یہ کام کس نے سرانجام دیا تھا؟ جواب یہ ہے کہ یہ کام امام حسینؑ نے خود سرانجام دیا تھا۔

۱۔ مروج الذہب ج ۳، ص ۶۸ ۔ ۷۱

۲۔ سید ابن طاووس، لہوف ص ۲۳۔ فی رحاب الائمۃ اهل البیت ج ۳، ص ۷۴

۳۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۱۷۱

۴۔ حماسۂ حسینی ج ۱، ص ۷۳ ۔ ۷۵۔ ج ۲، ص ۸۵۔ سید جعفر شہیدی، تاریخ تحلیلی اسلام تا پایان اُمویان ص ۱۷۰۔
ابن قتیبہ دینوری، الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۲۲۰۔ بلاذری، انساب الاشراف ج ۴، ص ۳۰ ۔ ۳۶

(۱۲) قیام مختار

جب حضرت مسلم بن عقیل کوفہ آئے تھے تو مختار بن ابی عبیدہ ثقفی نے اُن کی حمایت کی تھی مگر ابن زیاد نے اُنھیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا تھا۔ واقعۂ کربلا کے بعد اُن کے بہنوئی عبداللہ بن عمر نے یزید سے مختار کی سفارش کی تو اُنھیں رہا کر دیا گیا۔ جب مختار رہا ہوئے اُس وقت عبداللہ بن زبیر مکہ میں قیام کر چکے تھے اور اپنے آپ کو خلیفۃ المسلمین کہلواتے تھے۔ مختار سیدھے مکہ گئے اور ابن زبیر کے ساتھ مل گئے۔ بعدازاں ۶۴ھ میں مرگ یزید کے پانچ ماہ بعد مختار کوفہ آئے اور بنی اُمیہ کے خلاف اپنی تحریک کا آغاز کیا۔[۱] مختار دنیائے شیعیت کی درخشاں شخصیت ہیں۔[۲] اُنھوں نے ربیع الاول ۶۶ھ میں اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا۔

امام زین العابدینؑ نے محمد بن حنفیہ کے توسط سے مختار کو قیام کی اجازت دی تھی[۳] اور تقیہ کی وجہ سے اس قیام میں حصہ نہیں لیا۔ مختار نے ابراہیم بن مالک اشتر جیسے بہادر نیز عراق کی ممتاز شخصیات اور محمد بن حنفیہ کی رہبری میں بنی اُمیہ کی فوج سے جنگ کی اور بنی اُمیہ سے امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب باوفا کا انتقام لیا۔

(۱۳) قیام زید بن علیؑ

امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کے انتقام کے لیے جتنی بھی تحریکیں چلیں اُن میں ہشام بن عبدالملک کے خلاف حضرت زید شہید کی تحریک کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔[۴] امام جعفر صادقؑ نے زید کے متعلق فرمایا کہ خدا زید پر رحم کرے۔ وہ سچے[۵] عالم، مرد مومن، عارف دانش مند اور دیانت دار[۶] تھے۔ خدا کی قسم! میرے چچا زید راہِ حق کے مسافر تھے۔ وہ اُن شہداء کے راستے پر چل رہے تھے جنھوں نے رسول خدا ﷺ، امام علیؑ اور امام حسینؑ کے شانہ بشانہ جام شہادت نوش کیا۔[۷]

حضرت زید کے قیام کے مقاصد حسب ذیل تھے:

(۱) شہیدانِ کربلا کے خون کا انتقام۔

(۲) امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور موجودہ حالات کی تبدیلی۔

(۳) اسلامی حکومت تشکیل دینے کے بعد ائمہ معصومینؑ کے سپرد کرنا۔

حضرت زید نے ۳ صفر ۱۲۱ھ کو جام شہادت نوش کیا۔ ان کا بے سر لاشہ چار سال تک صلیب پر لٹکا رہا۔[۸]

۱۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۲۲۶۔ ابو عباس مبرد، الکامل فی اللغۃ والادب ج ۲، ص ۱۱۲ ۔ ۱۱۶

۲۔ علامہ امینی، الغدیر ج ۲، ص ۳۴۳ ۔ ۳۳۵ ۳۔ منتخب التواریخ ص ۳۵۳

۴۔ ہشام بنی امیہ کا دسواں خلیفہ تھا۔ اُس نے ۲۰ سال حکومت کی اور ۵۳ برس کی عمر میں مرگیا۔ (تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۳۲۸)

۵۔ علامہ امینی، الغدیر ج ۲، ص ۲۲۱ ۶۔ علامہ امینی، الغدیر ج ۳، ص ۷۰۔ رجال کشی ص ۱۸۴

۷۔ مامقانی، تنقیح المقال ج ۱، ص ۴۶۸۔ سفینۃ البحار ج ۱، مادہ (ز)

۸۔ تاریخ یعقوبی ج ۳، ص ۶۷ ۔ ۷۰۔ شیخ صدوق، امالی ص ۳۹۲۔ شیخ طوسی، امالی ص ۲۷۷۔ بحار الانوار ج ۴۶، ص ۱۷۲

امام سجادؑ اور امام باقرؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام سجادؑ کی حیاتِ مبارکہ

قولِ مشہور کے مطابق امام علی زین العابدینؑ، جن کا لقب سجاد بھی ہے، ۵ رشعبان ۳۸ھ میں مدینہ میں متولد ہوئے۔ آپ نے ۳۵ برس امامت کی ذمے داریاں نبھائیں۔ ۵۷ برس کی عمر میں ۱۲ ریا ۲۵ رمحرم ۹۵ھ میں ہشام کی شکایت اور ولید بن عبدالملک کے حکم پر آپ کو زہر دیا گیا جس کی وجہ سے آپ کی شہادت واقع ہوئی اور آپ بقیع میں دفن ہوئے۔[1]

آپ نے جب آنکھ کھولی اُس وقت آپ کے جد نامدار حضرت امیرالمومنینؑ سریر آرائے خلافت تھے۔ آپ نے اُن کی خلافت کے تین سال پائے تھے۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد چھ ماہ تک امام حسن مجتبیٰؑ کے دست مبارک میں اسلامی خلافت کی باگ ڈور رہی۔ بعدازاں حکومت معاویہ کے ہاتھ میں چلی گئی۔

جب ۶۱ھ روز عاشور امام حسینؑ شہید ہوئے تو خدا کی طرف سے مسلمانوں کی امامت کا عہدہ آپ نے سنبھالا۔ آپ قیدیوں کے ہمراہ کوفہ اور شام بھی گئے اور آپ نے مخصوص اجتماعات میں خطبات بھی دیئے اور انقلاب کربلا کی حفاظت کی۔ دربار کوفہ میں آپ کی اور ابن زیاد کی گفتگو ہوئی۔ آپ کے جواب سن کر ابن زیاد کو شدید غصہ آیا اور اُس نے آپ کو قتل کی دھمکی دی۔ یزید نے بھی دربار عام میں آپ کو قتل کی دھمکی دی تھی۔ آپ نے دربار عام میں اُموی سیاست کے پردے چاک کئے اور اُموی گروہ کی گندی حقیقت کو واضح کیا۔

نماز جمعہ سے قبل درباری خطیب نے یزید اور یزیدیوں کی تعریف کی اور خاندان علوی کو برا بھلا کہا تو امام نے اُسے ٹوکا اور یزید سے کہا کہ مجھے منبر پر جانے دیا جائے تاکہ میں بھی کچھ بولوں۔ یزید نے پہلے تو انکار کیا لیکن حاشیہ نشینوں اور درباریوں کے اصرار پر آپ کو منبر پر آنے کی اجازت دی۔

امام منبر پر تشریف لائے اور انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں خدا کی حمد و ثنا بیان کی اور رسول اکرم ﷺ پر دُرود کے بعد اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا کہ بنی امیہ کا پچیس سالہ پروپیگنڈا بڑی حد تک غیر موثر ہوگیا۔[2]

۱۔ مسعودی، مروج الذہب ج ۳، ص ۱۶۰

۲۔ یاد ایام ج ۲، ص ۵۱۔ ۵۳

آپ کے معاصر خلفاء کے نام یہ ہیں:

(۱) یزید بن معاویہ (۶۱ھ تا ۶۴ھ)

(۲) عبداللہ بن زبیر[۱] (۶۱ھ تا ۷۳ھ)

(۳) معاویہ بن یزید (۶۴ھ چالیس دن)

(۴) مروان بن حکم (۶۵ھ صرف نو ماہ)

(۵) عبدالملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ)

(۶) ولید بن عبدالملک[۲] (۸۶ھ تا ۹۵ھ)

اس باب میں ہم اُس وقت یعنی ۶۱ھ سے ۱۱۴ھ تک کے اسلامی معاشرے کی سماجی، سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی حالت کا جائزہ لیں گے۔[۳]

اس عرصے میں بنی اُمیہ کے ہاتھ سے اقتدار چھیننے کا مرحلہ نقطۂ صفر سے شروع ہوا اور امام سجادؑ کی ۳۴ سالہ محنت سے اسے کافی وسعت ملی۔ پھر امام محمد باقرؑ نے اس عمل کو مزید آگے بڑھایا۔ ۱۳۵ھ میں امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں یہ تحریک اپنے عروج پر پہنچی مگر اس محنت کا ثمر بنی عباس کی جھولی میں جا گرا۔

اُس زمانے کی سیاسی اور سماجی تبدیلی کا آغاز کربلا کے المناک سانحے سے ہوتا ہے۔ حکومت وقت کے اقدامات کی وجہ سے واقعۂ کربلا پیش آیا اور امام حسینؑ کو شہید کیا گیا مگر حکومت نے اس ظلم پر اکتفا نہ کیا۔ امام کی شہادت کے بعد خاندان پیغمبرؐ کی بہو بیٹیوں کو قید کر لیا گیا۔ حکومت کے اس اقدام نے نہ صرف عالم اسلام کو مبہوت کر دیا اور سخت بے چینی پھیل گئی بلکہ عالم اسلام پر بنی امیہ کا سخت رعب چھا گیا اور تمام اُمیدیں مایوسی میں بدلنے کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ اُموی خلافت کا یہ ظالمانہ اقدام اتنا سخت اور حیران کن تھا کہ کسی کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ سب لوگ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ اہل بیتؑ کی امامت کا سورج غروب ہو چکا ہے اور اب اہل بیتؑ کی طرف سے اُموی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اُس وقت کی معاشرتی حالت بھی نہایت افسوسناک تھی۔ لوگ عجیب فکری انحطاط سے دوچار تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد اہل بیتؑ کو گوشہ نشینی پر مجبور کر دینے والی سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اسلام

۱۔ عبداللہ بن زبیر کی حکومت حجاز، عراق، مصر اور بلاد اسلامی کے کچھ مشرقی علاقوں پر تھی۔ اُس نے ۷۳ھ تک حکومت کی تھی۔ پھر عبدالملک بن مروان کی فوج کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

۲۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۲۳۴ ۔ ۲۳۵

۳۔ دوسری عالمی امام علی رضاؑ کانفرنس میں، جو ۲۸ تیر ماہ ۱۳۶۵ ہجری شمسی میں منعقد ہوئی تھی، حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے "عنصر مبارزہ در زندگانی ائمہ" کے موضوع پر مدلل تقریر کی تھی۔ شائقین اُن کی اس تقریر کا مطالعہ فرمائیں۔

کے متعلق عجیب جہالت میں مبتلا ہو گئے۔ امام محمد باقرؑ کے زمانے تک ائمہ کا زیادہ وقت گوشہ نشینی میں گزرا۔ کوئی اُن کی طرف رجوع نہیں کرتا تھا اور کوئی اُن سے احادیث روایت نہیں کرتا تھا۔ اس طرح کے حالات میں احادیث وضع کرنے والے جھوٹے افراد کی مانگ میں اضافہ ہوا اور اُن کا یہ کاروبار خوب چمکا۔[1]

اُس وقت اسلامی معاشرہ اخلاقی انحطاط اور تنزلی کا شکار ہو چکا تھا۔ اُس دور میں مروانی خلفاء اور اُن کے کارندوں نے پورے عالم اسلام میں برائیوں کو فروغ دے رکھا تھا حتیٰ کہ اُس دور میں مکہ و مدینہ جیسے اسلامی شہر بھی برائی اور بدی کے مراکز میں تبدیل ہو چکے تھے۔

آیت اللہ خامنہ ای نے دوسری بین الاقوامی امام علی رضاؑ کانفرنس میں فرمایا تھا:

"ابو الفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی سے میں نے جو نکتہ حاصل کیا ہے وہ یہ ہے کہ ۸۰ - ۹۰ھ سے لے کر پچاس ساٹھ برس بعد تک بڑے بڑے گویے، طبلہ نواز، عیاش اور دنیوی عشرتوں دلدادہ مکہ اور مدینہ میں رہتے تھے۔ جب شام کا خلیفہ بور ہوتا اور موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تو مکہ یا مدینہ سے گویوں اور طبلہ نوازوں کو طلب کرتا۔ اُس زمانے میں مکہ و مدینہ میں مشہور گلوکار اور موسیقار رہتے تھے اور حد یہ ہے کہ بدترین ہجو گو شعراء کا تعلق بھی مکہ و مدینہ سے تھا۔"[2]

امام زین العابدینؑ کا زمانہ تحریکوں، انتقام اور قتل و غارت کا زمانہ تھا۔ آپ نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے قیام کو جائز قرار دیا تھا کیونکہ اُس کا ہدف درست تھا اور وہ خونِ حسینؑ کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس عبداللہ بن زبیر نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے قیام کیا تھا اسی لیے امام نے اُس کی تائید و توثیق نہیں کی تھی اور آپ نے اُس سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔[3]

امام زین العابدینؑ کی مجاہدانہ زندگی کے چند پہلو یہ ہیں:

(۱) حماسہ عاشورا کے مقاصد اور امام مظلوم کی یاد کو زندہ رکھنا۔

(۲) دعاؤں کے قالب میں معارف اسلامی کو بیان کرنا۔[4]

۱۔ جعفر مرتضیٰ عاملی، دراسات و بحوث فی التاریخ الاسلام ج ۱، ص ۸۰ - ۸۱

۲۔ مجموعہ آثار بین الملل امام علی رضاؑ کانفرنس ج ۱، ص ۳۵ - ۳۶۔ احمد حیدری، زندگانی امام باقرؑ ص ۶، ۹ (الفاظ کے معمولی اختلاف اور تلخیص کے ساتھ)

۳۔ علامہ امینی، الغدیر ج ۲، ص ۳۴۳

۴۔ صحیفہ سجادیہ اگرچہ ۵۴ دعاؤں پر مشتمل ہے لیکن یہ کتاب جہان بینی، خدا شناسی اور انسان شناسی کا گہرا سمندر ہے۔ امام کو عمومی خطبات کی اجازت نہیں تھی اس لیے آپ نے معارف اسلامی کو دعاؤں کے سانچے میں ڈھالا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی۔ آپ نے اپنی دعاؤں میں معارف الٰہیہ کے علاوہ اخلاق اور اجتماعی زندگی کے آداب و رسوم کو بھی بیان کیا ہے۔ (یاد ایام ج ۲، ص ۵۴)

(۳) تربیتی و اخلاقی احکام و آثار کی نشر و اشاعت۔

(۴) شاگردوں کی تعلیم و تربیت۔[۱]

(۵) امت کو وعظ و نصیحت۔

(۶) درباری ملاؤں سے مباحثہ و مناظرہ۔

(۷) دکھی انسانیت کی خدمت۔[۲]

دو سنتیں ائمہؑ کا معمول رہی ہیں

جو دو سنتیں آپ کو تمام ائمہ ہدی علیہم السلام میں دکھائی دیں گی اُن میں سے پہلی عبادت اور خوف خدا تھی۔ وہ ایمان باللہ کے بلند ترین درجے پر فائز تھے۔ وہ ہمیشہ خوف خدا کی وجہ سے گریہ کرتے تھے اور خدا کا نام سن کر لرز اٹھتے تھے۔ انھیں دیکھنے والا ہر شخص یہ کہتا تھا کہ گویا یہ حضرات اپنی آنکھوں سے خدا، قیامت، بہشت اور دوزخ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔[۳]

امام زین العابدینؑ معنویت کے مرد میدان تھے... جب انسان خاندان رسولؐ کو دیکھتا ہے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام و ایمان نے اُن کے وجود پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ انھیں ہر وقت خوف خدا رہتا تھا۔ اُن کی نمازیں واقعی خدا کے حضور عاجزی کا مکمل نمونہ تھیں اور بقول الیکسس کارل خدا کی طرف پرواز روح کی مظہر تھیں۔ جو شخص امام زین العابدینؑ کو عبادت کی حالت میں دیکھتا اُسے یوں لگتا تھا گویا پیغمبر اکرم ﷺ رات کے آخری حصے میں محراب عبادت میں کھڑے ہیں یا کوہ حرا میں محو عبادت ہیں۔

ایک رات جب آپ عبادت میں مصروف تھے آپ کا ایک بچہ کسی جگہ سے گرا اور اُس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اُسے جراح کے پاس لے جایا گیا... صبح ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ بچے کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ آپ نے اہل خانہ سے پوچھا کہ بچے کے ہاتھ پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟ اُنھوں نے بتایا کہ رات کو یہ گر گیا تھا۔ اُس وقت آپ مصروف عبادت تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عبادت میں اخلاص سے سرشار تھے۔ جب آپ عبادت کرتے تو گرد و پیش سے لاتعلق ہوجاتے اور آپ کو دنیا کی صدائیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔[۴]

۱۔ امام نے بہت سے شاگردوں کی تربیت کی تھی جن میں سے حسب ذیل افراد سرفہرست ہیں:

(۱) سعید بن مسیب (۲) سعید بن جبیر (۳) محمد بن جبیر (۴) امیر یحییٰ بن ام الطویل (۵) ابو خالد کابلی (۶) ابو حمزہ ثمالی (یاد ایام ج ۲، ص ۵۳)

۲۔ امام سجادؑ کے مبارزات سے مزید آشنائی کے لیے مہدی پیشوائی کی کتاب سیرۂ پیشوایان ص ۲۵۹ ۔ ۳۰۲ کا مطالعہ فرمائیں۔

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۸۳ ۴۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۱۰ ۔ ۱۱۲

ائمہ طاہرینؑ کی حیات مبارکہ میں دوسری مشترکہ سمت یہ دکھائی دیتی ہے کہ اُنھیں معاشرے کے کمزور، محروم اور پسے ہوئے طبقے سے بڑی ہمدردی تھی... جب ہم کسی بھی امام کی سوانح حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کا بنیادی کام غریبوں اور کمزوروں کی مدد کرنا تھا۔ ائمہ طاہرینؑ صرف دوسروں کو ہی غرباء و مساکین کی مدد کا حکم نہیں دیتے تھے بلکہ خود بھی بڑھ چڑھ کر اس کارِ خیر کو انجام دیتے تھے۔

امام زین العابدینؑ[1] کی زندگی کا اُصول تھا کہ جب کسی بے کس، غریب، حاجت مند کو دیکھتے جس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوتے تھے تو آپ اُس سے شفقت سے پیش آتے اور اُس پر نوازشات کرتے اور اُسے اپنے گھر لے آتے تھے۔

امام زین العابدینؑ جب حج پر جاتے تو اپنے جاننے والوں کے ساتھ سفر نہیں کرتے تھے۔ آپ کسی ایسے قافلے کے منتظر رہتے جو دُور دراز سے آیا ہو اور اُس میں آپ کو کوئی پہچاننے والا نہ ہو۔ آپ ناواقف لوگوں کے ساتھ سفر کرتے تھے... تاکہ اپنے مسلمان ساتھیوں کی خدمت کرسکیں۔

امام کی دُعا اور آپ کا گریہ

امام زین العابدینؑ کو اپنے والد ماجد کی طرح موقع نہیں ملا اور نہ ہی آپ کو امام جعفر صادقؑ کا سا موقع ملا تھا مگر جس کے پیش نظر اسلام کی خدمت ہو وہ اپنے لیے خود ہی مواقع پیدا کرلیتا ہے البتہ مواقع کی شکل و صورت میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ دیکھیے امام زین العابدینؑ نے دعاؤں کی شکل میں دنیائے شیعیت کو کتنا قابل فخر سرمایہ عطا کیا تھا؟! دعا کے انداز میں آپ نے کارِ امامت انجام دیا... آپ نے ہر طریقے سے اپنے والد بزرگوار کے قیام کے اثرات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی تھی... یہی وجہ تھی کہ امام زیادہ گریہ کرتے تھے۔[2]

آپ کی شفقت

عبدالملک بن مروان ۲۱ سال تک ظلم و جور سے حکومت کرنے کے بعد ۸۶ھ میں مرگیا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا ولید خلیفہ بنا۔ ولید نے لوگوں کی ناراضگی کو کم کرنے کے لیے حکومت کی روش میں کچھ نرمی برتی۔ اُس نے مدینہ کے گورنر عبدالملک بن مروان کے خسر ہشام بن اسماعیل مخزومی کو اُس کے عہدے سے معزول کیا۔ واضح رہے کہ ہشام نے اہل مدینہ کی بہت توہین کی تھی۔ سعید بن مسیب مشہور محدث تھے۔ اہل مدینہ اُن کا بڑا

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ، ص ۱۸۳۔ ۱۸۴

۲۔ ایضاً ص ۱۱۲، ۱۱۳۔ داستان راستان ج ۲، شمارہ ۷، ص ۳۶۔ ۳۷۔ آپ جب بھی پانی پیتے تو رو دیتے تھے۔ کبھی گوسفند کو ذبح ہوتا دیکھتے تو رو دیتے تھے۔ آپ نے اپنے گریہ سے تاریخ کربلا کو فروغ دیا تھا۔ (محمد نصیری، تاریخ تحلیلی اسلام ص ۲۱۵)

احترام کرتے تھے۔ اُنھوں نے بیعت نہیں کی تو ہشام نے اُنھیں ساٹھ کوڑے لگوائے اور کھردرا لباس پہنا کر اونٹ پر سوار کرایا اور پورے مدینہ میں پھرایا تھا۔ ہشام خاندان علیؑ کا بدترین دشمن تھا۔ اولادِ علیؑ کے سربراہ امام زین العابدینؑ کے ساتھ اُس کا رویہ تحقیر آمیز ہوتا تھا۔

ولید نے ہشام کو معزول کر دیا اور اُس کی جگہ اپنے جواں سال چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ عمر بن عبدالعزیز لوگوں میں حسن سلوک اور انصاف کے لیے شہرت رکھتا تھا۔

عمر بن عبدالعزیز نے لوگوں کا غصہ کم کرنے کے لیے حکم دیا کہ ہشام کو مروان بن حکم کے گھر کے سامنے باندھ دیا جائے اور ہشام نے اپنی گورنری کے دوران جس پر بھی ظلم و ستم کیا ہو، وہ آئے اور اس سے بدلہ لے۔

حاکم مدینہ کی طرف سے جیسے ہی یہ اعلان ہوا لوگ بڑی تعداد میں آئے اور دل کھول کر اُس پر لعنت کرنے لگے۔ ہشام کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں نے ہمیشہ امام زین العابدینؑ کی توہین کی ہے اور میں اُن کے سامنے اُن کے آباء و اجداد پر سب و شتم کیا کرتا تھا۔ اب نجانے علیؑ بن حسینؑ مجھ سے کیا سلوک کریں۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچتا کہ امام زین العابدینؑ مجھے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔

امام زین العابدینؑ نے تمام اولادِ علیؑ کو بلا کر فرمایا: ''گرے ہوئے شخص کو پامال کرنا ہمارے گھرانے کی روایت نہیں ہے اور کمزور دشمن سے انتقام لینا ہمارا شیوہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہمارا کردار یہ ہے کہ ہم گرے ہوئے لوگوں کو اُٹھائیں اور اُن کی مدد کریں...'' جب لوگوں نے امام زین العابدینؑ کے یہ تاثرات سنے تو اُنھوں نے بھی ہشام کو مزید ذلیل کرنا چھوڑ دیا۔[1]

امام محمد باقرؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام محمد باقرؑ کی ولادت جمعہ یکم رجب اور دوسری روایت کے مطابق ۳ رصفر ۵۷ھ کو ہوئی۔ آپ نے مدینہ منورہ میں آنکھ کھولی۔ آپ نے زندگی کے ابتدائی ایام میں اپنے جد بزرگوار امام حسینؑ کی شہادت، حرم نبوی کی قید، واقعہ حرہ کے دوران مسلمانوں کے قتل عام اور ہتک حرمت کے واقعات دیکھے۔ اس کے علاوہ خانۂ کعبہ کی ہتک حرمت اور منجنیق کے ذریعے سے کعبہ پر سنگ باری اور آگ لگانے کے واقعات کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔[2]

آپ نے ۱۹ برس تک امامت کی ذمے داری نبھائی۔ پھر ۵۷ برس کی عمر میں بنی اُمیہ کے دسویں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے حکم سے ابراہیم بن ولید کے ہاتھوں زہر سے آپ کو شہید کیا گیا۔ آپ بقیع میں مدفون

۱۔ داستان راستان ج ۲، ص ۲۱۰ - ۲۱۲۔ بحار الانوار ج ۱۱، ص ۱۷ و ۲۷۔ الامام الصادق ج ۱، ص ۱۱۱۔ عبدالعزیز سید الاہل، امام زین العابدینؑ، ترجمہ حسین وجدانی ص ۹۳

۲۔ حیاۃ الامام محمد الباقرؑ ج ۲، ص ۳۲ بہ نقل از زندگانی امام باقرؑ، احمد حیدری ص ۳۷ - ۳۸

ہوئے۔ آپ کی شہادت ۱۱۴ھ میں واقع ہوئی۔[1]

آپ کے دور کے خلفاء کے نام یہ ہیں:

(۱) ولید بن عبدالملک (۹۵ھ تا ۹۶ھ)

(۲) سلیمان بن عبدالملک (۹۶ھ تا ۹۹ھ)

۳) عمر بن عبدالعزیز[2] (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ)

(۴) یزید بن عبدالملک (۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ)

۵) ہشام بن عبدالملک[3] (۱۰۵ھ تا ۱۱۴ھ)

۹۵ھ میں امام زین العابدینؑ کی شہادت کے بعد امامت و رہبری کی ذمے داریاں امام محمد باقرؑ کے حصے میں آئیں۔ اس وقت اُموی حکومت کا ستارہ اوج کمال پر تھا۔ اسلام کے روز افزوں پھیلاؤ اور متمدن ممالک کے لوگوں کے اسلام قبول کر لینے کے بعد فطری طور پر اسلامی فکر اور اسلامی آئیڈیالوجی کو مزید تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

آپ کی امامت کے ابتدائی ایام میں بنی اُمیہ کی حکومت بہت مستحکم تھی اور وہ آپ کو عملی میدان میں قدم رکھنے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھی جبکہ آپ کی زندگی کے آخری ایام میں اُن کی قوت کمزور ہو چکی تھی اور ہر طرف سے اُن کے خلاف مزاحمت شروع ہو چکی تھی چنانچہ آپ نے ان حالات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

۱۔ مناقب ج ۴، ص ۲۱۰

۲۔ عمر بن عبدالعزیز کے اصلاحی کارناموں کی کچھ تفصیل یہ ہے:

(۱) اُنھوں نے سرکاری گھوڑوں اور مویشیوں کی کھلے عام بولی دلائی تھی اور اس سے حاصل ہونے والی رقم بیت المال میں جمع کرائی تھی۔

(۲) سلیمان بن عبدالملک کے تمام قیمتی کپڑے نیز غلہ اور دولت ضبط کی تھی جس کی مالیت دو لاکھ چالیس ہزار دینار تھی اور یہ رقم بیت المال میں جمع کرائی تھی۔

(۳) اُنھوں نے بنی امیہ اور اپنے چچازاد بھائیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بیت المال کی ساری رقم جس پر ہاتھ صاف کیے تھے بیت المال میں جمع کرائیں۔

(۴) اُنھوں نے خطبات جمعہ و عیدین میں امیرالمومنینؑ پر سب و شتم کا سلسلہ ختم کیا۔

(۵) اُنھوں نے جاگیر فدک امام محمد باقر علیہ السلام کو واپس کی تھی۔

(۶) صدر اوّل سے کتابت حدیث پر لگی ہوئی پابندی کو ختم کیا۔ (مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۳۱۵ ۔ ۳۱۷)

۳۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۳۰۵ ۔ ۳۰۶

آپ نے حقیقی اسلام اور اسلامی فکر کے اُصول بیان کرنے اور معاشرے میں تقویٰ کی ترویج اور شاگردوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ امام زین العابدینؑ کے ذریعے سے جس اسلامی ثقافتی تبدیلی کی بنیاد رکھی گئی تھی، آپ نے اس کو وسعت دی اور عظیم الشان "جعفری یونیورسٹی" کے لیے زمین ہموار کی۔[1]

آپ کے علم وفضل سے لوگوں کی کثیر تعداد نے فیض اٹھایا۔ آپ کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

(۱) زرارہ بن اعین (۲) حمران (۳) بکیر (۴) عبدالملک (۵) عبدالرحمن۔ مؤخر الذکر چاروں افراد زرارہ کے بھائی تھے۔ (۶) ابان بن تغلب (۷) جابر بن یزید جعفی (۸) برید بن معاویہ عجلی (۹) فضیل بن یسار (۱۰) ابو بصیر لیث مرادی (۱۱) ابو بصیر یحییٰ بن ابی قاسم اسدی (۱۲) عبدالرحمان بن شریک عامری (۱۳) محمد بن مسلم (۱۴) سعد الخیر (۱۵) کمیت اسدی۔

امام کے اصحاب میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے امام زین العابدینؑ اور امام جعفر صادقؑ سے کسب فیض کیا تھا جبکہ مذکورہ بالا افراد کو امام محمد باقرؑ کے خاص اصحاب میں شمار کیا جاتا ہے۔[2]

مختلف معصومین علیہم السلام کی سیرت کا ایک جائزہ

ہم شیعہ بارہ اماموں کی امامت کے قائل ہیں اور ان سب کو رسول اکرم ﷺ کے جانشین مانتے ہیں اور ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تمام ہستیاں حقائق اسلام کی ترجمان تھیں۔ ہم ان کی گفتار کو گفتار پیغمبرؐ اور اُن کے کردار کو کردار پیغمبرؐ تسلیم کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ائمہ کی سیرت، پیغمبر اکرم ﷺ کی سیرت ہے اور ہم یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ اسلامی حقائق کی شناخت کے جتنے مواقع ہمیں ملے ہیں دوسرے اسلامی فرقے اس سے محروم ہیں کیونکہ امام حسن عسکریؑ جو ہمارے گیارہویں امام ہیں، کی شہادت ۲۶۰ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اُن کی شہادت کے بعد غیبت کا زمانہ شروع ہوا۔

ہم شیعی نقطہ نظر سے تو یہ سمجھتے ہیں کہ گویا رسول اکرم ﷺ ۲۶۰ھ تک زندہ رہے اور اس دوران جتنی بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں اور حالات نے جتنی بھی کروٹیں لیں گویا آنحضرت ﷺ ان تمام تبدیلیوں کے وقت زندہ تھے۔[3] مطلب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ائمہ اطہارؑ کا وجود، گفتار و کردار کے لحاظ سے قطعی حجیت کا حامل ہے اور ائمہ کی حیات کا دورانیہ ایسا ہی ہے گویا رسول اکرم ﷺ موجود ہوں اور اس دوران عالم اسلام میں جتنے

۱۔ احمد حیدری، زندگانی امام محمد باقرؑ ص ۱۰۔ امام محمد باقرؑ کے زمانے کے اجتماعی حالات کے مطالعے کے لیے مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۳۱۲ ـ ۳۳۶ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ احمد حیدری، زندگانی امام محمد باقرؑ ص ۱۶۵ ـ ۱۸۹۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۳۰۹

۳۔ مجموعہ آثار، بین الاقوامی دوسری امام علی رضا کانفرنس ج ۱، خطاب آیت اللہ خامنہ ای ص ۲۳ ـ ۲۵

بھی حوادث رونما ہوئے آنحضرت ﷺ (بشکل ائمہ) اُن کے شاہد تھے اور ہر دور میں آپ نے اپنا شرعی وظیفہ بلا کم وکاست ادا کیا اور آپ کو کسی طرح کا اشتباہ لاحق نہیں ہوا تھا۔

واضح سی بات ہے کہ اگر اس نظریے کو صحیح مان لیا جائے تو مسلمان بہتر طریقے سے ہر زمانے میں اپنی ذمے داریوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

اگرچہ ظاہری طور پر ہادیان دین کے اقوال و افعال میں تضاد اور تعارض پایا جاتا ہے[1] مثلاً رسول خداؐ نے کچھ اور طرح سے عمل کیا تھا اور امیرالمومنینؑ کا عمل کچھ اور تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں شخصیات نے ایک ہی عمل کیا ہو اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے کسی اور طرح سے عمل کیا ہو۔

الغرض کبھی اس طرح کا تعارض و تضاد زیادہ دکھائی دیتا ہے جبکہ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ سب معصوم ہیں اور اُن سب کا فعل اُن کے قول کی طرح حجت ہے تو ہمیں عمل کے وقت کیا کرنا چاہیے؟ اور ہم کس کے عمل اور کس کی سیرت کو اپنائیں؟

اہل سنت کے مقابلے میں ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ہمیں اہل بیتؑ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا تھا اور آپ کے فرمان کے مطابق ہم نے اہل بیت عصمت کو امام مانا اور اُن کے افعال و اقوال کو اپنے لیے حجت سمجھا لہٰذا ہم دینی آثار و مآثر کے اعتبار سے اہل سنت کی نسبت بہت بہتر پوزیشن میں ہیں۔

یہ بات اپنے مقام پر شیعوں کے لیے باعث فخر ہے اور اسی دلیل کی بنا پر شیعہ قیاس اور استحسان کے محتاج نہیں اور ہمیشہ اس بات پر فخر کیا کرتے ہیں۔

اب ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا دلیل جہاں شیعوں کی صداقت کی مضبوط دلیل ہے اور مذہب تشیع کو تقویت فراہم کرتی ہے وہاں یہی دلیل شیعوں کے لیے کمزوری کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

ہمارے مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیعہ صرف ایک معصوم رہنما نہیں بلکہ چودہ معصومین کی رہنمائی کے قائل ہیں جبکہ ہر معصوم سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک رہنما کا فرمان دوسرے رہنما کے فرمان سے نہیں ملتا۔ ایک کا عمل دوسرے کے عمل سے نہیں ملتا۔ یہ صورت حال شیعوں میں ایک طرح کی گمراہی اور پریشانی کا باعث بنتی ہے اور شیعہ عوام کے لیے ہرج و مرج کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ ایک ملت کے پاس ایک پائیدار اُصول نہ ہو اور ہر رہنما کا علیحدہ علیحدہ طرز فکر ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس مریض کے طبیب زیادہ ہو جائیں تو وہ کبھی شفایاب نہیں ہوسکتا اور سچ یہ ہے کہ اگر مختلف روش پر تحقیق و اجتہاد نہ کیا جائے تو اس کے برے نتائج برآمد ہوں گے۔[2]

۱۔ بیست گفتار ص ۱۶۷۔ ۱۶۹

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار ص ۱۳۔ ۱۴

ہادیان دین سے جو روایات منقول ہیں ان میں کہیں کہیں تضاد و تعارض دکھائی دیتا ہے۔ ایسی روایات جن کا تعلق فقہ و احکام سے ہے اگر ان میں تعارض پایا جاتا ہے تو علماء نے ان کے حل اور باہمی تطبیق کی کوششیں کی ہیں جن کو علم اُصول فقہ کی کتابوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ہادیان دین کی سیرت اور روش میں جو ظاہری اختلاف دکھائی دیتا ہے اگر اسے حل نہ کیا جائے اور رمز مطلب معلوم نہ ہو سکے تو اس سے اَخلاقی و اجتماعی ہرج و مرج جنم لے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ ائمہ اطہارؑ کی سیرت میں اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسنؑ معاویہ سے صلح کرتے ہیں جبکہ امام حسینؑ قیام کرتے ہیں اور حکومت، یزید کو تسلیم کرنے پر شہادت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ رسول خداؐ اور حضرت علی مرتضیٰؑ اپنے دور میں زہد کی زندگی بسر کرتے تھے اور اچھی غذا اور بڑھیا لباس سے پرہیز کرتے تھے جبکہ دوسرے ائمہ اطہارؑ ایسا نہیں کرتے تھے۔[۱]

بادی النظر میں ممکن ہے کہ کوئی معترض اسے تشیع کی کمزوری سمجھے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ نقطہ تشیع کی کمزوری کا سبب نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ شیعوں کی قوت کا موجب ہے۔ میں تمہید کے طور پر یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر ہمارے پاس صرف ایک معصوم ہوتا جو بیس یا تیس برس تک ہمارے درمیان رہتا تو وہ ہمارے لیے زیادہ مفید ہوتا یا ایسا پیشوا ہوتا جو ہمارے درمیان اڑھائی سو برس تک زندہ رہتا۔ ان دو میں سے زیادہ رہنمائی کون کرتا ؟ اگر ایک رہنما صرف بیس سال ہی ہمارے درمیان رہے تو اس عرصے میں کچھ زیادہ تبدیلیاں اور مختلف و متنوع موضوعات اور حالات پیش نہیں آتے کہ ہم ان مختلف حالات اور موضوعات میں اس پیشوا کا عمل دیکھیں اور بعد کے جدید مسائل کے حل کے لیے اس کے احکام کی کیسے تطبیق کریں ؟

ہمیں جدید مسائل کے حل کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت پڑتی۔ پھر بھی ہم ہر لحہ بدلتی زندگی کے احکام کو دین کے کلی اُصول سے مطابقت دینے میں کامیاب نہ ہو سکتے کیونکہ دین میں ایک بیان ہوتا ہے اور ایک تطبیق و عمل ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ دروس نظری ہوتے ہیں اور کچھ عملی ہوتے ہیں۔ عملی دروس، نظری دروس کے جزئی اور مختلف موضوعات کی تطبیق پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر ۲۵۰ برس تک ایک معصوم رہبر موجود رہے اور وہ مختلف واقعات و موضوعات کے متعلق رہنمائی کرتا رہے تو ہم دینی تعلیمات کی روح سے بہتر آگاہی حاصل کر سکیں گے اور ہم جمود سے بھی نجات حاصل کر سکیں گے۔

ہادیان دین جن زمانوں میں موجود رہے، اُن زمانوں کے مخصوص حالات اور ماحول تھے اور اس کے مطابق اُس کے شرعی احکام بیان کئے کیونکہ ہر شخص اپنے زمانے کے تقاضوں پر عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے یعنی

۱۔ بیست گفتار ص ۱۶۹ ۔ ۱۷۱

اسلام نے عصری تقاضوں کے مطابق عمل کرنے میں انسان کو آزاد رکھا ہے لہٰذا اگر بہت سے معصوم پیشوا ہوں یا ایک طویل عمر پانے والا پیشوا ہو تو انسان اپنے زمانے کے تقاضوں سے مطابقت رکھنے والی دینی تعلیمات کی بہتر تشخیص کر سکتا ہے۔ وہ اسلامی تعلیمات کی روح حاصل کر کے صرف زمانے کے تقاضوں سے مربوط امور کو چھوڑ سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ پیشوا ایک ایسا عمل کریں جو دین کا تقاضا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کا عمل جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہو مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقر کی زندگی بسر کرتے تھے جبکہ امام جعفر صادقؑ فقیرانہ زندگی بسر نہیں کرتے تھے۔ اس فرق کی وضاحت کے لیے ہم ایک داستان بیان کرتے ہیں۔[1]

حضرت علیؑ سے پوچھا گیا کہ یہ حدیث رسولؐ آپ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غَيِّرُوا الشَّيْبَ وَلَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُودِ داڑھی کو خضاب کرو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو لیکن اس حدیث کو روایت کرنے کے باوجود آپ خود خضاب نہیں کرتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

آپ نے فرمایا کہ یہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے ساتھ مخصوص تھا۔ اُس وقت کفار سے جنگیں ہو رہی تھیں لہٰذا یہ ایک جنگی حکمت عملی تھی تاکہ مجاہدین اسلام کو دیکھ کر دشمن یہ نہ سمجھیں کہ یہ تو کمزور اور بوڑھے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دور میں اس جنگی حکمت پر عمل کیا تھا (اب وہ حالات باقی نہیں ہیں لہٰذا) اور اب فَامْرُؤٌ وَمَا اخْتَارَ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے چاہے تو خضاب کرے، چاہے تو نہ کرے۔

اگر حضرت علیؑ کی سیرت اور وضاحت موجود نہ ہوتی تو ہم یہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے داڑھی کے لیے خضاب کا حکم دیا ہے اور قیامت تک لوگ ایک دوسرے کی داڑھی پکڑ کر کہتے کہ داڑھی پر خضاب لگانا واجب ہے۔ پس معصومینؑ کی یہ سیرت تناقض اور تضاد کے حل کا ایک راستہ ہے البتہ اس کے لیے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔[2]

بحث کے چیدہ نکات

(۱) حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں بنو اُمیہ کو کوئی بھی کلیدی عہدہ نہیں دیا تھا۔ آپ کے بعد بنی اُمیہ نے آہستہ آہستہ اسلامی اداروں میں اثر و رسوخ حاصل کیا۔ حضرت عمرؓ سے ایک سخت تاریخی غلطی ہوئی کہ اُنھوں نے ابوسفیان کے ایک بیٹے یزید کو شام کا حاکم مقرر کیا۔

(۲) بنی اُمیہ، اسلام کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے اور جب تک اُن کے پاس طاقت موجود رہی وہ مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا تو بنی اُمیہ کو یقین ہو گیا کہ اب اسلام کے

۱۔ داستان راستان ج ۱ ۔ ۲، شمارہ ۱۵، ص ۵۲ ۔ ۶۵

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۵ ۔ ۱۹۔ بیست گفتار ص ۱۸۵

ساتھ براہ راست جنگ نہیں کی جاسکتی ہے چنانچہ اُنھوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کرلیا۔ رسول خدا ﷺ اُن کے ساتھ مؤلفۃ القلوب کا سلوک کرتے تھے۔

(۳) بنی اُمیہ کا ایک شخص جو کہ سابقین اسلام میں سے تھا اور اُس کا ماضی اچھا تھا برسر اقتدار آیا تو اُس کے اقتدار نشین ہوتے ہی ابوسفیان کا گروہ اُمت اسلامیہ پر مسلط ہوگیا اور اُنھیں خوب قوت و طاقت حاصل ہوئی۔

(۴) معاویہ نے اپنی چالاکی، سابقہ خلفاء کی غلط روش اور عوام کی جہالت کی وجہ سے خلافت پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

(۵) فکر علیؑ سے مقابلے کے لیے معاویہ نے درج ذیل تین کام کیے تھے:

(الف) منبروں سے حضرت علیؑ پر سب و شتم کرایا۔

(ب) حضرت علیؑ کے پیروکاروں کا قتل عام کرایا۔

(ج) بنی اُمیہ کی فضیلت میں احادیث وضع کرائیں۔

(۶) حضرت علیؑ نے بنی اُمیہ کی حکومت کے لیے حسب ذیل پیش گوئی فرمائی تھی:

(الف) بنی اُمیہ برسر اقتدار آکر ظلم و استبداد کو رواج دیں گے اور بیت المال اپنے تصرف میں لائیں گے۔ اُن کی حکومت میں عدل و مساوات کہیں دکھائی نہ دے گا۔

(ب) وہ شریف، نیک، دانشور اور روشن فکر لوگوں کو قتل کریں گے۔

(ج) احکام اسلام کی حرمت باقی نہ رہے گی اور وہ حرام خدا کو حلال کریں گے۔

(د) دین اسلام میں تحریف کریں گے اور غیر اسلامی افکار دین میں داخل کریں گے۔

(۷) بنی اُمیہ حصول مقاصد کے لیے جائز و ناجائز میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ معاویہ نے امام حسنؑ مالک اشتر، سعد بن ابی وقاص یہاں تک کہ اپنے بہترین حلیف عبدالرحمان بن خالد کو زہر دے کر قتل کرایا تھا۔

(۸) بنی اُمیہ کی حکومت کی روش اور خصوصیات درج ذیل تھیں:

اُموی پارٹی کی تشکیل، نسل پرستی اور طبقاتی نظام کا اجرا، ادبیات جاہلی کا احیاء، احادیث میں تحریف کرنا، جعلی احادیث بنوانا، حضرت علیؑ کو برسر منبر برا بھلا کہنا، شیعوں کا قتل عام، ان کے گھر لوٹنا اسلامی احکام کی اہمیت کم کرنا، اسلام سے جنگ کرنا اور موروثی خلافت قائم کرنا۔

(۹) امام حسن مجتبیٰؑ ۱۵ رمضان ۲ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ۴۸ برس کی عمر میں ۲۸ صفر ۵۰ھ کو شہید ہوئے۔ آپ کی مدت امامت دس سال تھی۔ آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

(۱۰) امام حسن مجتبیٰؑ کی کچھ خصوصیات حسب ذیل تھیں:

(الف) آپ کا چہرہ اقدس تاریخ انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہے۔

(ب) آپ کے جود و سخا کے واقعات سے صفحات تاریخ مزین ہیں۔

(ج) حلم و بردباری میں آپ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ پرہیزگاری کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے اور آپ کو ریاکاری سے شدید نفرت تھی۔

(د) آپ کے دور امامت کی اہم بات یہ تھی کہ آپ نے لوگوں کو کتابت حدیث کی ترغیب دی۔

(ہ) محدثین اور درباری علماء جب کوئی دینی مسئلہ حل نہ کر سکتے تو آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔

(۱۱) امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے زمانوں میں حسب ذیل فرق موجود تھے:

(الف) امام حسنؑ مسند خلافت پر متمکن تھے اور معاویہ کی حیثیت ایک عامل کی تھی۔ اگر امام اس حالت میں شہید ہو جاتے تو اس کا مطلب خلیفۃ المسلمین کا قتل اور مرکز خلافت کی شکست ہوتا جبکہ امام حسینؑ کی حیثیت ایک جابر حاکم کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے والے کی تھی اور آپ کی شہادت قابل فخر تھی۔

(ب) اگر امام حسنؑ کے زمانے میں کوفہ اور شام میں لڑائی ہوتی تو وہ کئی سالوں تک جاری رہتی لیکن اس کا کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہ ہوتا اور طرفین کے لاکھوں انسان قتل ہو جاتے جبکہ امام حسینؑ کے ساتھ ۷۲ وفادار ساتھی تھے۔ آپ نے انھیں اجازت دی تھی کہ چاہیں تو ساتھ رہیں، چاہیں تو چلے جائیں۔

(ج) امام حسینؑ کے زمانے میں حکومت کا چہرہ کھل کر سامنے آچکا تھا جب کہ امام حسنؑ کے زمانے میں معاویہ کا اصلی چہرہ بہت سے لوگوں سے پوشیدہ تھا۔

(۱۲) صلح امام حسنؑ چیدہ چیدہ شرائط حسب ذیل تھیں:

(الف) حکومت اس شرط پر معاویہ کے سپرد کی جاتی ہے کہ وہ کتاب و سنت اور خلفاء کی سیرت پر چلے گا۔

(ب) معاویہ کے بعد حکومت امام حسنؑ کو منتقل ہو جائے گی۔ اگر امام حسنؑ حیات نہ رہے تو امام حسینؑ کے سپرد کی جائے گا۔ معاویہ کو جانشین مقرر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

(ج) معاویہ نمازوں میں حضرت علیؑ پر سب و شتم نہیں کرے گا اور اُن کا ذکر بھلائی سے کرے گا۔

(د) کوفہ کا بیت المال معاویہ کے سپرد نہیں کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں معاویہ ہر سال بیس لاکھ درہم امام حسنؑ کو بھیجے گا جسے وہ اپنے دوستوں اور شیعوں میں تقسیم کریں گے۔

(ہ) شام، عراق، یمن اور حجاز کے لوگوں کو امان ہوگی۔ معاویہ اُن سے کوئی سیاسی انتقام نہیں لے گا۔

(۱۳) امام حسینؑ ۳ شعبان ۴ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو ۵۷ سال کی عمر میں روز عاشور محرم ۶۱ھ کو کربلا میں شہید کیا گیا۔ آپ کی امامت کا عرصہ گیارہ برس تھا۔

(۱۴) قیام امام حسینؑ کی مندرجہ ذیل تین تفسیر کی جاسکتی ہیں:

(الف) آپ کا قیام ایک عام قیام اور ذاتی مفادات کے لیے تھا لیکن تاریخی حقائق سے اس نظریے کی تردید ہوتی ہے۔

(ب) آپ کے قیام کا مقصد اُمت کے گناہ بخشوانا تھا۔ یہ عقیدہ عیسائیوں کے عقیدے کے مماثل ہے جبکہ عوام کی اکثریت واقعۂ کربلا کی یہی توجیہ پیش کرتی ہے۔

(ج) دنیائے اسلام میں ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے (کہ اسلام خطرے میں پڑ گیا تھا)۔ آپ نے اسلام کی حفاظت کے لیے قیام کو اپنا شرعی وظیفہ سمجھا تھا۔

(۱۵) قیام امام عالی مقام کے اہم مقاصد حسب ذیل تھے:

(الف) حقیقی اسلام، سیرت پیغمبرؐ اور سیرت علیؑ کا احیاء۔

(ب) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا قیام اور ظالموں کی سرکوبی۔

(ج) قوانین اسلام کا اجراء و احیاء۔

(د) عوام کی حالت بہتر بنانا اور امت کی اصلاح کرنا۔

(۱۶) جن اسباب نے امام حسینؑ کی تحریک کو تقدس اور عظمت بخشی ان میں حسب ذیل اسباب اہم تھے:

(الف) آپ کے قیام کا مقصد ذاتی اور انفرادی نہیں تھا۔

(ب) آپ کا قیام مکمل منصوبہ بندی اور گہری بصیرت کے ساتھ تھا۔

(ج) آپ نے اُس وقت قیام کیا جب ظلم کے خلاف بولنے سے لوگوں کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں اور کسی کو حکومت کے غلط اقدامات پر آواز اٹھانے کا یارا نہیں تھا۔

(۱۷) قیام حسینی میں موثر عوامل درج ذیل تھے:

(الف) بیعت یزید سے انکار۔

(ب) اہل کوفہ کی دعوت۔

(ج) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضے۔

(۱۸) اگر امام حسینؑ (العیاذ باللہ) یزید کی بیعت کر لیتے تو جو نقصانات ہوتے ان میں سے مندرجہ ذیل دو نقصانات ناقابل تلافی تھے:

(الف) اگر بیعت کر لیتے تو آپ کا یہ اقدام معاویہ کی قائم کردہ موروثی خلافت پر مہر تصدیق سمجھا جاتا۔

(ب) یزید صرف فاسق و فاجر ہی نہیں تھا بلکہ علانیہ برائی کرتا تھا اور اس کے لیے ظاہری سیاسی تقاضوں کا

بھرم رکھنے کا بھی قائل نہیں تھا۔

(۱۹) امام حسینؑ کے قیام میں اہل کوفہ کی دعوت کا عامل معمولی نوعیت کا تھا۔ یہ دعوت ایک ایسے علاقے کے لوگوں کی طرف سے تھی جن کے پاس قابل ذکر قوت موجود تھی۔

(۲۰) اہل کوفہ کی دعوت کا اگر آپ کے انکار بیعت سے موازنہ کیا جائے تو انکار بیعت زیادہ اہم عامل کے طور پر سامنے آتا ہے جس سے امام حسینؑ کے قیام کی اہمیت اور قدر و قیمت زیادہ واضح ہوتی ہے کیونکہ آپ نے بیعت سے اُس وقت انکار کیا تھا جب کسی نے امام کی تائید و نصرت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ آپ ایک ایسی حکومت کے سامنے جھکنے سے انکار کر رہے تھے جو بیس سال سے لوگوں پر مسلط تھی اور اپنے جبر کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ اتنی مضبوط اور جابر حکومت آپ سے بیعت کا تقاضا کرتی ہے لیکن آپ تن تنہا اُس کے مطالبے کو مسترد کر دیتے ہیں۔

(۲۱) امر بالمعروف وہ عامل ہے جس کی قدر و قیمت مذکورہ بالا دونوں عوامل سے زیادہ ہے۔ اسی عامل کی بدولت آپ کی تحریک کو دوام نصیب ہوا اور بعد کی تمام تحریکوں کے لیے آپ کی تحریک مشعل راہ قرار پائی۔

(۲۲) امام حسینؑ اپنے خانوادہ کو اس لیے ساتھ لے کر گئے تھے تاکہ وہ تاریخ کا رخ موڑنے والے اس عظیم قیام میں براہ راست حصہ لیں اور اپنی شرعی ذمے داریاں پوری کریں۔

(۲۳) ۱۱ محرم کو قیدیوں کو مقتل سے گزارا گیا اور ۱۲ محرم کو کوفہ لایا گیا۔ حضرت زینبؑ نے کوفہ کے دروازے پر خطبہ دیا اور اہل کوفہ کی غداری کی مذمت کی اور کربلا کی جنگ میں ان کے جرائم کا پردہ فاش کیا۔

(۲۴) ۲ صفر کو قیدیوں کا قافلہ شام پہنچا۔ قیدیوں کو یزید کے دربار میں لایا گیا۔ دربار میں حضرت زینبؑ نے خطبہ دیا جس میں اُنھوں نے یزید اور اُس کے کارندوں کے مظالم کا ذکر کیا اور اُنھیں سر دربار رسوا کیا۔ بی بی کے خطبات نے یزید کو مجبور کر دیا کہ وہ اہل حرم کو احترام کے ساتھ مدینہ واپس بھیج دے۔

(۲۵) قیام امام حسینؑ کے نتیجے میں روز عاشور ہی اُس وقت کی ہیئت مقتدرہ کے خلاف آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ حکومت کے خلاف کوفہ میں احتجاج ہوا۔ آپ کے قیام کی وجہ سے دم توڑتے اسلامی معاشرے کو نئی زندگی ملی۔ آپ کے قیام کے نتیجے میں ہیئت مقتدرہ رُسوا ہوئی۔ آپ کے قیام نے دنیا کو یہ بتایا کہ اسلام اور ہے، خلفاء اور ہیں۔ آپ کی مظلومانہ شہادت نے غیروں کو بھی متاثر کیا۔ خود ابن زیاد کے بھائی عثمان بن زیاد نے اپنے بھائی کو لعنت ملامت کی۔ دربار یزید میں ہی یزید کی مخالفت ہوئی۔ حد یہ ہے کہ یزید کی بیوی ہند نے یزید پر لعن طعن کی۔ آپ کے قیام نے مستقبل کی اسلامی تحریکوں کے لیے راستہ ہموار کیا۔

آپ کے قیام کی وجہ سے توابین منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد مختار نے قیام کیا۔ پھر زید بن علی نے قیام کیا۔ آخر میں بنی اُمیہ کی حکومت ہی صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔

(۲۶) امام زین العابدینؑ ۵ شعبان ۳۸ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ۵۷ برس کی عمر میں ۱۲ محرم ۹۵ھ کو آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ ولید بن عبدالملک کے حکم سے آپ کو زہر دیا گیا تھا۔ آپ کو بقیع میں دفن کیا گیا۔

(۲۷) امام زین العابدینؑ واقعۂ کربلا کے بعد قیدیوں کے سالار تھے۔ آپ نے کوفہ اور شام کے درباروں میں خطاب کیا۔ آپ کربلا کے خونی انقلاب کے پاسدار تھے۔

ابن زیاد کے دربار میں جب آپ کی اس لعین سے گفتگو ہوئی تو ایک موقع پر اسے سخت غصہ آیا اور اس نے آپ کو قتل کی دھمکی دی۔ یزید لعین نے بھی آپ کو قتل کی دھمکی دی تھی۔ امام نے مجمع عام میں اُن کے جھوٹ اور فریب کے پردے چاک کئے اور بنی اُمیہ کا مکروہ چہرہ لوگوں کو دکھایا۔

ایک مرتبہ نماز جمعہ سے قبل ایک درباری خطیب نے یزید کی تعریف کی اور خاندان علیؑ کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو آپ خاموش نہ رہ سکے اور یزید سے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی بولنے کا موقع دیا جائے۔ یزید اجازت دینے پر تیار نہ ہوا۔ آخرکار حاشیہ نشینوں اور درباریوں کے اصرار پر اُسے اجازت دینی پڑی۔ آپ نے خطبہ دیتے ہوئے پہلے خدا کی حمد و ثنا بیان کی اور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجا۔ پھر لوگوں کے سامنے اپنا اور اپنے خاندان کا اس انداز سے تعارف کرایا کہ بنی اُمیہ کے پچیس سالہ پروپیگنڈے کو غیر موثر بنا دیا۔

(۲۸) امام زین العابدین کے زمانے میں درج ذیل خلفاء رہے:

(۱) یزید بن معاویہ (۶۱ھ تا ۶۴ھ)

(۲) عبداللہ بن زبیر (۶۱ھ تا ۷۳ھ)

(۳) معاویہ بن یزید (۶۴ھ میں چالیس دن)

(۴) مروان بن حکم (۶۵ھ نو ماہ)

(۵) عبدالملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ)

(۶) ولید بن عبدالملک (۶۸ھ تا ۹۵ھ)

(۲۹) امام زین العابدینؑ کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

(۱) سعید بن مسیب

(۲) سعید بن جبیر

(۳) محمد بن جبیر

(۴) امیر یحییٰ بن ام الطویل

(۵) ابو خالد کابلی

(۶) ابو حمزہ ثمالی۔

(۳۰) تمام ائمہ میں دو خصوصیات مشترک تھیں۔

(۱) عبادت اور خدا خوفی

(۲) غریب اور پچھڑے ہوئے طبقے سے ہمدردی۔

(۳۱) امام زین العابدینؑ اس انداز سے زندگی گزارتے تھے کہ لوگ اہل بیتؑ کی زندگی میں اسلام کی معنویت کو بخوبی مشاہدہ کر سکیں۔

(۳۲) عبدالملک بن مروان ۱۲ سال حکومت کرنے کے بعد ۸۶ھ مر گیا تو اُس کا بیٹا ولید برسر اقتدار آیا۔ اُس نے لوگوں بالخصوص اہل مدینہ کا غصہ کم کرنے کے لیے عبدالملک بن مروان کے سسر ہشام بن اسماعیل مخزومی کو مدینہ کی گورنری سے معزول کر دیا۔ یہ شخص بڑا ظالم اور گستاخ تھا۔ خاندان علیؑ اور بالخصوص امام زین العابدینؑ کے ساتھ انتہائی نازیبا سلوک روا رکھا تھا۔ ولید نے اُس کی جگہ عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا جو لوگوں میں اپنے حسن سلوک اور انصاف پروری کی وجہ سے مشہور تھا۔

(۳۳) عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور حکومت میں حسب ذیل اصلاحی اقدامات کئے:

(الف) اُنھوں نے تمام سرکاری سواریوں کی سرعام بولی ولائی اور اس سے حاصل ہونے والی رقم بیت المال میں جمع کرائی۔

(ب) اُنھوں نے سلیمان بن عبدالملک کی تمام جائداد، غلہ جات اور قیمتی لباس کو فروخت کر دیا جس سے ملنے والے دو لاکھ چالیس ہزار دینار بیت المال میں جمع کرا دیئے۔

(ج) اُنھوں نے یہ حکم جاری کیا کہ سرکاری اہل کاروں نے جو بھی ناجائز دولت اکٹھی کی ہے وہ بیت المال میں جمع کرا دیں۔

(د) اُنھوں نے امیر المومنینؑ پر ۶۹ سال سے جاری سب و شتم کو ختم کیا۔

(ہ) اُنھوں نے جاگیر فدک امام محمد باقرؑ کو واپس کی۔

(و) اُنھوں نے حدیث نبویؐ لکھنے پر پابندی کو اُٹھا لیا۔

(۳۴) امام محمد باقرؑ جمعہ ۳ صفر ۵۷ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے بچپن میں اپنے دادا کی شہادت کا اندوہناک منظر دیکھا تھا۔ آپ نے اہل بیت نبوت کی اسیری کے واقعات کا مشاہدہ کیا تھا اور واقعہ حرہ میں مسلمانوں کے قتل عام اور خانہ کعبہ کی توہین کے مناظر دیکھے تھے۔

آپ نے اپنے ۱۹ سالہ دور امامت میں زرارہ بن اعین، ابان بن تغلب، ابو بصیر، محمد بن مسلم اور

کمیت اسدی جیسے شاگردوں کی تربیت کی تھی۔

ہشام بن عبدالملک کے حکم سے آپ کو زہر دیا گیا جس کے اثر سے آپ ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو ۵۷ برس کی عمر میں شہید کر دیے گئے۔ آپ کو قبرستان بقیع میں دفن کیا گیا۔

(۳۵) امام محمد باقرؑ کے زمانے میں حسب ذیل خلفاء گزرے:

(۱) ولید بن عبدالملک (۹۳ھ تا ۹۶ھ)

(۲) سلیمان بن عبدالملک (۹۶ھ تا ۹۹ھ)

(۳) عمر بن عبدالعزیز (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ)

(۴) یزید بن عبدالملک (۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ)

(۵) ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ھ تا ۱۱۴ھ)

(۳۶) ۱۶ھ سے ۱۱۴ھ کے دوران اسلامی معاشرہ سیاسی اور اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا۔ مروانی خلفاء اور اُن کے اہل کاروں کی بداعمالیوں کے اثرات پورے اسلامی معاشرے پر مرتب ہوئے تھے حتیٰ کہ مکہ اور مدینہ جیسے اسلامی مراکز بھی برائی اور بے حیائی کی زد پر تھے۔ دنیا کے بدترین ہجوگو شعراء مکہ و مدینہ میں رہتے تھے۔

(۳۷) امام زین العابدینؑ کی ۳۴ سالہ کاوشوں اور امام محمد باقرؑ کی ۱۹ سالہ جدوجہد نے عظیم جعفری یونیورسٹی کے لیے زمین ہموار کی تھی جہاں امام جعفر صادقؑ نے کھل کر لوگوں کو مختلف علوم کی تعلیم دی۔

(۳۸) ائمہ طاہرینؑ کی سیرت میں ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بجائے خود شیعوں کے لیے قوت اور افتخار کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے شیعہ قیاس و استحسان کے محتاج نہیں ہیں۔

(۳۹) ائمہ طاہرینؑ ہر زمانے میں اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کو مدنظر رکھتے تھے۔ جب زمانے بدلتے ہیں اور زمان و مکان کے تقاضوں میں تبدیلی آتی تو اُن کی سیرت میں بھی ظاہری تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔

maablib.org

چھٹا باب

ائمہ طاہرینؑ بنو عباس کے دور میں

بنو عباس کا دورِ حکومت

امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام علی رضاؑ سے امام عصرؑ تک ائمہ کی حیاتِ مبارکہ

بنو عباس کا دورِ حکومت

بنی ہاشم کے بزرگوں کا خفیہ اجلاس

مکہ و مدینہ کے درمیان ابواء[1] کے مقام پر بنی ہاشم کے اکابرین کا ایک خفیہ اجلاس منعقد ہوا جس میں اولادِ امام حسنؑ میں سے عبداللہ محض اور اُن کے بیٹے محمد و ابراہیم نیز بنی عباس میں سے ابراہیم امام، ابو العباس سفاح، ابو جعفر منصور اور دیگر معززین بنی ہاشم شریک ہوئے... یہ اجلاس اہل خراسان کے قیام سے بارہ برس پہلے منعقد ہوا تھا۔ یہ معاملہ یوں شروع ہوا۔

محمد نفس زکیہ کی بیعت

بنی عباس شروع شروع میں حالات کو اپنے لیے موافق نہیں سمجھتے تھے، اس لیے اُنھوں نے کوشش کی کہ ابتدا میں آل علیؑ سے ایک ایسے فرد کا انتخاب کیا جائے جو لوگوں کے احترام کا مرکز ہو اور بعد میں موقع ملتے ہی اُسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لیے محمد نفس زکیہ کو منتخب کیا گیا...

ابو الفرج[2] لکھتے ہیں کہ محمد نفس زکیہ کے علاوہ عبداللہ محض اٹھے۔ اُنھوں نے اپنے خطاب میں کہا اے لوگو! آپ سب جانتے ہیں إِنَّ ابنی هٰذا هُو المهدی (میرا یہ بیٹا اس اُمت کا مہدی ہے)۔ تم سب اُٹھو اور اس کی بیعت کرو... وہاں پر موجود لوگوں نے اس کی بیعت کی پھر اُنھوں نے امام جعفر صادقؑ کو اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ عبداللہ... نے آپ سے بھی وہی بات کہی جو وہ پہلے کہہ چکے تھے... امام صادقؑ نے

۱۔ تاریخ اسلام میں ابواء کا نام بکثرت ملتا ہے۔ ابواء وہ جگہ ہے جہاں رسول خدا ﷺ کی والدہ ماجدہ کی وفات ہوئی تھی اور اسی جگہ ۷ صفر ۱۲۸ھ کو امام موسیٰ کاظمؑ کی ولادت ہوئی تھی۔

۲۔ ابو الفرج لکھتے ہیں کہ بعض راویوں کے مطابق عبداللہ محض نے کہا تھا کہ اس موقع پر جعفر صادقؑ کو مت بلاؤ، وہ ہماری حمایت نہیں کریں گے اور ہمارا منصوبہ دھرا رہ جائے گا۔ وہاں پر موجود دوسرے لوگوں نے کہا کہ اُنھیں ضرور بلایا جائے چنانچہ اُنھوں نے امام کو اس اجلاس میں بلا ہی لیا۔ بعض وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ عبداللہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔

فرمایا: ... اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اسے اس امت کا مہدی سمجھ کر اس کی بیعت کروں تو میں بیعت نہیں کروں گا۔ اس کے مہدی ہونے کی بات غلط ہے۔ یہ مہدی کے ظہور کا وقت نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ حضرات کا قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے ہے تو پھر میں بیعت کرلوں گا۔

امام نے اپنی پوزیشن سو فیصد واضح کردی تھی۔ امام ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے اس تحریک میں شامل ہونے کو تیار تھے لیکن آپ اسے مہدی سمجھ کر تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تھے... امام کا جواب سن کر عبداللہ ناراض ہوگئے۔ آپ نے فرمایا: عبداللہ! تمہارا بیٹا مہدی نہیں ہے۔ ہم اہل بیت کے پاس اَسرار ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خلیفہ کون بنے گا اور کون خلیفہ نہیں بنے گا۔ تمہارا بیٹا خلیفہ نہیں بن سکے گا، وہ قتل ہو جائے گا۔

ابو الفرج نے لکھا ہے کہ عبداللہ ناراض ہوئے اور بولے کہ آپ اپنے عقیدے کے خلاف بات کر رہے ہیں۔ آپ میرے بیٹے سے حسد کرتے ہیں اسی لیے ایسی بات کر رہے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے ابو العباس سفاح کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا کہ یہ اور اس کا بھائی خلیفہ بنیں گے۔ یہ لوگ خلافت تم تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ تمہارے دونوں بیٹے قتل ہو جائیں گے۔[1]

بنی اُمیہ کی تباہی کے اسباب[2]

آہستہ آہستہ بنی اُمیہ کی مخالفت بڑھتی گئی۔ اُن کی مخالفت کرنے والوں میں عرب اور ایرانی دونوں شامل تھے۔ کچھ لوگوں نے دینی وجوہات کی بنا پر اور کچھ لوگوں نے دنیوی وجوہات کی وجہ سے اُن کی مخالفت کی۔ دینی وجہ بنی اُمیہ کا حد سے بڑھا ہوا فسق و فجور تھا جس کا ارتکاب خلفاء ڈنکے کی چوٹ پر کیا کرتے تھے...

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۳۱ ـ ۷ ـ ۱۳ ـ ص ۱۲۵

۲۔ بنی امیہ کی حکومت کے خاتمے کے اہم اسباب حسب ذیل ہیں:

(۱) موروثی اور استبدادی حکومت
(۲) زر خرید محدثین اور درباری ملاؤں کے ذریعے حقائق کی تحریف
(۳) قرآن و سنت کی کھلم کھلا مخالفت
(۴) حرمین شریفین کی اہانت
(۵) بیت المال کا ناجائز استعمال
(۶) ہوس رانی، مے نوشی اور موسیقی، شراب و شباب کی محافل
(۷) سونے کے زیورات کا استعمال
(۸) عربی عصبیت کا احیاء اور غیر عرب اقوام کی توہین
(۹) نسلی تفریق کی حوصلہ افزائی
(۱۰) مسلمانوں بالخصوص بنی ہاشم کا قتل عام
(۱۱) شیعوں کی مسلح جدوجہد
(۱۲) حکمرانوں کی سختی کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا معطل ہونا
(۱۳) جاہلی رسوم و آداب کو فروغ دینا

(سید جعفر شہیدی، تاریخ تحلیلی اسلام تا پایان اُمویان ص ۲۰۲ ـ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ)

علاوہ ازیں بنی اُمیہ نے بزرگان اسلام اور اسلام کے صاحبان تقویٰ افراد کے خلاف جرائم کئے تھے خصوصاً شہادت امام حسینؑ کے بعد بنو اُمیہ کے خلاف لوگوں کے دلوں میں شدید نفرت پیدا ہوئی اور اُن کی حکومت کے خلاف کئی تحریکیں اُٹھیں جن میں زید بن علی اور یحییٰ بن زید کا قیام بھی شامل ہے جس کی وجہ سے مذہبی لحاظ سے اُموی حکومت کا جواز ہی ختم ہوگیا تھا...

جہاں تک دنیوی وجوہات کا تعلق ہے تو بنی اُمیہ کے خلفاء بہت ظالم تھے۔ عراق میں اُن کے گورنر حجاج بن یوسف نے ظلم کی نئی تاریخ رقم کی تھی۔ اسی طرح اُن کے دیگر حکام نے خراسان میں ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اُموی حکام نے ایرانیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے تو اہل ایران میں بالعموم اور اہل خراسان میں بالخصوص بنی اُمیہ کے خلاف نفرت میں مزید اضافہ ہوا۔ علاوہ ازیں اسلام اور ریاستی حکمرانوں کا فرق بھی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا اور کچھ علویوں نے خراسان میں اس شعور کو فروغ دیا تھا اگرچہ قیام کرنے والے علوی تو مارے گئے تھے لیکن ان کی جدوجہد کا اثر موجود رہا...

بنوعباس نے لوگوں کی ناراضگی کا فائدہ اٹھایا

(بنی عباس[1] نے) بنی اُمیہ کی حکمرانی کے آخری ایام میں اس طرح کے واقعات سے بھرپور فائدہ اُٹھایا تھا۔ اُن کے فائدہ اُٹھانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ خفیہ طور پر مبلغین کی تربیت کرتے تھے۔ یوں اُنھوں نے مبلغین کی پوری کھیپ تیار کی تھی جبکہ وہ خود حجاز، عراق اور شام میں چھپ کر اس تحریک کی رہنمائی کرتے تھے۔

بنی عباس کے دو داعی ایسے تھے جو اس تحریک کی قیادت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک داعی عراق یعنی کوفہ میں تھا جو کہ اپنے آپ کو منظر عام پر نہیں لاتا تھا اور دوسرا داعی خراسان میں تھا۔ کوفہ میں رہائش پذیر داعی ابوسلمہ خلال تھا اور خراسان میں موجود داعی ابومسلم کے نام سے جانا جاتا تھا۔

پہلے درجے پر ابوسلمہ خلال تھا جو وزیر آل محمد کے لقب سے مشہور تھا اور دوسرے نمبر پر ابومسلم تھا جو امیر آل محمد کے لقب سے مشہور تھا۔[2]

ابومسلم کے حسب ونسب کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے۔ تاریخ آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ وہ عرب تھا یا ایرانی اور اگر ایرانی تھا تو کیا اصفہانی تھا یا خراسانی؟ اُس کی عمر بیس سال سے کچھ تھی کہ ابراہیم امام کی اس

۱۔ عبداللہ بن عباس امیر المومنینؑ کے مشہور صحابی تھے۔ اُن کے ایک بیٹے کا نام علی تھا اور علی کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا اور عبداللہ کے تین بیٹے تھے۔ ایک کا نام ابراہیم، دوسرے کا نام ابو العباس سفاح اور تیسرے کا نام ابوجعفر منصور تھا اور یہ تینوں ہی بہت ذہین اور تیز وطرار تھے۔ (تاریخ اسلام تا پایان اُمویان ص ۱۱۶)

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۱۶ ۔ ۱۳۱

سے ملاقات ہوئی۔ ابراہیم امام نے محسوس کیا کہ یہ بہت باصلاحیت جوان ہے۔ چنانچہ اُس نے اُسے یہ کہتے ہوئے خراسان بھیج دیا کہ یہ اس کام کے لیے بہت مناسب ہے۔ وہ اپنی صلاحیت کی بنیاد پر تمام عباسی مبلغین پر چھا گیا اور اُس نے خراسان میں اس تحریک کی قیادت سنبھال لی۔

سیاسی اعتبار سے ابومسلم ایک لائق آدمی تھا لیکن بلحاظ انسان وہ انتہائی برا شخص تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جس سے انسانیت کی بو بھی چھو کر نہیں گزری تھی۔ ابومسلم، حجاج بن یوسف کی مانند تھا۔ اگر عرب حجاج پر فخر کرسکتے ہیں تو پھر ہمیں بھی ابومسلم پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حجاج نے اپنے دورِ حکومت میں ایک لاکھ بیس ہزار انسان قتل کیے تھے جبکہ ابومسلم نے چھ لاکھ انسانوں کو قتل کیا تھا۔[۱]

ابوسلمہ اعلیٰ درجے کا مدبر، سیاست دان، معاملہ فہم، عالم اور منہ بولا تھا۔ ابومسلم، ابوسلمہ سے حسد اور رقابت رکھتا تھا۔ وہ خراسان سے ہی ابوسلمہ کو ٹھکانے لگانے کی تدبیریں کرنے لگا۔[۲]

اُس نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح سفاح ابوسلمہ سے بددل ہو جائے اور اُس کے قتل کا فرمان جاری کردے لیکن اُس کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ آخرکار اُس نے چند افراد کو تیار کیا کہ وہ رات کے وقت ابوسلمہ کو قتل کر دیں۔ چنانچہ اُس کے آدمیوں نے ابوسلمہ کا کام تمام کر دیا۔ سفاح کے ساتھی بھی ابوسلمہ کو ناپسند کرتے تھے اس لیے اُس کا خون رائیگاں چلا گیا۔ یہ واقعات سفاح کی خلافت کے پہلے سال پیش آئے تھے۔

مؤرخین نے اس سلسلے میں ایک ایسا واقعہ نقل کیا ہے جس پر بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور وہ واقعہ یہ ہے۔

امام جعفر صادقؑ اور عبداللہ محض کے نام ابوسلمہ کے خطوط

مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب[۳] میں لکھا ہے کہ ابراہیم امام شام میں رہ کر مخفی طور پر عباسی تحریک کی قیادت کرتا تھا۔ وہ سفاح اور منصور کا بڑا بھائی تھا اور سفاح و منصور اسے خلیفہ بنانے کے خواہش مند تھے لیکن اُس کی بدبختی یہ ہوئی کہ وہ بنی اُمیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کی گرفت میں آگیا۔ ابراہیم کو بھی پتا چل گیا تھا کہ اُموی خلیفہ کو اُس کے مخفی ٹھکانے کا پتا چل چکا ہے اور وہ عنقریب گرفتار ہو جائے گا۔ چنانچہ اُس

۱۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ج ۱۰، ص ۷۲۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان ج ۳، ص ۱۴۸۔ ابن اثیر، تاریخ کامل ج ۵، ص ۴۷۶ بہ نقل از مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۳۸۹

۲۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان ج ۲، ص ۱۹۶

۳۔ مسعودی، مروج الذہب ج ۳، ص ۲۵۳، ۲۵۴

نے وصیت نامہ لکھا اور اس وصیت نامے میں مستقبل کے لیے ہدایات تحریر کیں اور اپنے جانشین کا تعین کیا۔ اُس کا خط اُس کے بھائیوں کو ملا اور وہ چپکے سے کوفہ چلے گئے اور ایک عرصے تک، کوفہ میں روپوش رہے۔ اس وقت ابوسلمہ بھی کوفہ میں چھپا ہوا تحریک کی رہنمائی کر رہا تھا۔ دو تین مہینے بعد وہ ظاہر ہوئے اور بنی اُمیہ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کر لی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ابراہیم امام کی موت کے بعد جب امور خلافت سفاح اور اُس کے ساتھیوں کے ہاتھ میں آئے تو ابوسلمہ پشیمان ہوا اور سوچنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح خلافت کو بنی عباس سے نکال کر خاندان علیؑ میں منتقل کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے دو خطوط[1] مدینہ روانہ کیے۔ ایک خط امام جعفر صادقؑ کو بھیجا اور دوسرا خط عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن امام حسن بن حضرت امیرالمومنینؑ کے نام روانہ کیا۔[2]

ابوسلمہ نے خط میں لکھا کہ نظام خلافت میرے ہاتھ میں ہے۔ خراسان اور کوفہ کے اختیارات بھی میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں اب تک بنی عباس کے مفادات کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں ان حالات کو آپ کے دست تصرف میں دینے کے لیے آمادہ ہوں۔[3]

امام جعفر صادقؑ اور عبداللہ محض کا ردعمل

ابوسلمہ کا قاصد امام جعفر صادقؑ کو خط دینے کے بعد عبداللہ محض کو خط دے گیا۔ دونوں بزرگوں کا ردعمل ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ قاصد نے رات کے وقت امام جعفر صادقؑ کو خط دیا اور کہا کہ یہ خط آپ کے

۱۔ ابوسلمہ خلال نے امام جعفر صادقؑ، عبداللہ محض اور عمر بن زین العابدینؑ کو خطوط لکھے تھے۔ امام جعفر صادقؑ اور عمر بن امام زین العابدینؑ نے اُس کی پیشکش کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔

(ابن طقطقا، الفخری فی الآداب السلطانیۃ والدول الاسلامیۃ ج ۱، ص ۱۵۳ ۔ ۱۵۴)

۲۔ امام حسنؑ کے ایک بیٹے کا نام بھی حسن تھا جنھیں حسن مثنیٰ کہا جاتا تھا۔ حسن مثنیٰ کربلا میں موجود تھے اور وہ زخمی ہوئے تھے۔ اُن کے ایک مادری رشتے دار نے اُنھیں اُٹھا لیا تھا اور ابن زیاد سے اُن کی سفارش کی تھی۔ ابن زیاد نے معاف کر دیا تھا۔ اُن کا علاج ہوا اور وہ تندرست ہو گئے تھے۔ بعد میں اُن کی شادی امام حسینؑ کی دختر فاطمہ بنت الحسینؑ سے ہوئی تھی۔ حسن مثنیٰ کو خدا نے دو بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک یہی عبداللہ تھے۔ یہ امام حسنؑ کے پوتے اور امام حسینؑ کے نواسے تھے اسی لیے اُنھیں عبداللہ محض یعنی خالص فرزند رسولؐ کہا جاتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ کے عہد میں وہ حسنی سادات کے سربراہ شمار کیے جاتے تھے۔

۳۔ ابراہیم امام کی موت کے بعد ابومسلم نے بھی امام جعفر صادقؑ کو حکومت کی پیشکش کی تھی جسے آپ نے مسترد کر دیا تھا۔

(شہرستانی، الملل والنحل ج ۱، ص ۱۵۴)

شیعہ ابوسلمہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ امام نے فرمایا کہ ابوسلمہ میرا شیعہ نہیں ہے۔ آپ نے خط پڑھنا بھی گوارا نہ کیا اور چراغ کی لو پر خط کو نذرِ آتش کر دیا اور فرمایا کہ واپس جا کر ابوسلمہ سے کہہ دینا کہ تمہارے خط کا یہی جواب ہے۔ پھر آپ نے بطور تمثیل یہ شعر پڑھا:

ایا موقدا نارا لغیرک ضوءُ ھا ۔۔۔ ویا حاطبًا فی غیرِ حبلِک تحطِبُ

اے آگ جلانے والے! اس کی روشنی تیرے علاوہ کسی اور کے مقدر میں ہے۔ اے لکڑیاں جمع کرنے والے! تو اپنی لکڑیاں کسی اور کی رسی میں باندھ رہا ہے۔ رسی کا مالک تجھ سے لکڑیاں چھین لے گا۔

ابوسلمہ کا قاصد امام سے مایوس ہونے کے بعد عبداللہ محض کے پاس گیا۔ عبداللہ کو خط ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

مسعودی لکھتے ہیں کہ صبح ہوئی تو عبداللہ گدھے پر سوار ہو کر امام جعفر صادقؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ابوسلمہ نے یہ خط بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ خراسان میں ہمارے شیعہ حکومت وخلافت کے معاملات ہمارے ہاتھوں میں دینے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ ابوسلمہ نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اس پیشکش کو قبول کروں۔

مسعودی لکھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے اُن سے فرمایا: خراسان کے لوگ کب سے تمہارے شیعہ بنے ہیں جن کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہمارے شیعوں نے لکھا ہے؟

کیا ابومسلم کو آپ نے خراسان بھیجا تھا؟ اور کیا آپ نے اہل خراسان کو سیاہ لباس پہننے کا حکم دیا تھا؟[1]

۱۔ یحییٰ بن زید کے سوگ میں سیاہ لباس پہنے گئے تھے۔

☆ اسلام کے خلاف جنگوں میں کفار قریش کا جھنڈا کالا تھا جبکہ مسلمانوں کا جھنڈا سفید تھا۔ صفین میں معاویہ کے لشکر کا جھنڈا بھی کالا اور حضرت علیؑ کے لشکر کا جھنڈا سفید تھا۔ آج کل اسلامی جہادی تنظیمیں جیسے القاعدہ بھی کالا جھنڈا استعمال کرتی ہیں جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوتا ہے۔ داعش کا لباس اور جھنڈا بھی کالا ہے نیز بوکو حرام (یعنی مغربی تعلیم حرام ہے) کا جھنڈا بھی کالا ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم آیتی اپنی کتاب تاریخ عاشورا میں لکھتے ہیں: نصر بن مزاحم نے ''کتاب صفین'' میں اپنی سند سے اسماء بن حکم فزاری سے روایت کی ہے کہ ... ایک شخص لشکر کی صفوں کو چیرتا ہوا ہمارے پاس آیا اور پوچھا کہ تم میں عمار بن یاسرؓ کون ہے؟ حضرت عمارؓ نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ اے ابویقظان! مجھے ایک بات کہنی ہے ... وہ بھی ہماری طرح اذان دیتے ہیں ہماری ہی طرح نماز پڑھتے ہیں اور ہماری ہی طرح دعا مانگتے ہیں۔ ان کی کتاب بھی قرآن ہے۔ ان کے اور ہمارے رسول ایک ہی ہیں ... اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ دیکھوں آپ کیا کہتے ہیں؟ عمارؓ نے کہا: ''وہ سامنے صاحب ''سیاہ پرچم'' دیکھ رہے ہو؟ یہ عمرو بن العاص ہے۔ میں نے تین مرتبہ بدر، احد اور حنین میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اسی پرچم کے خلاف جنگ میں حصہ لیا ہے۔ اب یہ چوتھی بار جنگ میں شرکت کر رہا ہوں اور اس دفعہ حالت کچھ پہلے سے بدتر ہی ہے۔''

(کتاب صفین ص ۳۲۰، طبع دوم مصر۔ ص ۱۶۶، طبع ایران) رضوانی

اور جو لوگ خراسان سے آئے ہیں[1] کیا انھیں آپ یہاں بلا لائے ہیں؟

امام کی باتیں سن کر عبداللہ ناراض ہوئے اور اُٹھ کر چلے گئے۔

یہ واقعات بنی عباس کی خلافت کے ابتدائی ایام میں پیش آئے۔ ابو مسلم کی کوشش تھی کہ ابوسلمہ کا پتہ درمیان سے کاٹ دیا جائے اور سفاح کے چچا بھی یہی چاہتے تھے کہ ابوسلمہ کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ابھی ابوسلمہ کا قاصد کوفہ نہیں پہنچا تھا کہ ابوسلمہ کو قتل کر دیا گیا۔ عبداللہ محض نے ابوسلمہ کو جو جواب لکھا تھا وہ جواب بھی ابوسلمہ تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

اس واقعے پر تنقید و تحقیق

دیگر مورخین نے بھی وہی لکھا ہے جو مسعودی نے لکھا ہے۔ میری نظر میں ابوسلمہ کا معاملہ انتہائی واضح ہے۔ ابوسلمہ ایک سیاسی آدمی تھا۔ وہ نہ تو شیعہ تھا اور نہ ہی امام جعفر صادقؑ کا حامی تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ بنی عباس کے جس شخص کے لیے اُس نے تحریک چلائی تھی وہ دنیا میں نہیں رہا اور اُس کی بجائے اُس کے بھائی خلافت پر قابض ہو رہے ہیں جو لوگوں میں چنداں مقبول نہیں تو اُس نے خلافت کا رخ آلِ ابی طالب کی طرف موڑنا چاہا اور اسے آلِ ابی طالب میں دو قدآور شخصیات دکھائی بھی دے رہی تھیں۔ اُن میں ایک امام جعفر صادقؑ اور دوسرے عبداللہ محض تھے۔ اُس نے دونوں کو ایک ہی مضمون کا خط لکھا تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں میں سے جس نے بھی اُس کی پیشکش قبول کر لی وہ اُس کے مفاد میں ہوگی۔ ابوسلمہ کی پیشکش نہ تو دینی نظریے پر قائم تھی اور نہ ہی اُس میں کسی طرح کا خلوص موجود تھا۔

امام جعفر صادق کو بخوبی معلوم تھا کہ اہلِ بیتؑ کی طرف داری کا نعرہ صرف لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بلند کیا جا رہا ہے اور اس نعرے کی آڑ میں ابو مسلم اور ابوسلمہ اپنا اثر رسوخ بڑھانا چاہتے ہیں جبکہ اس نعرے پر کبھی بھی عمل نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی ابوسلمہ کو خط کا جواب موصول ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔

مجھے تاریخ شناسی کا دعویٰ کرنے والوں کی سوچ پر بہت حیرت ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی شخص سے میں نے سنا کہ وہ کہہ رہا تھا جب ابوسلمہ خلال امام جعفر صادقؑ کو حکومت کی پیشکش کر رہا تھا تو اُنھوں نے اس پیشکش سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟

اس طرح کی سوچ کا جواب یہ ہے کہ امام، ابوسلمہ کی پیشکش قبول کرتے بھی تو کیسے کرتے جس میں

۱۔ اُس وقت بہت سے خراسانی عراق آئے ہوئے تھے اور وہ عربوں کے ساتھ مل کر بنی عباس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

کوئی معنوی شرائط موجود نہ تھیں یعنی یہ پیشکش کسی مخلص انسان کی طرف سے نہیں تھی اور نہ ہی اس میں ظاہری شرائط موجود تھیں۔[۱]

عباسی حکومت کی روش اور خصوصیت

(۱) ایرانیوں کی حمایت

۱۳۲ھ میں جب بنی عباس برسرِاقتدار آئے تو سیاست کے انداز بھی تبدیل ہو گئے۔ عباسی خلافت کے آغاز سے معتصم کے دور تک اُن کی حکومت ایرانیوں کی حمایت سے قائم رہی اور یہ عربوں پر ایرانی غلبے کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ بنی عباس کے اقتدار کی پہلی صدی اہل ایران کے لیے سنہری صدی ثابت ہوئی۔ اس دور میں برامکہ خاندان کی وزارت قائم ہوئی۔ اس خاندان کا تعلق بلخ کے بدھ مت کے پیروکاروں کی نسل سے تھا۔ مامون کے عہد میں فضل بن سہل سرخسی کے اقتدار کا طوطی بولتا تھا اور اسے ''ذوالریاستین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایسے ہی ایرانی وزراء کو طاقت حاصل تھی۔[۲]

(۲) فارسی زبان کی ترویج

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی عباس اگرچہ عرب تھے مگر اُنھوں نے ایرانیوں سے بھی زیادہ فارسی کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لی تھی۔ بنی عباس نے بنی اُمیہ سے اقتدار چھینا تھا۔ بنی اُمیہ کی سیاست کا دارومدار عرب قومیت پر قائم تھا۔ اسی وجہ سے بنی عباس نے عرب قومیت کی حوصلہ شکنی کے ساتھ ایسے تمام امور کی بیخ کنی کی جن سے عربوں کو غیر عرب اقوام پر فوقیت حاصل ہو سکتی تھی۔ اُنھوں نے دل کھول کر غیر عرب عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور ایسے تمام معاملات جن سے غیر عرب کو عربوں پر غلبہ مل سکتا تھا اُن کی خوب سرپرستی کی۔ انہی مقاصد کے لیے فارسی زبان کو ترویج دی گئی بلکہ اسے عربی زبان کے مقابلے میں لایا گیا۔[۳]

(۳) حدیث سازی

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں اگر کوئی شخص آپ پر جھوٹ تراشتا تو اُس کی ذاتی غرض وابستہ ہوتی تھی مگر بعد میں آپ پر جھوٹ باندھنے میں ایک اجتماعی پہلو پیدا ہو چکا تھا۔ جھوٹی احادیث سیاست دانوں کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتی تھیں۔ خلفائے وقت اپنی سیاست کی دکان چمکانے کے لیے ان جھوٹی احادیث سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے اور اس کام کے لیے رقم خرچ کرتے تھے اور اہل ہوس کو تلاش کر کے من پسند موضوعات پر احادیث سازی کراتے تھے۔[۴]

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار، ص ۱۲۱ ۔ ۱۲۵
۲۔ مجموعہ آثار ج ۱۴، ص ۵۸۴
۳۔ ایضاً ص ۱۰۸ ۔ ۱۱۰
۴۔ اسلام و مقتضیات زمان ج ۱، ص ۱۳۰ ۔ ۱۳۱

(۴) جھوٹ کا فروغ

بنی عباس نے ایک تباہ کن جھوٹ پھیلایا جس کی طرف مختصر اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اس جھوٹ کو اتنے تواتر اور تسلسل کے ساتھ پھیلایا گیا کہ یہ کتابوں کا حصہ بن گیا اور عوام میں اسے شہرت ملی۔ وہ جھوٹ یہ تھا کہ امام حسن مجتبیؑ نے سیکڑوں نکاح کیے تھے اور وہ نعوذ باللہ ایک عیاش شخص تھے۔ وہ روزانہ کسی عورت سے نکاح کرتے اور چند روز بعد اُسے طلاق دے دیتے۔ یہ جھوٹ امام کی شہادت کے ایک سو سال بعد تراشا گیا اور اس کی ہر جگہ تشہیر کی گئی یہاں تک کہ آل محمدؐ کے چاہنے والے بھی تحقیق کے بغیر اسے صحیح سمجھنے لگے اور اس کے دوسرے پہلو کی طرف کسی نے توجہ نہ کی کہ اسلام میں یہ عمل قابل نفرت سمجھا جاتا ہے اور ایسے عمل کی عیاش اور رنگین مزاج لوگوں سے تو توقع کی جاسکتی ہے مگر اُس ہستی سے ہرگز نہیں جس نے کئی بار پاپیادہ حج کیا ہو، جس نے بیس سے زائد مرتبہ اپنے گھر کا نصف مال غریبوں میں تقسیم کردیا ہو اور امامت و طہارت کے بلند ترین منصب پر فائز ہو۔ ایسی ہستی کے لیے ایسے فعل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

یہ خوش نصیبی ہے کہ ماضی قریب میں محققین نے اس موضوع پر تحقیق کی اور اس جھوٹ کا منبع تلاش کر لیا کہ سب سے پہلے یہ بات منصور دوانیقی کے مقرر کردہ قاضی کی زبان سے سنی گئی تھی۔ منصور نے اُس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ تم اس خودساختہ روایت کو عام کرو۔[۱]

(۵) غداری

شروع شروع میں بنی عباس، اولاد حسنؑ کے مقابلے میں خود کو حقیر سمجھتے تھے اور اُنھیں اپنے سے افضل اور بلند مرتبہ جانتے تھے لیکن اقتدار پر گرفت مضبوط ہوتے ہی اُنھوں نے اولاد امام حسنؑ کے ساتھ غداری شروع کردی اور اُن کی ایک بڑی تعداد کو یا توقتل کردیا یا اُنھیں زندانوں میں ڈال دیا۔[۲]

۱۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۳۰۶ ۔ ۳۰۸

۲۔ ایضاً

امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام جعفر صادقؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام جعفر صادقؑ ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ کو عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ۲۵ شوال یا رجب ۱۴۸ھ میں ۶۵ برس کی عمر میں ابو جعفر منصور عباسی کے عہد خلافت میں شہید کیے گئے۔ آپ نے ۳۴ برس تک امامت کا فریضہ سرانجام دیا۔ آپ کو جنت البقیع میں آپ کے والد گرامی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپ کی والدہ قاسم بن محمد بن ابوبکر کی صاحبزادی ام فروہ تھیں۔[۱]

آپ کی امامت کے پہلے اٹھارہ برس میں حسب ذیل اُموی خلفاء تخت خلافت پر قابض رہے۔

(۱) ہشام بن عبدالملک (۱۱۴ھ تا ۱۲۵ھ)

(۲) ولید بن یزید بن عبدالملک (۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ)

(۳) یزید بن ولید بن عبدالملک (۱۲۶ھ)

(۴) ابراہیم بن ولید بن عبدالملک (۱۲۶ھ کے ۷۰ دن)

(۵) مروان بن محمد (۱۲۶ھ تا ۱۳۲ھ) یہ بنی اُمیہ کا آخری خلیفہ تھا۔ اس کے بعد بنی عباس برسر اقتدار آئے

آپ نے اپنی امامت کے ۱۶ سال دو عباسی خلفاء کے عہد میں بسر کیے۔

(۱) عبداللہ بن محمد المعروف سفاح (۱۳۲ھ تا ۱۳۷ھ)

(۲) ابو جعفر المعروف منصور دوانیقی[۲] (۱۳۷ھ تا ۱۴۸ھ)

امام جعفر صادقؑ کے عہد امامت میں حکومت بنی امیہ کے ہاتھ سے نکل کر بنی عباس کے ہاتھ میں آ گئی عباسی، بنی ہاشم تھے اور اولادِ علیؑ کے عم زاد تھے۔ جب آخری اُموی خلیفہ مروان بن محمد (حمار) کی حکومت پر

۱۔ قاسم نے اپنے چچا عبدالرحمان بن ابی بکر کی بیٹی سے نکاح کیا تھا جن سے ام فروہ پیدا ہوئی تھیں چنانچہ وہ پدری اور مادری لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ کی نسل سے تھیں۔

۲۔ بیست گفتار ص ۱۶۳۔ سیرۂ پیشوایان ص ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ محمد نصیری، تاریخ تحلیلی اسلام ص ۲۳۲

گرفت ڈھیلی ہونے لگی تو عباسیوں اور علویوں کے ایک گروہ نے تبلیغ و دعوت کا کام شروع کردیا۔

ابو العباس سفاح، منصور دوانیقی اور اُن کے بڑے بھائی ابراہیم امام نے محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن امام حسن مجتبیٰ المعروف نفس زکیہ کی بیعت کی تھی۔ منصور عباسی جس نے بعد میں نفس زکیہ کو قتل کرایا تھا شروع میں نفس زکیہ کے والد عبداللہ بن حسن کی سواری کی رکاب تھامتا تھا۔ بنو عباس ایسے لوگوں میں سے ہرگز نہ تھے جنھیں دین کا درد ہوتا ہے۔[1]

بنی عباس کو دین کی ہرگز فکر نہیں تھی، انھیں صرف اقتدار سے مطلب تھا۔[2] اُن لوگوں کا ہدف دنیا کا حصول تھا۔ انھیں اقتدار کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں تھی اسی لیے امام جعفر صادقؑ نے روزِ اول سے اُن کے ساتھ تعاون نہیں فرمایا۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ جب ابراہیم امام قتل ہوئے تو ابوسلمہ نے امام جعفر صادقؑ اور عبداللہ محض کے نام ایک ہی مضمون کے دو خط بھیجے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے اُس کے خط کو پرکاہ کے برابر اہمیت نہ دی جبکہ عبداللہ بن حسن نے ابوسلمہ کو جواب لکھا تھا لیکن وہ جواب ابوسلمہ تک پہنچا نہ تھا کہ سفاح اور ابومسلم کی ملی بھگت سے ابوسلمہ کو قتل کردیا گیا اور یہ مشہور کیا گیا کہ اُسے خوارج نے قتل کیا ہے۔ بعد میں عبداللہ اور اُس کے فرزند بھی گرفتار ہوئے اور انھیں بھی قتل کردیا گیا۔

حکومت سے امام کی لاتعلقی کی وجہ

امام کی حکومت سے لاتعلقی کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ آپ جانتے تھے کہ بنی عباس اس میں رکاوٹیں کھڑی کریں گے اور آخرکار آپ کو شہید کردیں گے بلکہ آپ کے پیش نظر اس سے اعلیٰ و ارفع مقصد تھا۔ آپ ایک علمی، فکری اور تربیتی تحریک کی رہبری کرنا چاہتے تھے جس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں ایک طرف تو سیاسی حوادث جنم لے رہے تھے (مثلاً زید بن علی کا ۱۲۲ھ میں قیام اور محمد بن عبداللہ بن حسن اور اُن کے بھائی ابراہیم کا ۱۳۵ھ تا ۱۳۶ھ میں قیام، عباسیوں کی تحریک)۔ دوسری طرف فکری اور روحانی ابہام اور پیچیدگیاں جنم لے رہی تھیں اس لیے آپ نے کسی سیاسی تحریک کا حصہ بننے کی بجائے اپنے جہاد کا آغاز فکری اور روحانی محاذ سے کیا۔

حضرت سید الشہداء کا زمانہ پہلی صدی ہجری کا درمیانی زمانہ تھا۔ اُس زمانے کے اپنے تقاضے تھے جبکہ امام جعفر صادقؑ کا زمانہ دوسری صدی ہجری کے نصف اوّل کا زمانہ تھا اور اُس دور کے تقاضے جداگانہ تھے۔ پہلی صدی ہجری میں صرف ایک محاذ درپیش تھا۔ وہ غاصب اور فاسد خلافت کے خلاف جہاد کا محاذ تھا

۱۔ بیست گفتار، ص ۱۷۸۔ امام جعفر صادقؑ کے زمانے کی خصوصیت۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۳۷ - ۱۳۸

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۳۷

جبکہ بعد کے زمانوں میں مسلمانوں میں علمی اور فکری و فرہنگی تحریک کا آغاز ہوا۔ دین کے اُصول و فروع کے حوالے سے بہت سے مذاہب و مسالک نے جنم لیا۔[1]

ادھر بنی عباس اور بنی اُمیہ کی سیاسی چپقلش کی وجہ سے آپ کو قدرے سکون میسر ہوا اور حقائق بیان کرنے کی راہ میں حائل حکومتی رکاوٹیں ختم ہو چکی تھیں اور مسلمان حقائق دین سمجھنے کی طرف رغبت کرنے لگے تھے۔ ان حالات میں امام جعفر صادقؑ کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ آپ امت کی فکری رہنمائی کریں اور علم و ہدایت کی مسند بچھائیں۔

امام جعفر صادقؑ کے مکتب میں بہت سے شاگردوں نے پرورش پائی اور آپ نے مختلف شاگردوں کو اسلام کے مختلف علوم و معارف کی تعلیم دی تھی۔

شیخ طوسی نے اپنی کتاب رجال میں امام جعفر صادقؑ سے کسب علم اور روایت کرنے والوں کی تعداد چار ہزار افراد لکھی ہے۔ آپ کے چند مشہور شاگردوں کے نام درج ذیل ہیں۔

ابان بن تغلب، ابوبصیر، برید بن معاویہ عجلی، ابوحمزہ ثمالی، زرارہ بن اعین، حمران بن اعین شیبانی، جابر بن یزید جعفی کوفی، صفوان جمال، عبداللہ بن ابی یعفور، معلی بن خنیس، محمد بن علی نعمان، ہشام بن حاکم اور مفضل بن عمر جعفی۔[2]

امام عالی مقام کی زندگی میں کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ ابن ابی العوجاء اور ابو شاکر دیصانی اور ابن مقفع جیسے زندیق اور دہریہ آتے اور امام سے مباحثہ کرتے ہیں۔ کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ معتزلہ کے اکابرین عمرو بن عبید اور واصل بن عطا جیسے دانشور آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ سے مختلف مسائل پر بحث و گفتگو

۱۔ اس زمانے میں عقائد کی جنگ زوروں پر تھی۔ قرآن کی قرأت، تفسیر اور معانی کے بیان میں اختلاف نمایاں ہو چکا تھا۔ مکہ، مدینہ، بصرہ اور بعدازاں مفتوحہ اندلس میں بھی مختلف فقہی دبستان منظرعام پر آچکے تھے۔ متکلمین کی کلامی جنگ کا بازار اس سے بھی کہیں زیادہ گرم تھا۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک "زنادقہ" تھے۔ وہ اس دور کے جدید تعلیم یافتہ لوگ تھے اور اسی زمانے کی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ خدا اور تمام ادیان کا سرے سے انکار کرتے تھے اور ہر جگہ مکمل آزادی سے حتیٰ کہ حرمین شریفین میں بھی اپنے عقائد کا پرچار کرتے تھے۔ اُن کے علاوہ "متصوفہ" کے نام سے ایک زاہد اور تام نہاد مقدس مآبوں کا گروہ بھی پیدا ہو چکا تھا اور اس کے پیروکاروں کی تعداد بھی کافی تھی۔ یہ لوگ اسلام کے خلاف تو نہیں تھے البتہ یہ کہتے تھے کہ اسلام وہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ اس دور میں "خوارج و مرجئہ" بھی ایک مسلک کی شکل میں اپنے آپ کو منظم کر چکے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے ان تمام گمراہ فرقوں کا مقابلہ کیا اور ہر باطل نظریے سے مقابلے کے لائق شاگردوں کی تربیت کرکے انھیں اسلامی معاشرے کے حوالے کیا۔ (سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۳۳ ـ ۱۳۶)

۲۔ یاد ایام ج ۲، ص ۱۲۶ ـ ۱۳۰ ـ نور اللہ علی دوست خراسانی، پرتوی از زندگانی امام جعفر صادقؑ ص ۲۱۹ ـ ۲۵۲

کرتے ہیں اور مطمئن ہو کر واپس جاتے ہیں اور کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُس زمانے کے نامور فقہاء جن میں سے کچھ براہ راست آپ کے شاگرد ہیں یا پھر آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور مسائل دریافت کرتے ہیں۔ چنانچہ ابو حنیفہ اور مالک نے آپ سے براہ راست کسب فیض کیا تھا جبکہ شافعی اور احمد بن حنبل آپ کے شاگردوں کے شاگرد تھے اور کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیہ آپ کے پاس آتے ہیں اور آپ اُن کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔[1]

بغداد جو صدر اسلام کی علمی تحریکوں کا مرکز تھا اس کی تاسیس امام جعفر صادقؑ کی حیات مبارکہ میں ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی زندگی کے اواخر میں بغداد کا سفر کیا تھا۔ یہ امام جعفر صادقؑ کی تعلیمات کا اثر ہے کہ اسلامی فرقوں میں شیعہ تمام علوم میں پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ادب، تفسیر، فقہ، کلام، فلسفہ، عرفان، نجوم، ریاضی تاریخ اور جغرافیہ جیسے علوم پر نظر ڈالیں تو آپ کو ان تمام علوم میں شیعہ سب سے آگے دکھائی دیں گے۔

مذکورہ بالا تمام علوم کے بارے میں شیعوں نے کتابیں لکھیں اور قابل ترین لوگ منظر عام پر آئے اور دنیا کو بہترین تصنیفات اور تالیفات کا تحفہ دیا۔ شیعوں میں آج بھی جو ذہانت و قابلیت دکھائی دیتی ہے وہ امام جعفر صادقؑ کی تعلیمات کی برکت سے ہے۔[2]

امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں اٹھنے والی علمی تحریک کے چار مؤثر عوامل یہ ہیں:

(۱) پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف سے علم کی تشویق، قرآن کریم کی طرف سے علم و تعلم اور تفکر و تعقل کی ترغیب کو علمی تحریک کا بنیادی عامل قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۲) مختلف قوموں کے ایسے لوگ دنیائے اسلام میں وارد ہوئے جن کا تعلق فکر و علم سے تھا۔

(۳) علمی تحریک میں جس چیز نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ "عالمی اسلامی وطنیت" تھی۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام نے وطن پرستی یعنی مخصوص علاقوں کو اپنا وطن سمجھنے کے خلاف جہاد کیا ہے اور اسلامی وطن کا تصور اجاگر کیا ہے یعنی جہاں جہاں اسلام ہے وہ مسلمان کا وطن ہے۔

اسلامی تعلیمات کا یہ نتیجہ نکلا کہ نسلی اور علاقائی تعصبات کافی حد تک معدوم ہو گئے اور مختلف قومیتیں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگیں اور مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ اسلام کی وجہ سے دوسری اقوام سے گھل مل گئے اور وہ اخوت اسلامی پر فخر کرتے تھے۔ اس وجہ سے علمی تحریک کے لیے زمین ہموار ہوئی تھی اور یہ علمی تحریک کے لیے ایک مؤثر عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔

علمی تحریک کے لیے جو چیز شاید اس سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوئی اُسے آج "دینی تعصب کے

۱۔ سیری در سیرہ ائمہ اطہار ص ۱۴۸ ۔ ۱۵۴

۲۔ بیست گفتار ص ۱۷۸ ۔ ۱۸۴

خاتے" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سے غیر مسلم افراد بالخصوص اہل کتاب کے ساتھ زندگی بسر کرنا مراد ہے۔ اُس زمانے میں اہل کتاب پڑھے لکھے اور اہل علم ہوتے تھے۔ اہل کتاب اسلامی معاشرے میں وارد ہوئے، مسلمانوں نے اُن کا پرجوش خیر مقدم کیا اور اسی عصر اوّل میں اُن سے معلومات حاصل کیں اور دوسرے مرحلے پر مسلمانوں نے اہل کتاب کو اپنے علمی معاشرے کا سربراہ مقرر کیا اور اس سے بھی بلند ترین چیز شاید وہ ہے جو ہمیں احادیث میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے پاس اس حوالے سے کافی احادیث موجود ہیں جن میں سے اسلامی تعلیمات کی بہترین ترجمانی غالباً اس حدیث کے ذریعے کی گئی ہے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا: حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے، وہ جہاں بھی اسے پاتا ہے لے لیتا ہے اگرچہ ایک مشرک کے ہاتھ سے ہی کیوں نہ ہو۔

گویا امیر المومنین فرماتے ہیں کہ مومن جب علم کی امانت کو مشرک کے ہاتھ میں دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو اُس کا اصلی مالک تصور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ مشرک اس امانت کے لائق نہیں ہے، اس امانت کا اگر کوئی لائق ہے تو وہ میں ہوں۔

کچھ لوگوں نے مذہبی تنگ نظری کے خاتمے کا اعزاز زبردستی خلفاء کو دینے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ خلفاء کے سینے اتنے کشادہ تھے کہ اُن کے دربار میں مسلمان، عیسائی، یہودی اور مجوسی ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ نظر آتے تھے اور ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کرتے تھے۔" ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ" یہ خلفاء کے سینوں کی کشادگی نہیں تھی بلکہ یہ حضرت رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کا اثر تھا۔[1]

امام موسیٰ کاظمؑ کی حیاتِ مبارکہ

آپ کی ولادت ۷ صفر ۱۲۸ھ کو ابواء کے مقام پر ہوئی۔ آپ کو ۵۵ برس کی عمر میں ۲۵ رجب ۱۸۳ھ میں زہر سے شہید کیا گیا اور آپ کاظمین (نزد بغداد) میں سپردخاک کئے گئے۔ آپ نے ۳۵ برس تک امامت ورہبری کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔

آپ کے ہم عصر خلفاء یہ تھے:

(۱)	منصور دوانیقی	(۱۳۸ھ تا ۱۵۸ھ)
(۲)	مہدی عباسی	(۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ)
(۳	ہادی عباسی	(۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ)
(۴)	ہارون رشید	(۱۷۰ھ تا ۱۸۳ھ)

---

[1] سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۵۹ ـ ۱۶۲

حضرت آیت اللہ خامنہ ای فرماتے ہیں: افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے پاس امام موسیٰ کاظمؑ کی زندگی کے متعلق صحیح اور واضح معلومات نہیں ہیں لیکن کتب تاریخ و حدیث میں جو کچھ موجود ہے اس سے آپ کے اقدامات کی بنیادی نشاندہی ہوتی ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے کچھ اہداف یہ تھے:

(۱) اُس دور میں جو دینی و مذہبی انحرافات پیدا ہو رہے تھے اور ارباب باطل جن کی ترویج میں سرگرم تھے آپ نے اُن کا فکری محاذ پر مقابلہ کیا اور مذہب حقہ کی فکری اساس کو مضبوط کیا۔

(۲) اُس زمانے کی سیاسی حدود میں رہتے ہوئے اپنے والد بزرگوار کے علمی اور دینی امور کو جاری رکھنا۔

(۳) اپنے پیروکاروں کی رہنمائی کرنا اور حکومت میں شامل ہونے یا نہ ہونے کے متعلق اُن کی ذمے داریوں کا تعین کرنا۔

(۴) حکام سے مباحثہ کرنا جیسے قبر پیغمبرؐ کے کنارے آپ نے ہارون رشید جیسے مضبوط حکمران سے مباحثہ کیا اور اُس کے سامنے اپنے حق خلافت کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت خلافت کا مجھ سے زیادہ حق دار کوئی نہیں ہے۔

(۵) اُمت میں انقلابی شعور بیدار کرنا اور اُنھیں حسین بن علی بن حسن (صاحب واقعہ فخ) کے قیام میں شمولیت کی ترغیب دینا۔

واضح رہے کہ صاحب فخ کا واقعہ ذی الحجہ ۱۹۶ھ کو پیش آیا۔[۱]

معتبر اور مشہور ترین روایات کے مطابق آپ کو چار سال تک تنگ و تاریک زندانوں میں رکھا گیا۔[۲] اس دوران آپ کو مختلف زندانوں میں منتقل کیا جاتا رہا کیونکہ آپ کو جس زندان میں رکھا جاتا چند دنوں بعد وہاں کے تمام قیدی آپ کے مرید بن جاتے تھے۔

آپ کو سب سے پہلے بصرہ کے زندان میں بھیجا گیا۔ اُس وقت بصرہ کا گورنر عیسیٰ بن جعفر بن ابی جعفر منصور تھا یعنی منصور دوانیقی کا پوتا۔ امام کو اُس کی تحویل میں دیا گیا۔ عیسیٰ شراب کا رسیا اور رقص و سرود کا دلدادہ تھا۔ ایک بصری کے بقول عبادت گزار اور خدا شناس امام کو اُس کے پاس ایسی فضولیات سننے کے لیے لایا گیا تھا جو اُنھوں نے زندگی میں کبھی نہ سنی تھیں۔

۱۔ یاد ایام ج ۲، ص ۵۸ ۔ ۶۳

۲۔ آپ کی شہادت بھی زندان میں ہوئی تھی۔ زندان میں کئی بار آپ کو یہ پیشکش کی گئی کہ آپ صرف ایک مرتبہ خلیفہ سے معذرت کریں اور ایک بار اُس کے سامنے غلطی کا اعتراف کریں تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا لیکن آپ اس پر راضی نہ ہوئے۔ (یاد ایام ج ۲، ص ۱۷۲)

۷ رذی الحجہ ۱۷۸ھ کو امام کو بصرہ کے زندان میں لایا گیا۔ عید الاضحیٰ کے ایام تھے اور یہ دن حکام کے جشن کے دن تھے۔ امام کو (روحانی لحاظ سے) ایک بڑے مقام پر رکھا گیا۔ آپ کچھ عرصے تک اس زندان میں رہے۔ پھر آہستہ آہستہ حاکم بصرہ بھی آپ سے متاثر ہوا اور بالآخر آپ کا عقیدت مند ہوگیا۔ اس نے حکم دیا کہ امام کی رہائش کے لیے ایک اچھا کمرہ دیا جائے اور اُس نے سرکاری طور پر آپ کی پذیرائی شروع کردی۔

ہارون نے خفیہ پیغام بھیجا کہ اس قیدی کو قتل کردو۔ عیسیٰ بن جعفر نے جواب میں لکھا کہ میں یہ کام کبھی نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے کہا کہ آپ مجھ سے یہ قیدی واپس لے لیں ورنہ میں اسے آزاد کردوں گا۔ میں ایک عظیم انسان کو اپنے پاس قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتا۔ عیسیٰ بن جعفر خلیفہ کا چچا زاد تھا اور ابوجعفر منصور کا پوتا تھا لہٰذا اُس کی بات کو نہیں ٹالا جاسکتا تھا۔

امام مختلف زندانوں میں

امام کو بغداد لایا گیا اور فضل بن ربیع کی تحویل میں دیا گیا۔ فضل کا باپ ربیع منصور دوانیقی کا مشہور حاجب (دربان) تھا۔[1] کچھ عرصے بعد وہ بھی امام کا عقیدت مند ہوگیا۔ اُس نے امام پر سختی کرنا چھوڑ دیا اور امام کے ساتھ بہتر سلوک شروع کردیا۔ جاسوسوں نے ہارون کو خبر دی کہ موسیٰ بن جعفرؑ، فضل بن ربیع کے زندان میں آرام سے رہ رہے ہیں اور وہ قیدی کی بجائے مہمان کی حیثیت سے فضل کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ ہارون نے اُس کی تحویل سے امام کو نکال کر فضل بن یحییٰ برمکی کی تحویل میں دیدیا۔ فضل بن یحییٰ نے بھی کچھ عرصے بعد آپ سے بہت عمدہ سلوک شروع کردیا۔ ہارون کو پتا چلا تو اُسے سخت غصہ آیا۔ اُس نے جاسوسوں کے ذریعے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ فضل بن یحییٰ امام سے بہت عزت سے پیش آتا ہے۔ چنانچہ ہارون نے امام کو اُس کی تحویل سے لے لیا اور فضل بن یحییٰ کو بہت برا بھلا کہا۔

ہارون کی امام سے درخواست

امام کی زندگی کا آخری ہفتہ تھا کہ ہارون رشید نے یحییٰ برمکی کو اپنے پاس بلایا اور اُس سے بڑے نرم لہجے میں کہا کہ تم موسیٰ بن جعفرؑ کے پاس زندان میں جاؤ اور میری طرف سے اُنھیں یہ پیغام دو کہ آپ کا ابن عم آپ کو سلام کہتا ہے اور کہتا ہے کہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ آپ بالکل بے گناہ ہیں اور آپ سے کوئی

۱۔ ربیع عباسی خلفاء کا دربان تھا۔ پہلے میں یہ منصور دوانیقی کا دربان تھا۔ منصور کے بعد بھی یہ دربار سے وابستہ رہا۔ پھر ہارون کے دورِ حکومت میں اس کا بیٹا فضل دربان مقرر ہوا تھا۔ عباسی خلفاء کی اصطلاح میں باپ بیٹے کا شمار خصیصین میں ہوتا تھا اور یہ انتہائی قابلِ اعتماد افراد کے لیے بولا جاتا تھا۔

قصور نہیں ہوا لیکن میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک آپ غلطی کا اعتراف کر کے مجھ سے معافی نہیں مانگیں گے میں آپ کو رہا نہیں کروں گا۔

امام موسیٰ کاظمؑ نے جب یحییٰ کی زبانی یہ پیشکش سنی تو فرمایا کہ تم میری طرف سے ہارون سے کہہ دو: ''اب میری زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں۔''[1]

آپ کے اس جواب کے ایک ہفتے بعد ہارون کے حکم سے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

امام کو قید کیوں کیا گیا تھا؟

سوال یہ ہے کہ ہارون رشید نے امام کو قید کیوں کیا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امام کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے حسد کرتا تھا اور آپ کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اگرچہ امام اُس کے خلاف کوئی تحریک چلانے کے حق میں نہیں تھے مگر وہ سمجھتا تھا کہ امام ''معنوی اور عقیدتی انقلاب'' برپا کر چکے ہیں۔

جب ہارون نے اپنے بیٹے امین کی اور اُس کے بعد مامون کی اور اُس کے بعد مؤتمن کی ولی عہدی کا سرکاری اعلان کرنا چاہا تو مشہور علماء اور معززین کو مکہ آنے کی دعوت دی اور کہا مکہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جائے گا اور اس میں امین کے لیے بیعت لی جائے گی۔

ہارون نے یہ پروگرام بنانے کے بعد سوچا کہ کیا اس وقت دنیائے اسلام میں کوئی ایسی شخصیت موجود ہے جس کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھتی ہوں اور جسے لوگ خلیفہ دیکھنا چاہتے ہوں؟ اور اگر ایسی کوئی شخصیت ہے تو وہ کون ہے؟

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اُس کے ضمیر نے اُسے جواب دیا ہاں! ایسی شخصیت موسیٰؑ بن جعفرؑ کی ہے (مقصد یہ کہ ہارون آپ کو متوقع خطرہ سمجھتا تھا)۔

ہارون مدینہ آتا ہے۔ امام کو گرفتار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اُس وقت اتفاق سے امام گھر پر نہیں تھے۔ آپ مسجد نبویؐ میں مصروف عبادت تھے۔ حکومتی کارندے آئے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں لیکن اُنھوں نے نماز مکمل کرنے کی اجازت نہ دی۔ حالت نماز میں ہی آپ کو گرفتار کر کے مسجد سے باہر لایا گیا۔ اُس وقت آپ نے قبر رسولؐ کی طرف دیکھا اور فرمایا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا جَدَّاه اے اللہ کے رسول! آپ پر سلام ہو، اے نانا جان! آپ پر سلام ہو۔ دیکھئے آپ کی امت آپ کی اولاد سے کیسا سلوک کر رہی ہے؟![2]

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۸۸ ۔ ۱۹۰

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۷۲ ۔ ۱۸۳

امام کا معنوی نفوذ

ائمہ اطہارؑ کے پاس تلوار تھی اور نہ ہی انھیں اظہار رائے کی آزادی تھی لیکن خدا نے لوگوں کے دلوں میں اُن کے لیے بے پناہ عقیدت ودیعت کر رکھی تھی۔ ہارون کی حکومت کے اندر بھی امام موسیٰ کاظمؑ کے عقیدت مند موجود تھے۔ علی بن یقطین ہارون کا وزیر ہے اور ہارون کے بعد اُسی کا نمبر آتا ہے۔ ہارون کا یہ معتمد خاص علی بن یقطین شیعہ ہے لیکن وہ اپنے مذہب کو ظاہر نہیں کرتا اور حکومت میں رہ کر موسیٰؑ بن جعفرؑ کے احکامات کا خصوصی خیال رکھتا ہے[1] جبکہ ظاہری طور پر وہ ہارون کے ساتھ ہے۔ حاسدین نے دو تین مرتبہ ہارون سے شکایت کی کہ علی بن یقطین شیعہ ہے لیکن امام موسیٰ کاظمؑ نے امامت کی مخصوص پیش بینی کے ذریعے اُسے ہر بار حاکم کے شر سے بچا لیا تھا۔[2]

الغرض ہارون کی حکومت میں ایسے لوگ موجود تھے جو امام کے والا و شیفتہ تھے لیکن وہ حکومت کے خوف سے آپ سے کھلم کھلا رابطہ نہیں کرتے تھے۔

اہواز کے ایک ایرانی شیعہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مجھ پر ظالمانہ ٹیکس لگایا گیا۔ رقم اتنی زیادہ تھی کہ میں ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اتفاقاً اہواز کا عامل معزول ہوگیا اور اُس کی جگہ نیا عامل آیا۔ مجھے دن رات یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر نئے حاکم نے ٹیکس کے حسابات کا رجسٹر دیکھ لیا تو وہ یقیناً مجھ سے ٹیکس کا مطالبہ کرے گا جسے میں ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ حاکم اہواز اندر سے شیعہ ہے۔ مجھے اُس بات پر یقین نہ آیا اس لیے میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس مدینہ چلا جاؤں، میں مدینہ پہنچا اور امام کو سلام کیا اور اُن سے عرض کیا کہ حاکم اہواز آپ کا عقیدت مند ہے اور میں حکومت کا مقروض ہوں۔ آپ اُس سے میری سفارش کردیں۔

امام نے ایک رقعہ لکھا جو کہ دو تین جملوں سے زیادہ نہیں تھا۔ میں آپ کا رقعہ لے کر اہواز آیا۔ ایک رات حاکم اہواز کے گھر گیا اور دربان سے کہا کہ حاکم سے کہو کہ موسیٰ بن جعفرؑ کی طرف سے ایک شخص آیا ہے اور اُس کے پاس موسیٰؑ بن جعفرؑ کا تمہارے نام ایک خط بھی ہے۔ جیسے ہی دربان نے اُسے پیغام پہنچایا وہ باہر آیا اور مجھ سے سلام دعا کی۔ مجھ سے خط لیا، خط کو بوسہ دیا۔ پھر میرے چہرے اور میری آنکھوں پر بوسے دیے اور مجھے گھر کے اندر لے گیا اور میرے سامنے یوں مؤدب بیٹھا جیسے ایک مہذب بچہ کسی بزرگ کے سامنے بیٹھتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ مالیات کے کارندوں نے مجھ پر اتنا ظالمانہ ٹیکس لگا دیا ہے کہ اگر میں اُسے ادا کروں تو قلاش ہو جاؤں گا۔

۱۔ شیخ طوسی، اختیار معرفۃ الرجال، تحقیق حسن مصطفوی ص ۴۳۳

۲۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۲۵ ـ ۲۲۹

اُس نے حکم دیا کہ ٹیکس کے تمام رجسٹر اُس کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اُس نے تمام رجسٹر کھول کر میرے نام کاٹ دیئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام نے اپنے خط میں یہ جملہ لکھا تھا کہ جو ایک مومن کو خوش کرے گا خدا اُسے بے شمار جزا عطا کرے گا۔ پھر حاکم اہواز نے مجھ سے کہا کہ میرے پاس جتنا مال ہے اس میں سے آدھا مال میں تمھیں دیتا ہوں۔ چنانچہ میں خوشی خوشی باہر آیا۔ پھر جب مدینہ گیا اور امام کی خدمت میں سارا ماجرا بیان کیا تو آپ مسکرائے اور بہت خوش ہوئے۔

ہارون امام موسیٰ کاظمؑ سے کیوں ڈرتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جاذبہ حقیقت سے خوفزدہ تھا۔ کُونوا دُعاۃً لِلنّاسِ بِغَیْرِ اَلْسِنَتِکُمْ (منہ سے کچھ کہے بغیر اپنے عمل سے لوگوں کو دعوت دو)۔[۱] ساری تبلیغ کا تعلق زبان سے نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زبانی تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔

جس کسی کا امام موسیٰ کاظمؑ، اُن کے آباء و اجداد یا اُن کی اولاد طاہرین میں سے کسی سے واسطہ پڑا اور کچھ دن اُن کے ساتھ بسر کرنے کا موقع ملا اُسے ان ذوات طاہرہ میں موجود حق دکھائی دیتا تھا اور اُسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگتی تھی کہ واقعاً یہ ہستیاں وہ ہیں جنھیں خدا کی صحیح شناخت حاصل ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ واقعی خدا کے عاشق ہیں اور ان کا ہر قول و فعل، خدا اور حق کے لیے ہے۔[۲]

امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کے اسباب

آپ کی شہادت کے اسباب یوں بیان کیے جاسکتے ہیں:

(۱) آپ کا وجود اور آپ کی شخصیت اتنی جاذب تھی کہ خلفاء آپ کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔

(۲) آپ تبلیغ کرتے اور مسائل بیان کرتے تھے اور تقیہ بھی کرتے تھے یعنی اس طرح عمل کرتے تھے کہ تاحد امکان اس کا ماخذ بھی ہاتھوں سے نہ جانے پائے۔

(۳) امام موسیٰ کاظمؑ کی روح ایک عجیب مقاومت کرنے والی روح تھی۔ جب یحییٰ نے یہ پیغام پہنچایا کہ آپ صرف زبان سے رسمی طور پر ہی معذرت کرلیں تو آپ نے جواب میں فرمایا: اب میری زندگی ہی ختم ہونے کو ہے۔[۳]

۱۔ اصول کافی، باب صدق اور باب ورع

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۸۰ ـ ۱۸۳ ـ ص ۱۸۴ ـ ۱۸۸ ـ داستان راستان، شمارہ ۳۴، ص ۱۳۴، شمارہ ۸۰، ص ۲۳۷ ـ ۲۳۹

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۸۸

شہادت کی کیفیت

امام کی آخری قید سندی بن شاہک کا زندان تھا۔ میں نے کسی زمانے میں پڑھا تھا کہ یہ شخص مسلمان نہیں تھا، غیر مسلم تھا۔ یہ اُن لوگوں میں سے تھا جو حکمرانوں کے حکم کی فوری تعمیل کرتے ہیں۔ امام کو اندھیرے زندان میں رکھا گیا تھا۔ بعدازاں ہارون نے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ امام طبعی طور پر رحلت پا گئے ہیں (انھیں کسی نے قتل نہیں کیا)۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ یحییٰ برکی چاہتا تھا کہ ہارون اُس کے بیٹے فضل سے راضی ہو جائے اسی لیے اُس نے ہارون سے وعدہ کیا کہ جس کام کو انجام دینے سے دوسرے لوگ ڈر رہے ہیں میں وہ کام اپنے ہاتھوں سے انجام دوں گا۔ پھر اُس نے داروغہ زندان سندی کو بلایا اور اُسے امام کو شہید کرنے کا حکم دیا اور سندی نے حامی بھر لی۔

یحییٰ خطرناک زہر لے آیا اور سندی کے حوالے کیا۔ اس زہر کو ایک خاص انداز سے کھجوروں میں رکھا گیا اور وہ کھجوریں امام کو کھلائی گئیں۔ اس کے فوراً بعد شہر کے علماء اور قاضیوں کو بلایا گیا۔ (مؤرخین نے لکھا ہے کہ عدول المومنین کو بلایا گیا) اور امام کو اُن لوگوں کے سامنے لایا گیا۔ پھر ہارون کہنے لگا:

لوگو! ہمیں بدنام کرنے کے لیے لوگ کہہ رہے ہیں کہ موسیٰ بن جعفرؑ پر زندان میں بہت سختی کی جا رہی ہے اور اُن کے ساتھ برا سلوک کیا جا رہا ہے۔لوگو! تم خود دیکھ لو۔ یہ بالکل صحت مند ہیں۔

ہارون کی گفتگو جیسے ہی ختم ہوئی امام نے فرمایا: ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ اب میں دو تین دن کا مہمان ہوں۔''

آپ نے ہارون کے جھوٹ کو بے نقاب کردیا۔ اسی لیے امام کا جنازہ بغداد کے پل پر رکھا گیا تاکہ لوگ آئیں اور دیکھیں کہ قیدی طبعی موت مرا ہے۔ امام کے جسد اطہر کو دو تین دن تک پل پر رکھا گیا۔

مؤرخین نے ایک دل سوز واقعہ لکھا ہے کہ امام کے کچھ ایرانی شیعہ بغداد آئے۔ اُنھیں بڑی آرزو تھی کہ بغداد پہنچ کر اپنے قیدی امام کی زیارت کا شرف حاصل کریں۔ اُنھوں نے قید خانے کے عملے کے سامنے اپنی درخواست پیش کی۔ اُن کی درخواست قبول کر لی گئی اور وہ ملاقات کے لیے زندان کے دروازے پر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں دروازہ کھلا۔ اُنھوں نے دیکھا چار مزدوروں نے ایک جنازہ اٹھایا ہوا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ یہ تمہارا امام ہے۔[1]

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۹۰ ۔ ۱۹۲

امام علیؑ رضاؑ سے امام عصرؑ تک ائمہ کی حیاتِ مبارکہ

امام علی رضاؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام علی بن موسیٰ الرضاؑ ۱۱ ذی قعدہ ۱۴۸ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۳۰ صفر ۲۰۳ھ میں مامون کے زہر سے شہادت پائی۔ آپ نے ۵۵ برس کی زندگی پائی اور بیس[1] برس تک منصب امامت و رہبری کے فرائض سرانجام دیئے۔[2]

ہماری یہ بحث ایک تاریخی واقعے کے بارے میں ہے جس کا تعلق امامت و خلافت سے مربوط مسائل کی فروعات یعنی امام علی رضاؑ کی ولی عہدی سے ہے۔ واقعات سے قطع نظر ہمیں تاریخی طور پر یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ امام نے کن حالات اور کس شکل میں یہ عہدہ قبول کیا تھا؟

بنی عباس کا اولادِ علیؑ سے سلوک

مامون خلافت عباسی کا وارث ہے اور عباسیوں نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی علویوں کے خلاف کارروائی شروع کردی تھی اور وہ اولاد علیؑ کو قتل کرتے تھے۔ بنی اُمیہ نے اولاد علیؑ پر بے پناہ مظالم ڈھائے تھے لیکن اگر بنی عباس کے مظالم کو جمع کیا جائے تو وہ کسی طرح بھی بنی اُمیہ کے مظالم سے کم نہیں ہیں البتہ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے مظالم میں اگر فرق ہے تو صرف واقعۂ کربلا ہے۔ واقعۂ کربلا کی وجہ سے بنی اُمیہ کے مظالم کا پلڑا بھاری ہوگیا تھا۔ اگر واقعۂ کربلا کے علاوہ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے مظالم کا موازنہ کیا جائے تو بنی عباس کے مظالم کا پلڑا وزنی دکھائی دے گا۔

۱۔ آپ نے ہارون کے عہد حکومت میں ۱۰ سال، پھر امین عہد میں پانچ سال اور عبداللہ مامون کے عہد میں پانچ سال امامت کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔

۲۔ شیخ کلینی، کافی ج ۱، ص ۴۸۶۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۷۱

منصور[1] نے جو دوسرا عباسی خلیفہ تھا اولادِ علیؑ کو بے دریغ قتل کیا تھا۔ اگر ہم منصور کے مظالم کو شمار کریں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ منصور کے بعد جو بھی عباسی خلیفہ برسرِ اقتدار آیا اُس نے منصور کی پالیسی کو جاری رکھا۔ ہارون اور مامون کے عہدِ خلافت میں سات آٹھ علوی سادات نے قیام کیا تھا۔ بنی عباس نے اپنی خلافت کے تحفظ کے لیے اُنھیں قتل کر دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ اگر کسی عباسی کے متعلق بھی اُنھیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کے خلاف قیام کا ارادہ رکھتا ہے تو اُسے بھی فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

ابو مسلم جس کی کوششوں سے بنی عباس برسرِ اقتدار آئے تھے اور جس نے بنی عباس کو اقتدار دلانے کی خاطر لاکھوں انسانوں کو قتل کیا تھا جب بنی عباس کے خلیفہ کو اُس سے معمولی سا خطرہ محسوس ہوا تو اُس نے اُسے بھی معاف نہ کیا اور اپنے آدمیوں کے ذریعے قتل کرا دیا۔

ہارون اور برامکہ کا اتحاد مثالی[2] سمجھا جاتا تھا۔ برامکہ خاندان نے ہارون کے لیے بہت کچھ کیا تھا لیکن انجام کیا ہوا۔ ایک چھوٹی سی سیاسی غلطی کی وجہ سے ہارون نے خاندان برامکہ کو نشانِ عبرت بنا دیا۔

علاوہ ازیں یہ بھی دیکھیں کہ مامون نے اپنے بھائی امین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اقتدار کے لیے دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی۔ آخرکار ۱۹۸ھ میں مامون کو کامیابی ملی اور اُس نے اپنے بھائی امین کو بے دردی سے قتل کرایا دیا۔[3]

(بنی عباس کے یہ تمام کرتوت تاریخ میں محفوظ ہیں) یہ بات آج تک تاریخی معمہ ہے کہ اپنے بھائی پر رحم نہ کرنے والا مامون اس بات پر تیار ہو جاتا ہے کہ امام علی رضاؑ مدینہ سے مرو تشریف لائے اور اُس کی ولی عہدی قبول کریں۔[4]

امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کا مسئلہ اور تاریخ کے بیانات

ہم شیعوں کے نقطۂ نظر سے اس واقعے کے اَسرار بہت روشن ہیں۔ شیعہ کتبِ تاریخ کے استناد سے قبل ہم کتبِ اہلِ سنت کو اپنا ماخذ بنانا چاہتے ہیں۔

۱۔ عبداللہ بن ابوجعفر المعروف منصور دوانیقی بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب دوسرا عباسی خلیفہ تھا۔ ۱۳۶ھ میں خلیفہ بنا اور ۲۲ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵۸ھ میں مر گیا۔ منصور کا دورِ حکومت اسلامی تاریخ کا ایک پُرآشوب دور ہے۔

۲۔ میں یہاں قوم پرست ایرانیوں کی طرح سے برامکہ کا دفاع نہیں کروں گا اور انھیں صرف ایرانی ہونے کی وجہ سے لائقِ تحسین قرار نہیں دوں گا۔ برامکہ اور ہارون کے طرزِ فکر میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا تھا۔

۳۔ ابن اثیر، تاریخ کامل ج ۶، ص ۲۸۷

۴۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۹۳ ـ ۱۹۸

مشہور اہل سنت مولف ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتاب مقاتل الطالبین میں اولاد ابو طالبؑ کے قیام اور اُن کی شہادتوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ اُس نے اپنی بحث کو صرف علویوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام اولاد ابو طالبؑ کی تاریخ پر بحث کی ہے۔ اُس نے اپنی کتاب میں دس صفحات امام علی رضاؑ کے لیے مخصوص کئے ہیں اور آپ کی ولی عہدی کے حالات کو بھی نقل کیا ہے۔ جب ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور علمائے شیعہ کی مرتب کردہ تاریخ سے اس کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں دونوں کے بیانات بہت قریب دکھائی دیتے ہیں لہٰذا اس مسئلے میں ہمارا ماخذ صرف علمائے شیعہ کی مرتب کردہ تاریخ تک محدود نہیں ہے۔

مامون کے اقدام کا محرک

وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے مامون[1] نے امام علی رضاؑ کو ولی عہد بنایا اور کیا مامون واقعی یہی چاہتا تھا کہ وہ حکومت کے تمام معاملات امام علی رضاؑ کے سپرد کردے اور اس کی موت یا قتل کے بعد حکومت خاندان علیؑ میں منتقل ہوجائے؟ اگر مامون یہی چاہتا تھا تو کیا آخر دم[2] تک اسی فیصلے پر ثابت قدم رہا تھا؟ یا بعد میں وہ اپنے فیصلے پر پشیمان ہوا تھا؟[3]

پہلا احتمال

اس احتمال کے مطابق دو مفروضے قائم کئے جاسکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ مامون آخر وقت تک اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اس صورت میں ہمیں امام علی رضاؑ کو اُس کی طرف سے زہر کھلائے جانے کا انکار کرنا پڑے گا اور اُن لوگوں کی بات ماننا پڑے گی جو کہتے ہیں کہ امام علی رضاؑ کا انتقال طبعی طور پر ہوا تھا۔

۱۔ امام علی رضاؑ کو ولی عہد مقرر کرنے کے پیچھے مامون کے درج ذیل مقاصد تھے:

(۱) وہ حکومت مخالف تحریکوں کا خطرہ کم کرنا چاہتا تھا۔

(۲) وہ اس شیعہ نظریے کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا کہ بنی اُمیہ اور بنی عباس غاصب ہیں۔ (وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ اگر ہماری حکومت غاصب ہوتی تو امام علی رضاؑ ولی عہدی کیوں قبول کرتے؟)

(۳) امام اسلامی تحریکوں کے روح رواں تھے اور وہ اس روح مبارزہ کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتا تھا۔

(۴) وہ آپ کے ذریعے عزت اور معنوی وجاہت بڑھانا چاہتا تھا۔

(۵) وہ چاہتا تھا کہ امام اُس کے عہد خلافت کے تمام کاموں اور غلط پالیسیوں کی توجیہ پیش کرتے رہیں گے۔

(دوسری امام علی رضاؑ عالمی کانفرنس میں آیت اللہ خامنہ ای کے پڑھے جانے والے مقالے سے اقتباس)

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۰۳

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۹۸۔ ۲۰۰

شیعہ علماء اس بات کو نہیں مانتے کہ مامون شروع سے آخر تک حسن نیت پر باقی رہا۔[1] حالات و واقعات سے بھی اس مفروضے کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر مامون کی طرف سے ولی عہدی کی پیشکش حسن نیت اور خلوص پر مبنی ہوتی تو امام علی رضاؑ کی طرف سے وہ ردعمل سامنے نہ آتا جس کا آپ نے اظہار کیا تھا۔

اس واقعے کے متعلق دوسرا مفروضہ وہ ہے جسے شیخ مفید اور شیخ صدوق نے قبول کیا ہے اور یہ ناممکن بھی نہیں کہ مامون نے ابتدا میں تو خلوص سے امام علی رضاؑ کو ولی عہدی کی پیشکش کی تھی لیکن بعد میں وہ پشیمان ہوگیا تھا۔ شیخ صدوق کے علاوہ کچھ دوسرے علماء اس توجیہ کے قائل ہیں۔[2]

یہ علماء فرماتے ہیں کہ امام علی رضاؑ ولی عہدی پر اس لئے راضی نہیں تھے کہ آپ جانتے تھے یہ وقتی جذبات کی وجہ سے ولی عہدی کی پیشکش کر رہا ہے۔ اس کے یہ جذبات بہت جلد ٹھنڈے پڑ جائیں گے اور یہ بعد میں سخت پشیمان ہوگا۔

واضح رہے کہ شیعہ علماء کی اکثریت شیخ صدوق اور اس نظریے کے علماء کی رائے سے متفق نہیں ہے۔ شیعہ علماء کی اکثریت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ مامون پہلے دن سے ہی حسن نیت نہیں رکھتا تھا۔ اُس کی یہ پیشکش ایک سیاسی چال تھی۔ ہماری روایات میں موجود ہے کہ امام نے مامون سے فرمایا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ تو ولی عہدی کے ذریعے مجھے خراب کرنا چاہتا ہے۔[3]

دوسرا احتمال

اس سلسلے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ مامون نے پہلے ایسا سوچا بھی نہ ہو بلکہ ولی عہدی کا مسئلہ مامون کے وزیر فضل بن سہل ذوالریاستین کے ذہن کی پیداوار ہو...[4] اس فرض کی بنا پر ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ فضل

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۱۷۶ ۔ ۱۷۷، ۲۰۰ ۔ ۲۰۱، ۲۰۳

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۰۲ ۔ ۲۰۳

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۲۸ ۔ ۲۲۹

۴۔ فضل بن سہل مامون کا وزیر تھا۔ یہ دو بھائی تھے۔ ایک حسن بن سہل اور دوسرا فضل بن سہل تھا۔ یہ دونوں خالص ایرانی مجوسی الاصل تھے۔ فضل بن سہل انتہائی زیرک، ذہین اور تعلیم یافتہ تھا۔ اُسے علم نجوم پر خاص عبور حاصل تھا۔ وہ برامکہ کے پاس گیا اور اُن کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا (بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اُن کا باپ مسلمان تھا اور بعض نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لوگ مجوسی تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے)۔ بعدازاں اُس کے اقبال کا ستارہ چمکا تو وہ مامون کا وزیر بن گیا اور اُس کے پاس بیک وقت وزارت اور فوج کے سپہ سالار کا منصب تھا۔ اسی لیے اسے ذوالریاستین (یعنی دو عہدے رکھنے والا) کہا جاتا تھا۔

مامون کے لشکر میں ایرانی اکثریت میں تھے (عرب بہت کم تھے)۔ مامون کا مرکز خراسان تھا اور اس دوران اُس کی اپنے

نے امام علی رضاؑ کو مامون کا ولی عہد بنانے کا پروگرام کیوں بنایا تھا؟ کیا فضل شیعہ تھا؟ کیا اُس نے یہ کام امام کی امامت کے عقیدے کی وجہ سے کیا تھا؟ یا اس کے کچھ اور مقاصد تھے؟

فضل کے متعلق ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سابقہ آبائی عقائد پر قائم تھا یعنی اب بھی مجوسی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس اقدام کے ذریعے بنی عباس سے خلافت کا جلد خاتمہ کردے۔ دراصل اس طرح وہ خلافت کی اساس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔[1]

جرجی زیدان اور ایڈورڈ براؤن جیسے افراد کہتے ہیں کہ فضل بن سہل شیعہ تھا حالانکہ یہ احتمال انتہائی کمزور ہے۔ جرجی زیدان اور اُس کے ہم فکر افراد کہتے ہیں کہ فضل، امام علی رضاؑ سے مخلص تھا اور وہ خلافت کو خاندان بنی عباس سے نکال کر خاندان علیؑ میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔[2] لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تاریخی واقعات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ روایات اور بالخصوص شیعہ تواریخ میں اس طرح کی روایات عام ہیں کہ امام علی رضاؑ مامون کے اتنے مخالف نہیں تھے جتنے فضل کے مخالف تھے۔[3] لہذا یہ کہنا کہ امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کی تجویز فضل کی تھی، انتہائی مشکوک اور ناقابل یقین ہے اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تجویز فضل نے پیش کی تھی اور وہ شیعہ تھا تو یہ پہلے فرض سے بھی زیادہ مشکوک اور ناقابل یقین ہے۔

البتہ جس چیز کا زیادہ احتمال ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ فضل بن سہل تو مسلم تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح ایران میں قبل از اسلام کا نظام لوٹا دے۔[4] وہ بیرونی طور پر بنی عباس کے لیے مشکلات پیدا کرنا چاہتا تھا اور اندرونی طور پر ایران کو زرتشتی سلطنت میں تبدیل کرنے کا خواہش مند تھا۔

اگر اس مفروضے کو صحیح مان لیا جائے تو اس صورت میں امام علی رضاؑ کا شرعی فریضہ یہ بنتا ہے کہ آپ مامون سے تعاون کریں تاکہ بڑے خطرے کو دور کیا جاسکے۔

ہماری روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام مامون سے کہیں زیادہ فضل سے نفرت کرتے تھے اور جب کسی بات میں مامون اور فضل کے درمیان اختلاف ہوتا تو آپ مامون کی حمایت کرتے تھے۔[5]

بھائی امین کے لشکر سے جنگ ہوئی۔ عرب امین کے طرف دار تھے جبکہ ایرانی بالخصوص خراسانی مامون کے طرف دار تھے۔ مامون کی ماں ایرانی النسل تھی۔ چنانچہ مسعودی نے مروج الذہب اور التنبیہ والاشراف میں اور دیگر مورخین نے بھی لکھا ہے کہ مامون کی ماں ایک بادغیسی عورت تھی۔ فضل نے مامون کے دور میں اتنی ترقی کی کہ مامون کی حیثیت اُس کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی سی ہوگئی۔

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۰۳ ۔ ۲۰۶

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۲۳ ۔ ۲۲۴

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۰۶

۴۔ ان میں سے کوئی بات بھی قطعی نہیں ہے۔ یہ سب تاریخ کے شبہات ہیں البتہ کچھ روایات میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۲۵ ۔ ۲۲۶

احتمال سوم

اس احتمال کے مطابق حسب ذیل تین مفروضے تصور کیے جا سکتے ہیں:

(الف) اہل ایران کی حمایت حاصل کرنا

احتمال یہ ہے کہ ولی عہدی کا معاملہ خود مامون کی اپنی سوچ تھی البتہ مامون اس حوالے سے مخلص ہرگز نہیں تھا۔ یہ صرف اُس کی سیاسی چال تھی۔

آیئے دیکھیں وہ سیاسی تقاضے کیا تھے جن کی وجہ سے مامون نے یہ اقدام کیا تھا؟

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح مامون اہل ایران کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اہل ایران تشیع کی طرف میلان رکھتے تھے اور اُنھیں اولادِ علیؑ سے خصوصی عقیدت تھی۔

علاوہ ازیں بنی عباس نے الرضا (یا الرضی) من آلِ محمد کا نعرہ لگا کر بنی اُمیہ سے اقتدار چھینا تھا۔ اس معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ امام علی رضاؑ عمر میں مامون سے کم از کم بیس سال بڑے تھے۔

(ب) علویوں کی مسلح تحریکوں کو دبانا

کچھ تجزیہ نگار (مامون کے اس اقدام کی) وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امام کو ولی عہد بنانے کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ علویوں کی مسلح جدوجہد کو ختم کیا جا سکے۔ اُس دور میں علوی ایک مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ وہ چند سالوں بعد یا ہر سال چند بار حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے اور جب بھی ملک کے کسی حصے میں شورش پیدا ہوتی تو اُس کے پیچھے کوئی نہ کوئی علوی دکھائی دیتا تھا۔[1]

مامون نے علویوں کو خاموش کرنے اور اُنھیں پرسکون رکھنے کے لیے امام علی رضاؑ کو ولی عہد نامزد تھا۔ مامون نے علویوں کو مطمئن کرنے کے لیے حکومت کے خلاف قیام کرنے والے بہت سے افراد کو معاف کر دیا تھا ایسے ہی مجرموں میں امام علی رضاؑ کے بھائی زید النار بھی شامل تھے۔

۱۔ علویوں کی چند تحریکیں درج ذیل ہیں:

(۱) کوفہ میں ابو السرایا کا قیام

(۲) بصرہ میں زید النار کا قیام

(۳) مکہ اور حجاز کے نواح میں محمد بن جعفر دیباج کا قیام

(۴) یمن میں ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر کا قیام

(۵) مدینہ میں محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن کا قیام

(۶) جعفر بن زید بن علی اور حسین بن ابراہیم بن علی کا واسط میں قیام

(۷) محمد بن اسماعیل بن محمد کا مدائن میں قیام (مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۳۸۶۔۳۸۷)

(ج) امام علی رضا علیہ السلام کو نہتا کرنا

مامون کی اس سیاست کا ایک مقصد خود امام علی رضا کو نہتا کرنا بھی تھا۔ ہماری روایات میں ہے کہ امام نے مامون سے فرمایا تھا: "تیرا مقصد یہی ہے۔"

مامون امام کو اس لیے بھی ولی عہد بنانا چاہتا تھا تا کہ لوگ یہ کہیں کہ امام کے ولی عہد بن جانے کے باوجود حالات بہتر نہیں ہوئے یا یوں کہیں کہ جب تک اولادِ علیؑ کے پاس اقتدار نہیں ہوتا وہ واویلا کرتے رہتے ہیں اور جب اُن کے پاس اقتدار آ جاتا ہے تو چپ سادھ لیتے ہیں۔ مامون کے اس اقدام کا اصلی مقصد تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ کیا یہ مامون کا ذاتی منصوبہ تھا؟ یا فضل نے یہ منصوبہ تشکیل دیا تھا؟ اگر یہ منصوبہ فضل بنایا تھا تو اُس کا مقصد کیا تھا اور اگر یہ منصوبہ مامون کا تھا تو کیا یہ حسن نیت پر مبنی تھا یا یہ کوئی سیاسی چال تھی؟ اگر اُس کی یہ تجویز شروع سے حسن نیت پر مبنی تھی تو کیا آخر تک یہ جذبہ قائم رہا تھا یا یہ جذبہ ماند پڑ گیا تھا؟ اور اگر اُس کا اقدام حسن نیت پر مبنی نہیں تھا تو اس کا سیاسی مقصد کیا تھا؟ تاریخی طور پر ان امور کے متعلق آج بھی شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔[1]

مفروضوں کی تحقیق

مذکورہ بالا مفروضوں میں سے اگر اس مفروضے کو صحیح مان لیا جائے کہ فضل شیعہ تھا اور ولی عہدی کی تجویز کے پیچھے اُس کا ہاتھ تھا تو اس صورت میں امام علی رضاؑ کا شرعی وظیفہ یہ بن جائے گا کہ آپ کو اس اقدام کی مکمل کر تائید کرنی چاہیے تھی۔

اس مفروضے کے مطابق امام علی رضاؑ پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے ولی عہدی کا عہدہ کیوں قبول کیا تھا؟ بلکہ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اتنی اچھی پیشکش قبول کرنے میں پس و پیش سے کام کیوں لیا تھا؟

اب ہم شیعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک غیر جانبدار مبصر اور تجزیہ کار کی نظر سے ان واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

امام علی رضاؑ یا تو دین دار تھے یا دنیا دار تھے۔ اگر آپ دین دار تھے تو جب آپ نے دیکھا کہ فضل کے ذریعے عباسیوں کی موروثی حکومت علویوں کو منتقل ہو رہی ہے تو اس صورت میں آپ کو اس سے تعاون کرنا چاہیے تھا اور اگر آپ کو دنیا دار تصور کرلیا جائے تب بھی آپ کو تعاون کرنا چاہیے تھا جبکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۰۷ ۔ ۲۱۰

کہ امام نے اُن سے کوئی تعاون نہیں کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نہ تو فضل کا اقدام تھا اور نہ ہی وہ شیعہ تھا لہٰذا یہ مفروضہ ہی واضح طور پر باطل ہے۔ اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ ولی عہدی کی تجویز فضل کی تھی اور وہ اس کے ذریعے اسلام کو ختم کرنا چاہتا تھا تو اس صورت میں امام کا اقدام سو فیصد درست متصور ہوگا کیونکہ آپ نے دو برائیوں میں سے نسبتاً چھوٹی برائی کا انتخاب کیا تھا اور مامون کے ساتھ تعاون اُس وقت کے معروضی حالات کے مطابق چھوٹی برائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ نے مامون سے کم سے کم سطح تعاون کیا تھا۔

اس مسئلے میں اشکال اُس وقت زیادہ پیدا ہوتا ہے جب ہم یہ کہیں کہ ولی عہدی کی تجویز خود مامون کی اپنی تھی۔ اس صورت میں بہت سے لوگ شاید یہ کہیں کہ جب مامون دل میں برائی کا ارادہ رکھتا تھا تو آپ کو اس فیصلے کی مزاحمت کرنی چاہیے تھی اور آپ ظاہری ولی عہدی قبول نہ کرتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فیصلہ کرنا چاہیے کہ امام انکار کر دیتے یا اُس کی پیشکش مان لیتے؟

یہ ایک شرعی مسئلہ ہے کہ کبھی اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کرنا جائز ہو جاتا ہے لیکن اس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ قتل ہونے کا زندہ رہنے سے زیادہ اثر مرتب ہوتا ہو یعنی یہ بات حتمی بن جائے کہ آدمی قتل ہو جائے یا بہت بڑے نقصان کو برداشت کرے جیسا کہ امام حسینؑ کا معاملہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا امام علی رضاؑ کے حالات امام حسینؑ کے حالات جیسے تھے؟ اور کیا واقعی امام علی رضاؑ دوراہے پر کھڑے تھے کہ آپ کے لیے اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کرنا جائز ہو چکا تھا؟

بعض اوقات حالات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں کہ دشمن کسی کو اس کی مرضی کے خلاف قتل کر ڈالتے ہیں مثلاً امام کی زہر خورانی کا واقعہ جو شیعی روایات کے مطابق قطعی ہے جبکہ تاریخ کی نظر سے قطعی نہیں ہے۔

بہت سے مؤرخین حتیٰ کہ شیعہ مؤرخ مسعودی [۱] یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ امام علی رضاؑ کا انتقال طبعی طور پر ہوا تھا اور آپ کو قتل نہیں کیا گیا تھا جبکہ مشہور شیعی عقیدے کے مطابق مامون نے امام کو زہر دیا تھا۔ امام علی رضاؑ دو میں سے ایک چیز کے انتخاب پر مجبور تھے یا تو ولی عہدی قبول کر لیں جسے میں ''مسلط کردہ ولی عہدی'' کا نام دیتا ہوں اور یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہے یا قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائیں اور بعد میں تاریخ اُنھیں غلط فیصلے کا مرتکب قرار دیتی رہے۔ میری نظر میں امام کے پاس پہلا فیصلہ قبول کر لینے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا (یعنی مسلط کردہ ولی عہدی کو قبول کرنا عقل کے تقاضوں کے عین مطابق تھا اور آپ نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا)۔ آخر آپ اس کو قبول کیوں نہ کرتے؟ ہم جانتے ہیں کہ مامون جیسے شخص کے ساتھ تعاون مطلقاً ممنوع نہیں ہے۔ تعاون کی نوعیت کو اہمیت حاصل ہے۔ [۲] بہتر یہ ہے کہ اس مسئلے کی تحقیق ہم خود امام علی رضاؑ کے

۱۔ بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ مسعودی شیعہ مؤرخ تھے۔

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۲۹ ۔ ۲۳۲

ارشادات[1] کی روشنی میں کریں اور اگر ہم امام کے ارشادات کے ساتھ ساتھ مسلمات تاریخ پر بھی نظر رکھیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مامون کے متعلق اُٹھنے والے بہت سے سوالات کے جوابات دیئے جا سکتے ہیں۔[2]

۱۔ امام علی رضاؑ نے اپنے حسن تدبیر اور الٰہی سیاست کے ذریعے ولی عہدی کے مسئلے کے متعلق مامون کے مقاصد کو ناکام بنا دیا۔ آپ کی الٰہی سیاست کے درج ذیل نتائج برآمد ہوئے:

(۱) مامون نے جب امام کو مدینہ سے خراسان بلایا تو مدینے میں مامون کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی کیونکہ تمام لوگوں کو یقین تھا کہ مامون بدنیتی سے امام کو وطن سے دور کر رہا ہے۔

(۲) پھر جب (دارالحکومت) مرو میں مامون نے آپ کو ولی عہدی کی پیشکش کی تو آپ نے بڑی سختی سے اسے مسترد کر دیا اور جب تک مامون نے آپ کو قتل کی دھمکی نہ دی اس وقت تک آپ نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا۔

(۳) آپ نے ولی عہدی اس شرط پر قبول کی تھی کہ میں امور حکومت میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا۔ میں نہ تو کسی کو سرکاری عہدے پر فائز کروں گا اور نہ ہی کسی کو معزول کروں گا اور جنگ اور مصالحت کے امور کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مامون نے سوچا ہوگا کہ امام فی الحال عدم مداخلت کی شرط عائد کر رہے ہیں مستقبل قریب میں ممکن ہے کہ وہ حکومتی امور میں فعال کردار ادا کریں۔

(۴) خلافت و حکومت کا وہ سلسلہ جو ۴۰ھ میں حضرت علیؑ کی شہادت اور امام حسنؑ کی مصالحت کی وجہ سے خاندان رسولؐ سے نکل چکا تھا۔ آپ نے ولی عہدی کا منصب قبول کر کے عالم اسلام میں شیعی نقطۂ نظر کو اجاگر کیا اور تقیہ کے تحت پردے کو چاک کر کے تمام مسلمانوں کے کانوں تک تشیع کا پیغام پہنچایا۔

(۵) مامون کی خواہش تھی کہ امام لوگوں سے براہ راست رابطہ نہ کر سکیں اسی لیے اس نے آپ کے سفر کا پروگرام بھی کچھ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ آپ کا گزر ایسے شہروں سے نہ ہونے پائے جہاں شیعہ کثرت سے آباد ہوں لیکن امام نے جہاں بھی مناسب سمجھا لوگوں سے رابطہ استوار کیا۔ آپ نے اہواز میں امامت کی کچھ علامات ظاہر فرمائیں۔ بصرہ کے رہنے والے آپ کے مخالف تھے لیکن آپ نے اپنے طرزِ عمل سے انھیں اپنا دوست اور خیر خواہ بنا لیا تھا۔ آپ نے نیشاپور میں حدیث سلسلۃ الذہب بیان فرمائی تھی جو ہمیشہ کے لیے یادگار ہے۔ مرو دار الخلافہ تھا اور یہاں جب بھی آپ کو موقع ملتا تو سرکاری پروٹوکول بالائے طاق رکھ کر عوام الناس میں گھل مل جاتے تھے۔ امام کی طرف سے ولی عہدی کا منصب قبول کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ شیعی مبلغین کے حوصلے بلند ہوئے اور ناقابل عبور پہاڑی علاقوں اور دور دراز بستیوں تک محبت آل محمدؐ کا پیغام پہنچا اور لوگوں میں امام کی حمایت کا جذبہ عام ہوا اور اس کے ساتھ حکومتی عمال کو بھی لوگوں کی طرف سے احترام و اکرام نصیب ہوا۔

(دوسری بین الاقوامی امام علی رضاؑ کانفرنس میں آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے پڑھے گئے مقالے سے اقتباس)

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۱۰ ـ ۲۱۶

مسلمات تاریخ

(۱) امام کی مدینہ سے مرو تشریف آوری

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امام علی رضاؑ کے مدینہ سے مرو تک کے سفر کے حوالے سے آپ سے کوئی مشاورت نہیں کی گئی تھی۔ ولی عہدی کی بات مرو ہی میں ہوئی تھی۔ مامون کے بھیجے ہوئے فوجی دستے نے صرف امام علی رضاؑ کو ہی اپنے ساتھ نہیں لیا تھا بلکہ آپ کے علاوہ آل ابی طالب کے اور بھی بہت سے افراد کو اُن کی مرضی کے بغیر مرو[1] لے جایا گیا تھا۔

امام علی رضاؑ کے سفر کے لیے وہ راستہ اختیار کیا گیا جہاں شیعہ آبادیاں موجود نہیں تھیں۔ آپ کو مدینہ سے بصرہ، پھر خوزستان و فارس لایا گیا۔ پھر آپ کو نیشاپور لایا گیا (آپ ۱۰ شوال ۲۰۱ھ کو مرو وارد ہوئے)۔ آپ کو مرو لانے کے لیے مامون نے ایسے افراد کا انتخاب کیا تھا جو آپ سے عناد رکھتے تھے اور اس سلسلے کی عجیب بات یہ ہے کہ اس دستے کا کمانڈر جلودی[2] یا جلودی تھا (وہ ظاہراً عرب تھا)۔ وہ امام کا سخت مخالف اور مامون کا اتنا وفادار تھا کہ جب مامون نے مرو میں امام عالی مقام کو ولی عہد بنانے کی بات کی تھی تو اُس نے سخت مخالفت کی تھی۔ مامون نے اُسے پُرسکون رکھنے کی بڑی کوشش کی مگر اُس نے مخالفت جاری رکھی۔ مامون نے تنگ آکر اُسے اُس کے دو ساتھیوں سمیت زندان بھیج دیا اور بعد ازاں اسی وجہ سے اُنھیں قتل کرا دیا۔

(۲) امام کا ولی عہدی قبول کرنے سے انکار

ابو الفرج نے مقاتل الطالبین میں لکھا ہے کہ مامون نے فضل بن سہل اور حسن بن سہل کو امام علی رضاؑ کے پاس بھیجا اور اُن کے ذریعے آپ کو ولی عہدی کی پیشکش کی۔ امام نے ولی عہدی قبول کرنے سے معذرت

۱۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۵۹ ۔ ۲۶۰ ۔علی بن عیسیٰ اربلی، کشف الغمہ ج ۳، ص ۶۵

۲۔ جلودی اس سے قبل خاندان عصمت کے ساتھ ظلم کر چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک علوی نے عہد ہارون میں اس کے خلاف قیام کیا تھا۔ حکومتی لشکر سے مقابلہ ہوا تو وہ مغلوب ہوگیا۔ ہارون نے جلودی کو سپاہیوں کے ساتھ مدینہ بھیجا اور اسے ہدایت کی کہ وہ آل ابی طالب کے گھروں کا سامان یہاں تک کہ خواتین کے زیورات بھی لوٹ لے اور ایک لباس کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہ چھوڑے۔

جلودی سپاہیوں کو لے کر امام علی رضاؑ کے دروازے پر آیا۔ آپ دروازے پر کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ میں تجھے اپنے گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گا۔ جلودی نے کہا کہ خلیفہ کا حکم ہے لہٰذا میں اندر جاؤں گا اور سیدانیوں کے زیورات اور لباس لوٹوں گا۔ امام نے فرمایا کہ تو نے جو بھی ظلم کرنا ہو مجھ پر کرلے مگر میں تجھے اندر نہیں جانے دوں گا۔ تم باہر رہو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمام سیدانیوں کے زیورات اور لباس میں خود تیرے حوالے کردوں گا۔ چنانچہ آپ گئے اور گھر میں جتنا بھی اثاثہ تھا وہ بھی جلودی کو پیش کیا اور اہل حرم کے زیورات اور ان کے اضافی لباس بھی اس کے سپرد کیے۔

کرلی۔ آخر میں انھوں نے کہا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ معاملہ آپ کی مرضی پر موقوف نہیں۔ ہمیں خلیفہ نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر آپ انکار کریں تو اسی وقت آپ کی گردن مار دی جائے (علمائے شیعہ نے اس نکتے کو تکرار کے ساتھ لکھا ہے)۔

ابو الفرج لکھتے ہیں کہ اس کے باوجود بھی امام نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ پھر مامون نے خود آپ سے بات کی اور آپ کو قتل کی دھمکی دی۔ پھر کہا کہ آپ یہ پیشکش قبول کیوں نہیں کرلیتے؟[۱] کیا آپ کے دادا علی بن ابی طالبؑ نے شوریٰ میں شرکت نہیں کی تھی۔[۲]

اس طرح مامون دراصل امام کو سمجھا رہا تھا کہ اگر آپ کے دادا شوریٰ میں شریک ہو سکتے ہیں تو آپ بھی ولی عہدی کا منصب قبول کر کے میرے ساتھ اقتدار میں شراکت کر سکتے ہیں اور یہ بات آپ کے خاندانی طرزِ عمل کے خلاف نہیں ہے۔

(۳) امام علی رضاؑ کی شرط

ایک اور چیز جو مسلمہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ امام علی رضاؑ نے ولی عہدی کو مشروط طور پر قبول کیا تھا اور اپنی شرط کو اس سے منوا لیا تھا کہ میں کسی بھی کام (مثلاً کسی کی تقرری اور معزولی، جنگ و صلح)[۳] میں مداخلت نہیں کروں گا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نماز عید میں بھی شرکت نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ ایک مشہور واقعہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ مامون نے امام سے نماز عید پڑھانے کا تقاضا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات ہمارے عہد و پیمان کے خلاف ہے۔ مامون نے کہا کہ آپ کے شریک نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بہت سی باتیں بنا رہے ہیں لہٰذا آپ میری یہ درخواست قبول فرمائیں۔

آپ نے فرمایا ٹھیک ہے، میں نماز پڑھاؤں گا۔ آپ نماز عید کے لیے کچھ اس انداز سے گھر سے

۱۔ مامون اچھی طرح جانتا تھا کہ امام اتنے بڑے منصب کو قبول کرنے سے انکار کیوں کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے انکار کی وجہ مامون کو یہ بتائی کہ اگر تمہارے پاس کسی کی کوئی امانت ہو تو کیا وہ صاحب امانت کے علاوہ کسی دوسرے کے سپرد کرو گے؟ مقصد یہ تھا کہ جب خلافت تمہارا اپنا حق ہی نہیں ہے تو تم مجھے کیسے منتقل کرنا چاہتے ہو؟ آپ جانتے تھے کہ مامون انھیں جو حق واپس کرنا چاہتا ہے وہ حق کس کا ہے؟ آپ کو معلوم تھا کہ مامون کی طرف سے اس منصب کو قبول کرنا اس کے استحقاقِ خلافت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہے۔ اگر امام خلافت کو اپنا خدائی حق سمجھتے ہیں تو آپ مامون سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمھیں حق ہی نہیں ہے کہ تم مجھے ولی عہد مقرر کرو۔ تمھیں یہ عہدہ چھوڑ دینا چاہیے اور یہ اقرار کرلینا چاہیے کہ حکومت پر میرا حق نہ تھا۔ یہ آپ کا حق تھا اور اگر خلیفہ کے انتخاب کا تعلق عوام کے ساتھ ہے تو بھی مامون کا یہ حق نہیں ہے۔

۲۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۵۹۔ علل الشرائع ج ۱، ص ۲۲۶

۳۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۶۰۔ طبرسی، اعلام الوریٰ باعلام الہدیٰ ص ۳۳۴

برآمد ہوئے کہ مامون اور فضل دونوں پریشان ہوگئے اور کہنے لگے کہ اگر حضرت اس انداز سے عیدگاہ تک پہنچ گئے تو انقلاب آجائے گا۔ چنانچہ اُنھوں نے آپ کو واپس بلا لیا اور آپ کو شہر سے باہر عیدگاہ تک نہ جانے دیا۔[1]

(۴) ولی عہدی کے بعد آپ کا طرزِ عمل

ایک اور مسلّمہ تاریخی مسئلہ ہے جسے سنّی اور شیعہ دونوں مؤرخین نے نقل کیا ہے۔

ابو الفرج نے لکھا ہے اور ہماری کتابوں[2] میں بھی لکھا ہے کہ آپ نے بروز جمعرات ۱۰ رمضان ۲۰۱ھ کو ولی عہد منتخب ہونے کے بعد اسی دربار میں عجیب خطبہ دیا تھا۔ آپ نے اس خطاب میں نہ تو مامون کا نام لیا اور نہ ہی اُس کا شکریہ ادا کیا تھا۔[3] خلیفہ کے حکم سے سب پہلے خلیفہ کے بیٹے عباس نے امام کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی۔ اس کے بعد مامون کے وزیر فضل بن سہل نے، پھر قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے، پھر مامون کے سپہ سالار عبداللہ بن طاہر نے آپ کی بیعت کی۔ اس کے بعد باقی معززین اور وہاں موجود بنی عباس کے اکابرین نے آپ کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔[4]

سوال و جواب

سوال: یہ جو مفروضہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر فضل شیعہ تھا تو مصلحت یہ تھی کہ امام ولی عہدی کے معاملے میں اُس کے ساتھ تعاون کرتے پھر مامون کو آہستہ آہستہ خلافت سے معزول کر دیتے۔

اس مفروضے پر یہ اشکال ہوا رد ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کے لیے آپ کو کچھ عرصہ مامون کے تمام کاموں کو درست کہنا پڑتا جبکہ حضرت علیؑ ظالم کی ایک لمحے کے لیے بھی حمایت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

جواب: ہمارا خیال ہے کہ یہ اعتراض یہاں نہیں ہوسکتا کیونکہ امام علی رضاؑ اور مامون، حضرت علیؑ اور معاویہ کے حالات میں کافی فرق تھا۔

حضرت علیؑ کا مسئلہ یہ تھا کہ اگر آپ معاویہ کو اُس کے عہدے پر باقی رکھتے تو وہ آپ کا مقرر کردہ عامل سمجھا جاتا اور آپ اس بات پر ہرگز راضی نہیں تھے کہ معاویہ آپ کا نمائندہ بن کر عوام پر ظلم کرتا رہے جبکہ امام علی رضاؑ کا معاملہ ایسا نہیں تھا جو امیر المومنینؑ کا تھا یعنی آپ صرف یہی کر سکتے تھے کہ کچھ عرصہ مامون کے کاموں سے لاتعلق رہیں یعنی اُس کے کاموں میں کوئی مداخلت ہی نہ کریں۔

۱۔ آشنائی با قرآن ج ۳، ص ۱۰۳۔۱۰۷

۲۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۶۱۔۲۶۳

۳۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۱۷۔۲۱۹۔ ص ۲۲۱۔۲۲۲ و ۲۳۲۔۲۳۷۔ کشف الغمہ ج ۳، ص ۱۲۳۔۱۲۸

۴۔ زندگانی پیشوای ہشتم امام علی بن موسیٰ الرضا، سید علی محقق ص ۸۲۔۸۷

منطق اور شریعت کی رو سے ان دو خرابیوں میں بڑا فرق ہے۔

(۱) ایسی خرابی جس کے پیدا کرنے کی ذمے داری ہم پر عائد ہوتی ہو۔

(۲) ایسی خرابی جو پہلے سے موجود ہے اور ہم اُس خرابی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ان دونوں خرابیوں کے متعلق شرعی وظیفہ جدا جدا ہے۔

معاویہ کو اُس کے عہدے پر برقرار رکھنے کا یہ مطلب ہوتا کہ حضرت علیؑ اُسے اپنے ایک نمائندے کی حیثیت سے تسلیم کر رہے ہیں جبکہ (آپ کے بقول) امام علی رضاؑ کی طرف سے مامون کی ولی عہدی قبول کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امام علی رضاؑ کو کچھ عرصے کے لیے مامون کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا پڑتی۔ یہ دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں (اور ان کا آپس میں موازنہ کرنا صحیح نہیں ہے)۔

پہلی صورت میں حضرت علیؑ مختار کل اور حاکم تھے (جبکہ امام علی رضاؑ کا معاملہ اس کے برعکس ہے)۔ یہاں مامون مختار کل اور حاکم تھا اور اگر ان حالات میں امام رضاؑ فضل بن سہل کے ساتھ تعاون کرتے یا آپ کے بقول مامون سے تعرض نہیں کر رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بڑی مصلحت کے حصول اور بہتر موقع کے انتظار کے لیے کچھ عرصے کی خاموشی اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علاوہ ازیں معاویہ کا مسئلہ صرف یہی نہیں تھا۔ اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اگر امیرالمومنینؑ معاویہ کو اُس کے منصب پر برقرار رکھتے تو معاویہ کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا اور حضرت علیؑ کی قوت میں روز بروز کمی ہوتی اور معاویہ اپنے مقاصد کے حصول میں زیادہ طاقتور بنتا۔ اس کے برعکس امام علی رضاؑ کا وظیفہ صرف یہ تھا کہ آپ کچھ عرصہ صبر کریں تاکہ مامون روز بروز کمزور ہو اور آپ کی طاقت میں اضافہ ہو لہٰذا امیرالمومنینؑ اور امام علی رضاؑ کے حالات کا باہمی موازنہ کرنا درست نہیں ہے۔

سوال: میرے سوال کا تعلق امام علی رضاؑ کی زہر خورانی سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ امام علی رضاؑ کے متعلق معلوم نہیں کہ اُنھیں زہر دیا گیا تھا؟ لیکن حقیقت یہی ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا تھا کیونکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ لوگوں کو معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ خلافت کے اصلی حق دار امام علی رضاؑ ہیں اس لیے مامون نے آپ کو زہر دیا تھا۔ علاوہ ازیں شیعی تاریخ سے بھی یہ بات ثابت ہے لہٰذا اگر مروج الذہب کے مؤلف مسعودی کو زہر خورانی کے متعلق اشتباہ ہوا ہے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ امام کو زہر نہیں دیا گیا تھا کیونکہ شیعہ مؤرخین کی اکثریت زہر خورانی کی قائل ہے۔

جواب: میں نے اپنی گفتگو میں یہ نہیں کہا تھا کہ امام علی رضاؑ کو زہر نہیں دیا گیا تھا۔ میں مجموعی دلائل کی بنیاد پر آپ کا ہم عقیدہ ہوں اور آپ کے نظریے کی تائید کرتا ہوں۔ قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو زہر سے

شہید کیا گیا تھا اور اس کا بنیادی سبب بغداد میں بنی عباس کی مامون کے خلاف شورش تھی۔

مامون نے خراسان سے بغداد آتے ہوئے آپ کو زہر دے کر شہید کیا تھا کیونکہ اُسے بغداد سے لحہ بہ لحہ یہ خبر مل رہی تھی کہ پورے بغداد میں شورش برپا ہے۔ اس نے سوچا کہ امام علی رضاؑ کو ولی عہدی سے معزول کرنا بھی درست نہیں ہے لیکن اُنھیں اپنے ساتھ بغداد لے جانا بھی مزید مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ اُس نے بنی عباس کو مطمئن کرنے اور بغداد کی شورش کو ختم کرنے کے لیے امام کو زہر دے کر شہید کرا دیا تاکہ بنی عباس سے یہ کہا جاسکے کہ امام علی رضاؑ کی ولی عہدی پر اگر تمھیں اعتراض تھا تو وہ مسئلہ تو سرے سے ہی ختم ہو چکا ہے۔ امام کو زہر دینے کی یہ بنیادی وجہ ہے اور یہ بات تاریخ کے مطابق ہونے کی وجہ سے قابل قبول بھی ہے یعنی مامون نے یہ دیکھ لیا تھا کہ بغداد اُس کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے اور امام علی رضاؑ کو ولی عہدی پر برقرار رکھنا بھی اُس کے لیے سیاسی مشکلات کا سبب بن رہا ہے (علاوہ ازیں مامون جوان تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس برس تھی جبکہ امام علی رضاؑ کی عمر پچپن برس تھی۔ امام نے تو آغاز میں ہی مامون سے کہہ دیا تھا کہ میری عمر تجھ سے زیادہ ہے اور میں تجھ سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا)۔

اگر مامون امام کو اپنے ولی عہد کی حیثیت سے بغداد ساتھ لے کر جاتا تو وہ بغداد میں داخل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح ایک نئی جنگ شروع ہو جاتی۔ مامون نے جب حالات کا مشاہدہ اور تجزیہ کیا تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ فضل کو بھی چلتا کرے گا اور امام علی رضاؑ کو بھی شہید کردے گا۔ چنانچہ اُس نے سرخس شہر کے ایک حمام میں فضل کو مروا ڈالا۔ مؤرخین نے بس اتنا لکھا ہے کہ فضل حمام گیا، وہاں کچھ شمشیر بردار لوگ گھس آئے اور اُنھوں نے فضل کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ مامون کی کارستانی تھی۔ مامون نے محسوس کرلیا تھا کہ فضل نے بہت زیادہ طاقت حاصل کرلی ہے اور وہ کسی بھی وقت اُس کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا ہے لہٰذا اس کا پتا کاٹ دیا گیا۔ سرخس کے بعد مامون کا قافلہ طوس پہنچا۔ طوس میں اسے بغداد سے مزید رپورٹیں موصول ہوئیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے علوی ولی عہد کو ساتھ لے کر بغداد میں قدم نہیں رکھ سکتا چنانچہ اُس نے آپ کی شمع حیات کو بھی گل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور آپ کو شہید کرا دیا۔

بعض اوقات ہماری گفتگو ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ایک تسلیم شدہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے جیسا کہ امام علی رضاؑ کی زہرا خورانی کی روایت کہ مامون نے آپ کو زہر دے کر شہید کیا تھا جبکہ کچھ دوسرے مؤرخین کی نظر میں وہ روایت موثقہ نہیں ہوتی اسی لیے ہم نے مذکورہ گفتگو غیر شیعہ منطق کے مطابق کی تھی۔[1]

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار، ص ۲۳۹ ۔ ۲۴۳

امام محمد تقیؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام محمد تقیؑ کا لقب جواد الائمہ تھا۔ آپ کی ولادت ۱۰ رجب اور ایک روایت کے مطابق ۱۵ یا ۱۹ رمضان المبارک ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپ کی والدہ ام ولد تھیں جنھیں امام علی رضاؑ خیزران کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آپ کو معتصم عباسی نے زہر دے کر شہید کرایا تھا۔ آپ نے پچیس برس کی عمر میں ماہ ذی قعدہ کے آخر میں ۲۲۰ھ میں وفات پائی۔ آپ نے سترہ برس تک امامت کے فرائض سرانجام دیے تھے اور شہادت کے بعد آپ کو آپ کے جد امجد امام موسیٰ کاظمؑ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔[1] آپ کے زمانے میں مامون عباسی (۲۰۳ھ تا ۲۱۸ھ) اور معتصم عباسی (۲۱۸ھ تا ۲۲۰ھ) کی حکومت رہی۔

امام محمد تقیؑ کی زندگی کی کچھ خصوصیات یہ ہیں:

(۱) جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو بچپن میں منصب نبوت پر فائز کیا تھا اسی طرح امام محمد تقیؑ بھی نو برس کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے تھے۔[2]

(۲) مامون اور معتصم مدینہ میں آپ کے وجود مبارک سے خوفزدہ تھے اسی لیے وہ آپ کو زبردستی بغداد لے آئے تاکہ آپ پر ہر وقت کڑی نظر رکھی جا سکے۔

(۳) امام خدا کی طرف سے علم لدنی کا حامل ہوتا ہے اور وہ لوگوں کے تمام سوالات کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
چنانچہ شیعوں نے بھی امام محمد تقیؑ سے مختلف سوال کئے اور جب آپ نے اُن کے تسلی بخش جواب دیے تو سب کو آپ کی حقانیت وصداقت کا یقین آگیا۔[3]

(۴) مامون اور معتصم نے اپنے دور خلافت میں مختلف مذاہب کے علماء سے امام عالی مقام کے مباحثے اور مناظرے کرائے تھے۔ اُن میں سے اہم ترین مناظرہ قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کے ساتھ ہوا تھا۔
واضح رہے کہ قاضی یحییٰ کی علمی شہرت زبان زد خاص و عام تھی[4] (جب وہ آپ کے مقابلے میں لاجواب ہوا تو دنیا کو امام کی وسعت علمی کا اندازہ ہوا)۔

(۵) امام نے سلطنت عباسیہ کے تمام اہم شہروں مثلاً اہواز، ہمدان، سیستان، بست، رے، بصرہ، واسط،

۱۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۷۳

۲۔ سورۂ مریم: آیت ۱۲ و ۲۹، ۳۲۔ سورۂ یوسف: آیت ۲۲۔ سورۂ قصص: آیت ۱۴۔ اصول کافی ج ۱، ص ۳۸۴

۳۔ بحار الانوار ج ۵۰، ص ۹۸۔ ۱۰۰

۴۔ بحار الانوار ج ۵۰، ص ۷۵۔ ۷۶۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۲۸۱۔ ۲۸۴

بغداد اور دیگر شیعہ علاقوں جیسے کوفہ اور قم وغیرہ میں اپنے نمائندے مقرر کر رکھے تھے جن کا کام یہ تھا کہ وہ لوگوں کے عقائد، اُخلاق اور دیگر احکام کے متعلق سوالات کے جواب دیتے تھے اور اہل ایمان کی دینی مشکلات حل کرتے تھے اور امت اور امام میں رابطے کا کام کرتے تھے۔

(۶) امام محمد تقیؑ سمیت ائمہ طاہرینؑ کی زندگی کے بڑے ابعاد میں سے ایک "بُعد فرہنگی" بھی تھا۔ ائمہ اپنے شاگردوں کی تربیت کرتے تھے اور اُن کے ذریعے معاشرے میں اپنے علم و دانش کی نشر و اشاعت کرتے تھے۔

امام محمد تقیؑ سخت نظر بندی اور سیاسی پابندی کا شکار تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے پچیس سال کی مختصر زندگی پائی تھی مگر اس کے باوجود تاریخ میں آپ کے رواۃ و اصحاب کی تعداد ایک سو دس افراد ہے۔

(۷) امام محمد تقیؑ کے مشہور ترین اصحاب حسب ذیل ہیں:

(۱) علی بن مہزیار (۲) احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی (۳) زکریا بن آدم (۴) محمد بن اسماعیل بن بزیع (۵) حسین بن سعید اہوازی (۶) احمد بن محمد بن خالد برقی (۷) سید عبدالعظیم حسنی

آپ کے یہ اصحاب علمی و فقہی دنیا میں بڑا مقام رکھتے تھے۔

علمائے اہل سنت میں سے ابن حجر ہیثمی، جاحظ عثمانی معتزلی اور خطیب بغدادی جیسے نامور علماء نے امام سے اسلامی معارف و حقائق کو نقل کیا ہے۔[۱]

امام علی نقیؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام علی نقیؑ امام ہادی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے ۱۵ ذی الحجہ ۲۱۲ھ کو مدینہ منورہ میں آنکھ کھولی تھی اور آٹھ برس کی عمر میں منصب امامت کی ذمے داریوں کو نبھانا شروع کیا تھا۔ آپ نے ۳۳ برس میں سے تیرہ برس مدینہ میں اور بیس برس سامرا میں فرائض امامت انجام دیئے۔ آخر کار معتز کے حکم سے آپ کو زہر دیا گیا جس کے اثر سے آپ نے ۴۱ برس کی عمر میں ۳ رجب ۲۵۴ھ میں شہادت پائی اور سامرہ میں اپنے گھر کے اندر مدفون ہوئے۔[۲]

خلفائے وقت۔ امام علی نقیؑ کے عہد کے خلفاء کے نام یہ ہیں:

(۱) معتصم عباسی (۲۲۰ھ تا ۲۲۷ھ)

(۲) واثق بن معتصم (۲۲۷ھ تا ۲۳۲ھ)

۱۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۵۳۲ - ۵۶۱

۲۔ شیخ مفید، الارشاد ص ۲۹۷

(۳) متوکل بن معتصم (۲۳۲ھ تا ۲۴۸ھ)

(۴) منتصر بن متوکل (صرف چھ ماہ)

(۵) منتصر کا چچا زاد مستعین (۲۴۸ھ تا ۲۵۲ھ)

(۶) متوکل کا دوسرا بیٹا معتز بن متوکل (۲۵۲ھ تا ۲۵۴ھ)

مذکورہ بالا خلفاء میں سے صرف منتصر کا اہل بیتؑ کے ساتھ رویہ نسبتاً بہتر تھا۔

امام علی نقیؑ کے عہد امامت کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) عباسی خلافت کی ہیبت وجلالت کا زوال۔

(۲) درباریوں کی ہوس رانیوں اور موج مستیوں میں اضافہ

(۳) ظلم اور مفاد پرستی میں اضافہ

(۴) علویوں کی تحریکوں میں اضافہ

آپ کے عہد امامت میں بہت سی تحریکیں اٹھیں اور ان سب کا نعرہ رضائے آل محمدؐ تھا۔ ان میں سے چند تحریکیں حسب ذیل ہیں:

(۱) معتصم کے دور میں محمد بن قاسم نے طالقان (ایران) میں حکومت کے خلاف قیام کیا تھا۔ آخرکار ۲۱۹ھ میں عبداللہ بن طاہر کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور اسے معتصم کے پاس بھیجا گیا۔

(۲) ۲۵۰ھ میں یحیٰی بن عمر بن حسین نے کوفہ میں حکومت کے خلاف خروج کیا تھا اور بہت سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اُس نے کوفہ کے بیت المال پر قبضہ کرلیا تھا اور زندان کے دروازے کھول کر تمام قیدیوں کو چھڑا لیا تھا۔ حکومت کے ساتھ لڑائی میں اسے شکست ہوئی اور صلیب پر لٹکایا گیا۔

(۳) ۲۵۰ھ میں حسن بن زید بن محمد نے طبرستان میں مسلح جدوجہد کی اور طبرستان وگرگان پر قبضہ کرلیا تھا ۲۷۰ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

(۴) ۲۵۱ھ میں محمد جعفر نے خراسان میں قیام کیا تھا۔[۱]

والی مدینہ کی شکایت پر متوکل عباسی نے امام علی نقیؑ کو ۲۴۳ھ یا ۲۴۴ھ میں اپنے پاس سامرا طلب کیا۔ معتز عباسی نے ۳ رجب ۲۵۴ھ میں کو آپ کو زہر دلایا جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی اور آپ اپنے گھر کے اندر دفن کئے گئے۔

۱۔ یاد ایام ج ۲، ص ۲۱۰۔ ۲۱۱

امام حسن عسکریؑ کی حیاتِ مبارکہ

آپ کی ولادت باسعادت ۸ ربیع الثانی اور ایک قول کے مطابق ۲۴ ربیع الاول ۲۳۲ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی اور ۲۵۴ھ میں آپ نے امامت کی ذمے داریاں سنبھالیں۔[1]

آپ کے دور امامت میں حسب ذیل عباسی خلفاء کی حکومت رہی۔

(۱) معتز عباسی (۲۵۴ھ تا ۲۵۵ھ)

(۲) مہتدی عباسی (۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ)

(۳) معتمد عباسی (۲۵۶ھ تا ۲۶۰ھ)

امام حسن عسکریؑ نے ۲۸ برس کی عمر پائی اور معتمد عباسی کے حکم سے آپ کو زہر سے شہید کیا گیا۔ چنانچہ ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ کو آپ نے سامرا میں شہادت پائی اور اپنے گھر میں ہی مدفون ہوئے۔ حکومت نے آپ پر بہت زیادہ سختیاں کی تھیں اور جیسے جیسے امام عصرؑ کی ولادت کا وقت قریب ہوتا گیا حکومت کی سختیوں میں اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا۔

امام کی رہائش سامرا میں تھی اور سامرا اُس وقت عباسی حکومت کا دارالحکومت تھا۔ معتصم نے بغداد کی بجائے سامرا کو دارالخلافہ کا درجہ دیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ معتصم کے فوجی اتنے خودسر ہوگئے تھے کہ وہ لوگوں کو بہت تنگ کرنے لگے تھے۔ لوگوں نے جب معتصم سے اُس کے لشکر کی شکایت کی تو پہلے اُس نے خاص توجہ نہ دی لیکن جب لوگوں کی شکایات بڑھیں تو وہ بغداد چھوڑنے پر راضی ہوگیا اور اپنی سپاہ کو عوام سے دور رکھنے کے لیے سامرا کو دارالحکومت کا درجہ دیا۔ امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کو سامرا میں زبردستی رکھا گیا تھا۔ جس محلے میں یہ بزرگوار رہتے تھے اسے ''العسکر'' یا ''العسکری'' کہا جاتا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ یہ ہستیاں فوجی چھاؤنی کے وسط میں رہنے پر مجبور اور عملی طور پر نظربند تھیں۔[2]

اس پُرخطر دور میں امام حسن عسکریؑ کی اجتماعی اور سیاسی وعلمی سرگرمیاں کچھ یوں تھیں:

(۱) جو آپ کی امامت کے قائل نہ تھے ان سے علمی مباحثے کرنا اور شبہات و اشکالات دور کرنے کی کوششیں کرنا اور معارف اسلامی کی ترویج۔

(۲) اپنے نمائندوں کے ذریعے مختلف علاقوں میں آباد اپنے شیعوں سے روابط قائم کرنا۔

(۳) عباسی حکومت کی کڑی نگرانی کے باوجود خفیہ سیاسی سرگرمیاں۔

(۴) اہم شیعہ شخصیات کی مدد وحمایت اور اُن کے سیاسی اثر ورسوخ میں اضافے کی کوششیں کرنا۔

۱۔ شیخ مفید، الارشاد، ج ۲، ص ۳۱۳

۲۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہار، ص ۲۳۶۔ ۲۳۷

(۵) شیعوں کی مالی امداد بالخصوص اپنے اصحاب کی امداد کرنا۔

(۶) اپنے فرزند کی غیبت کو قابل اعتماد بنانے کے لیے زمین ہموار کرنا۔[1]

امام کی مسلسل نظر بندی اور معاشرے پر چھائے ہوئے خوف کی وجہ سے امام حسن عسکریؑ کے اصحاب کی تعداد زیادہ نہیں مگر اس کے باوجود اپنے وقت کے بہت سے خدا شناس اور پرہیزگار لوگ آپ کے اصحاب میں شمار کئے جاتے تھے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

(۱) احمد بن اسحاق اشعری قمی (۲) ابو ہاشم داؤد بن قاسم جعفری

(۳) عبداللہ بن جعفر حمیری (۴) ابو عمرو عثمان بن سعید عمری۔[2]

امام علی نقیؑ کی نسبت حکومت وقت امام حسن عسکریؑ پر زیادہ کڑی نظر رکھتی تھی اور اس کی دو وجوہات تھیں:

(۱) امام حسن عسکریؑ کے زمانہ امامت میں شیعہ عراق میں طاقتور جماعت کی شکل اختیار کر چکے تھے اور تمام لوگ جانتے تھے کہ یہ گروہ خلفائے وقت پر اعتراضات کرتا ہے اور کسی بھی عباسی خلیفہ کی خلافت کو قانونی اور آئینی نہیں سمجھتا۔ یہ لوگ اولاد علیؑ کی امامت الٰہیہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس وقت اولاد علیؑ میں امام حسن عسکریؑ ممتاز ترین شخصیت تھے (اسی لیے حکومت وقت آپ پر کڑی نظر رکھتی تھی)۔

(۲) رسول اکرم ﷺ سے منقول متواتر روایات و اخبار سے بنی عباس کے خلفاء واقف تھے جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ نشاندہی کی تھی کہ مفاد پرست حکومتوں کا خاتمہ حسن عسکریؑ کے فرزند کے ہاتھوں ہوگا۔ اسی وجہ سے عباسی خلفاء آپ کی سخت نگرانی کرتے تھے۔[3]

آپ جانتے ہیں کہ ائمہ ہدیٰؑ میں سے ہر امام ایک خاص خصوصیت کے مظہر تھے جو اُن کی زندگی میں نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے بارہ اماموں پر درود بھیجا ہے اور ہر امام کو ایک خاص صفت کا مظہر قرار دیا ہے۔ (درود طوسی میں اس کی تفصیل موجود ہے)۔ امام حسن عسکریؑ مقدس ہیبت، جلالت اور حسن کے مظہر تھے۔[4] مقصد یہ ہے کہ آپ کی ذات بابرکت میں ہیبت و جلالت اس قدر نمایاں تھی کہ جو بھی آپ

۱۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۶۲۶ ۔ ۶۲۷

۲۔ یاد ایام ج ۲، ص ۱۳۲ ۔ ۱۳۳

۳۔ مہدی پیشوائی، سیرۂ پیشوایان ص ۶۲۱ ۔ ۶۲۲

۴۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے امام زمانہ پر درود بھیجتے ہوئے اُنھیں چودہ صفات کا مظہر قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَ زِدْ وَ بَارِكْ عَلٰى صَاحِبِ دَعْوَةِ النَّبَوِيَّةِ وَالصَّوْلَةِ الْحَيْدَرِيَّةِ وَالْعِصْمَةِ الْفَاطِمِيَّةِ وَالْحِلْمِ الْحَسَنِيَّةِ وَالشَّجَاعَةِ الْحُسَيْنِيَّةِ وَالْعِبَادَةِ السَّجَّادِيَّةِ وَالْمَآثِرِ الْبَاقِرِيَّةِ وَالْآثَارِ الْجَعْفَرِيَّةِ وَالْعُلُوْمِ الْكَاظِمِيَّةِ وَالْحُجَجِ الرِّضَوِيَّةِ وَالْجُوْدِ التَّقَوِيَّةِ وَالنَّقَاوَةِ النَّقَوِيَّةِ وَالْهَيْبَةِ الْعَسْكَرِيَّةِ وَالْغَيْبَةِ الْاِلٰهِيَّةِ.

سے ملتا وہ آپ کی اس خصوصیت سے ضرور متاثر ہوتا اور جب آپ گفتگو فرماتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔

چنانچہ آپ کے متعلق ایسی بہت سی روایات و حکایات منقول ہیں یہاں تک کہ آپ پر کڑی نظر رکھنے والے اور آپ کو زندان میں بھیجنے والے دشمن بھی آپ کی خداداد ہیبت سے کانپ جاتے تھے۔ جب وہ آپ کے روبرو آتے تو ان پر عجیب حالت طاری ہوجاتی تھی۔ یہ بات ناممکن تھی کہ کوئی شخص آپ کے سامنے آئے اور آپ کی تعظیم وتکریم کے لیے نہ جھکے۔

محدث قمی نے ایسی ایک روایت الانوار البہیہ میں عباسی خلیفہ معتمد علی اللہ کے وزیر عبیداللہ بن خاقان کے بیٹے احمد سے نقل کی ہے۔ اُس نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے جبکہ وہ خود بھی اُس وقت موجود تھا۔

امام کی نظری بندی

آپ کی نظربندی کی اہم وجہ یہ تھی کہ لوگ جانتے تھے کہ مہدی امت (عج) آپ کی صلب مقدس سے ظاہر ہوں گے۔ جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ کے متوقع خطرے سے بچنے کے لیے حفاظتی انتظامات کیے تھے اور دائیاں مقرر کر رکھی تھیں۔ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح اور ان کی بیٹیوں کو چھوڑ دیتا تھا اور اپنے خیال خام میں سمجھتا تھا کہاس طرح وہ محفوظ ہوجائے گا لیکن یہ اس کی نادانی تھی۔ بنی عباس بھی امام مہدیؑ سے بچنے کے لیے فرعون کے نقش قدم پر چلے تھے۔ مولانا رومیؔ نے کیا ہی خوب کہا تھا:

حملہ بردی سوی در بندان غیب تا ببندی راہ بر مردان غیب

فرعون احمق تھا۔ اُس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو پھر حکم الٰہی کو میں کیسے روک سکوں گا۔ وہ ہر قیمت پر آکر رہے گا۔

بنی عباس کے خلفاء امام کے گھر کی تلاشی کراتے رہتے تھے اور جب امام کی شہادت ہوئی تو اُنھوں نے آپ کے گھر کا کونا کونا چھان مارا کیونکہ وہ یہ سن چکے تھے کہ امام مہدیؑ پیدا ہوچکے ہیں۔

آپ حضرات امام عصرؑ کی ولادت کے واقعات کے ساتھ یہ بھی سن چکے ہیں کہ اللہ نے آپ کو کس طرح مخفی رکھا تھا اور جب آپ کی ولادت ہوئی اُس وقت کوئی اس طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی آپ کی عمر چھ برس کی تھی کہ آپ کے والد ماجد شہید کر دیے گئے۔ امام حسن عسکریؑ اپنے خاص شیعوں کو اپنے فرزند کا دیدار کراتے تھے لیکن عام افراد کو اس کی اطلاع نہیں دیتے تھے۔ یہ خبر آخرکار پھیل ہی گئی کہ حسن بن علی عسکریؑ کے ہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی ہے اور وہ اسے مخفی رکھے ہوئے ہیں۔

خلفاء کبھی اس لیے اپنے کارندوں کو امام کے گھر بھیجا کرتے تھے کہ امام حسن عسکریؑ کے بیٹے کو تلاش کر کے قتل کر دیں لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ انسان کون ہوتا ہے کہ خدا کے ارادوں میں دخل دے؟ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ جب خدا کا حتمی فیصلہ ہو جائے تو کوئی انسان اس فیصلے کو بدل نہیں سکتا۔ جب امام کی شہادت ہوئی تو حکومتی کارندوں نے آپ کے گھر کی مکمل تلاشی لی اور ایک جاسوس عورت کو بھیجا کہ وہ امام کی تمام عورتوں اور کنیزوں کا معائنہ کرے کہ کہیں ان میں سے کوئی خاتون حاملہ تو نہیں ہے؟ ایک کنیز کے متعلق امکان ظاہر کیا گیا کہ وہ حاملہ ہے۔ حکومتی کارندے اسے اپنی نگرانی میں لے گئے اور پورا سال نگرانی کرتے رہے لیکن اُنھیں بعد میں معلوم ہوا کہ اُنھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کنیز حاملہ نہیں ہے۔[1]

امام حسن عسکریؑ کی شہادت

آپ ۲۸ برس کی عمر میں سامرا میں شہید ہوئے (آپ کے والد بزرگوار نے ۴۲ برس کی عمر میں شہادت پائی تھی)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کی امامت کا عرصہ چھ سال کا ہے اور یہ چھ برس تو قید خانے میں بسر ہوئے۔ اگر کبھی آزاد تھے تب بھی آپ کو کسی سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ آپ معاشرتی طور پر آزاد نہیں تھے۔ اگر کبھی کوئی امام سے ملاقات کے لیے آتا تو آپ کو نظر بند پاتا۔ بہر حال ایک عجیب صورت حال کا آپ کو سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

امام حسن عسکریؑ کی والدہ حیات تھیں جن کا نام حُدیث تھا لیکن وہ جدہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ وہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی دادی تھیں اس لیے انھیں جدہ (دادی) کہا جاتا تھا لیکن صرف دادی ہونا ہی اُن کی وجہ شہرت نہیں تھی۔

محدث قمی انوار البہیہ میں لکھتے ہیں کہ امام حسن عسکریؑ کے بعد وہ بی بی مفزع الشیعہ یعنی شیعوں کے لیے جائے پناہ تھیں۔

امام حسن عسکریؑ ۲۸ برس کی عمر میں شہید کر دیے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہم امام علی نقیؑ کی عمر مبارک کو شامل کریں تو بی بی کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان ہوگی۔ وہ بی بی اس قدر صاحب جلال اور باکمال تھیں کہ شیعوں کو جو بھی مشکل پیش آتی وہ اپنی ہر مشکل ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔

ایک شخص بیان کرتا ہے کہ میں امام حسن عسکریؑ کی پھوپھی حضرت حکیمہ خاتون دختر امام محمد تقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ان سے عقائد اور مسئلہ امامت پر گفتگو کی۔ بی بی نے اپنے عقائد بیان فرمائے

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۴۶ ۔ ۲۴۷

یہاں تک کہ اُنھوں نے امام حسن عسکریؑ کا نام لیا۔ بعد میں فرمایا کہ موجودہ وقت میں میرا امام اُن کا فرزند ہے جو اس وقت مخفی ہے۔

میں (راوی) نے کہا کہ اب جبکہ امام مخفی ہیں اگر اس وقت ہمیں کوئی مشکل درپیش ہو تو ہم کس سے کہیں؟ اور کس کی طرف رجوع کریں؟

حضرت حکیمہ خاتون نے فرمایا کہ تم جدہ کی طرف رجوع کرو۔

میں نے عرض کیا کہ عجیب بات ہے امام حسن عسکریؑ دنیا سے رخصت ہو گئے اور ایک خاتون کو اپنا وصی مقرر کر گئے؟!

حضرت حکیمہ خاتون نے فرمایا کہ امام حسن عسکریؑ نے وہی کیا جو امام حسینؑ بن علیؑ نے کیا تھا۔ آپ کے حقیقی وصی تو امام علیؑ بن حسینؑ تھے لیکن آپ نے ظاہری طور پر بہت سی وصیتیں حضرت زینب کبریٰؑ کو کی تھیں۔ جو کام امام حسینؑ نے کیا تھا وہی امام حسنؑ عسکریؑ نے کیا۔ اُن کا حقیقی وصی اُن کا وہ فرزند ہے جو مخفی ہے۔ آپ ظاہری طور پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ میرا وصی ہے اس لیے آپ نے اپنا ظاہری وصی اس باکمال خاتون کو مقرر کیا تھا۔[1]

امام مہدیؑ کی حیاتِ مبارکہ

امام مہدیؑ شب جمعہ ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کو سامرا میں پیدا ہوئے اور ۲۶۰ھ میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔[2] آپ کی غیبت صغریٰ اسی سال سے شروع ہوئی اور ۳۲۹ھ تک جاری رہی۔ اس کے بعد آپ کی غیبت کبریٰ کے دور کا آغاز ہوا۔ آپ کے خصوصی نائبین سابقہ ائمہ کے عظیم اور متقی اصحاب اور بزرگ شیعہ علماء پر مشتمل تھے۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) ابو عمرو عثمان بن سعید عمری　　(۲) ابو جعفر بن عثمان بن سعید عمری

(۳) ابو القاسم حسین بن روح نوبختی　　(۴) ابو الحسن علی بن محمد سمری۔

متواتر اسلامی روایات میں حق، صلح اور عدالت کی باطل اور ظلم و ستم پر آخری فتح اور پوری کائنات پر اسلام کے غلبے اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کو ایک مقدس اور عالی قدر شخصیت کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے اور اسلامی روایات میں اس شخصیت کو "مہدی" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تمام اسلامی مذاہب میں معمولی اختلاف کے ساتھ مہدی کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور تمام مسلمان امام مہدیؑ پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ یہ عقیدہ قرآن

۱۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۴۷۔ ۲۵۰

۲۔ شیخ مفید، الارشاد ج ۲، ص ۳۴۱

کریم کی آیات سے ماخوذ ہے۔[1]

عقیدۂ مہدی سے انسانیت کے روشن مستقبل کی نوید ملتی ہے اور انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ انسانیت کے مقدر میں ہمیشہ ظلم و ستم ہی نہیں لکھا بلکہ انسانیت کا خاتمہ عدل اجتماعی پر ہوگا۔ اس عقیدے کی وجہ سے انسان مایوسی سے بچ جاتا ہے اور اسے اُمید کی کرن دکھائی دیتی ہے۔ جہان رنگ و بو کے روشن مستقبل کی اُمید کو اسلامی روایات کی زبان میں "انتظار فرج" (کشائش کے انتظار) کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور انتظار فرج کو صرف عبادت ہی نہیں بلکہ افضل ترین عبادت کہا گیا ہے۔ انتظار فرج کا فلسفہ اصل میں اسلام کے ایک اور قانون سے ماخوذ ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا حرام ہے۔ انتظار فرج کی دو قسمیں ہیں۔ انتظار کی ایک قسم فائدہ مند ہے اور انتظار کی دوسری قسم گناہ ہے۔

انتظار فرج کی ان دو اقسام کا تعلق مہدی موعودؑ کے ظہور کے دو طرح کے معلول سے وابستہ ہے۔ ان نظریات کی وجہ سے تاریخی انقلابات اور تبدیلیوں کی علیحدہ علیحدہ توجیہ کی جاسکتی ہے۔[2]

مہدویت اور مہدی موعودؑ کے انقلاب و قیام کے عقیدے کا ایک ثمر تو وہ ہے جس میں ایک دھماکہ خیز کیفیت پائی جاتی ہے۔ جب نیکی اور بھلائی کا عمل صفر کے نقطے پر پہنچ چکا ہو اور حق و حقیقت کا کوئی طرف دار نہ رہے، ہر طرف باطل چھا چکا ہو اور باطل قوتیں حکومت پر قابض ہوں اور پوری دنیا میں ایک بھی صالح انسان دکھائی نہ دے رہا ہو تو یہ دھماکہ خیز کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اس نظریے کے تحت گناہ ایک فال ایک تماشا اور لذت و کام جوئی ہے اور امام کے مقدس انقلاب کے لیے مددگار ہے اور ایسے موقع پر اس شعر کا حقیقی مصداق سامنے آتا ہے۔

در دل دوست بہ ہر حیلہ رھی بایں کرد — طاعت از دست نیاید گنھی بایں کرد

اگر اطاعت ممکن نہ ہو تو گناہ ہی کرنا چاہیے۔ کسی نہ کسی بہانے سے دوست کے دل میں کوئی راہ پیدا کرنی چاہیے۔[3]

اس طرز فکر کے حامل لوگ اصلاح طلب مجاہدین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والوں سے ہمیشہ بغض و عداوت رکھتے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں نیکی اور بھلائی کرنے والے مہدی موعودؑ کے قیام میں مزید تاخیر کا باعث بن رہے ہیں۔ قیام مہدیؑ کے متعلق اس طرح کا نظریہ اور اس نوعیت کا انتظار اسلام کے حدود و قوانین کو معطل کرنے کا باعث ہے اور یہ طرز فکر ایک قسم کی مادر پدر آزادی ہے لہٰذا یہ طرز تفکر اسلامی اور قرآنی موازین سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

۱۔ سورۂ توبہ: آیت ۳۳۔ سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۵۔ سورۂ قصص: آیت ۵ ۔ ۶۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۲۸

۲۔ قیام و انقلاب مہدیؑ از دیدگاہ فلسفہ تاریخ شہید مرتضیٰ مطہری ص ۱۳ ۔ ۱۵

۳۔ گیارہویں، بارہویں صدی کے شاعر نشاط اصفہانی

ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ تصور مہدی کی اساس کو قرآن کریم کی آیات میں تلاش کیا جاسکتا ہے اور اسلامی روایات میں بھی انہی آیات سے استناد کیا گیا ہے جس کا نتیجہ مذکورہ بالا طرز فکر کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان آیات سے تو یہ مستفاد ہوتا ہے کہ مہدیؑ کا ظہور اہل حق اور اہل باطل کی کشمکش کا ہی ایک حصہ ہے جس میں آخرکار کامیابی اہل حق کا مقدر ہوگی۔

ایک شخص کی خوش نصیبی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ عملی طور پر اہل حق کے ساتھ ہو۔ روایات میں جن آیات سے استناد کیا گیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے مہدی موعودؑ کو اہل ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے مظہر نوید اور کمزوروں کے لیے احسان قرار دیا ہے۔[1]

ظہور مہدیؑ خدا کا وہ وعدہ ہے جو خدا نے آسمانی کتب میں صالحین و متقین سے کیا ہے اور فرمایا ہے کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔[2]

رسول اکرم ﷺ کی حدیث ہے: یَمْلَأُ اللّٰهُ بِهِ الْأَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا بَعْدَ مَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا اللہ، امام مہدی کے ذریعے سے ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔

آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث دوسرے گروہ کی بجائے ہمارے نظریے کی تائید کرتی ہے۔ اس حدیث میں ظلم اور ظالم کی بات کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مظلومین بھی ہوں گے اور حدیث یہ بتاتی ہے کہ امام مہدیؑ کا قیام مظلومین کی حمایت کے لیے ہوگا کیونکہ وہ آپ کی حمایت کے مستحق ہوں گے۔

شیخ صدوق نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ امر اس وقت تک وقوع پذیر نہ ہوگا جب تک ہر اچھا اور برا اپنے انجام تک نہ پہنچ جائے۔

لہٰذا بات یہ ہے کہ اچھے اور برے لوگوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے انجام تک پہنچ جائے۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ اچھے لوگ موجود ہی نہ ہوں اور امام مہدیؑ کے ظہور کے لیے صرف برے لوگوں کی برائی انتہا تک پہنچ جائے۔ اسلامی روایات میں ان اہل حق کا تذکرہ بھی موجود ہے کہ جب امام ظہور فرمائیں گے اُس وقت وہ فی الفور امام کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور مہدیؑ کے وقت اہل حق موجود ہوں گے جو آپ کی نصرت کریں گے۔ ظلم و جور سے بھری اس زمین پر حق و انصاف، کے شیدائی بھی موجود ہوں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ امامؑ کے ظہور کے وقت حق و حقیقت کا وجود ہی باقی نہ ہو البتہ یہ بات فرض کی جاسکتی ہے کہ اہل حق بلحاظ تعداد کم ہوں مگر بلحاظ کیفیت وہ ایمان کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہوں گے اور وہ سید الشہداء امام حسینؑ کے اصحاب

۱۔ سورۂ نور: آیت ۵۵ ۔ سورۂ قصص: آیت ۵

۲۔ سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۵ ۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۲۸

کی طرح ایمان کے بلند مقام پر فائز ہوں گے۔

اسلامی روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ امام کے ظہور سے قبل اہل حق کی کئی مسلح تحریکیں چل رہی ہوں گی۔ امام کے ظہور سے پہلے قیام یمانی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ آپ کے قیام کا ایک حصہ ہوگا۔ کچھ اسلامی روایات میں اہل حق کی حکومت کا ذکر کیا گیا ہے جو قیام مہدیؑ تک جاری رہے گی۔ آیات و روایات کے مجموعے سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ازل سے حق و باطل کے درمیان جاری کشمکش کے آخری سلسلے کا نام قیام مہدیؑ ہے۔ مہدی موعودؑ کی کامیابی تمام انبیاءؑ و اولیاء اور اہل حق کی مثالی کامیابی قرار پائے گی۔ [1]

عظیم انتظار کی کیفیت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اجمالی طور پر اس عظیم نوید کے متعلق تحقیق کریں۔

عظیم انتظار کی خصوصیات

(۱) انسانیت کے روشن مستقبل کی امید۔

(۲) انتظار مہدیؑ کا مطلب، صلاح، تقویٰ، صلح، عدل و انصاف اور سچائی کی جھوٹ، استکبار، غلامی، ظلم اور مکر و فریب پر آخری فتح ہے۔

(۳) تمام دنیا میں ایک حکومت ہوگی۔

(۴) تمام زمین آباد کی جائے گی اور زمین کا کوئی بھی کونا آباد ہونے سے خالی نہ ہوگا۔

(۵) انسانیت بالیدہ اور مکمل طور پر باشعور ہوگی۔ بنی نوع انسان اپنی اعلیٰ فکر اور آئیڈیالوجی سے استفادہ کر کے ہر طرح کی غلامی اور حیوانی و جبلی اور پست خواہشات سے آزادی حاصل کریں گے۔

(۶) زمین کے خزانوں سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

(۷) دولت کے لحاظ سے انسانوں میں مساوات قائم ہوگی۔

(۸) زنا، سود، شراب خوری، خیانت، چوری، قتل جیسے اخلاقی جرائم کا خاتمہ ہوگا اور دلوں میں گرہیں اور کینے باقی نہ رہیں گے۔

(۹) دنیا سے لڑائی جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ جنگوں کا کہیں وجود نہ ہوگا اور ہر جگہ اخلاص، محبت اور تعاون دکھائی دے گا۔

(۱۰) انسان اور فطرت ہم آہنگ ہوں گے۔

مذکورہ بالا تمام خصوصیات مزید تجزیہ و تحلیل اور تفصیل طلب ہیں۔ [2]

۱۔ قیام و انقلاب مہدی از دیدگاہ فلسفہ تاریخ اور مقالہ شہید مرتضیٰ مطہری ص ۵۳ ۔ ۵۹

۲۔ قیام و انقلاب مہدی ص ۵۱ ۔ ۵۳ ۔ از اثر اعتقاد مہدویت در تاریخ اسلام ۔ سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ص ۲۸۱ ۔ ۲۹۳

بحث کے چیدہ مطالب

(۱) بنی ہاشم کے اکابرین نے بشمول اولاد حسنؑ (عبداللہ محض، محمد و ابراہیم) اور بنو عباس (ابراہیم امام، سفاح، منصور) اور دیگر معززین بنی ہاشم نے ابواء کے مقام پر ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا جس میں محمد نفس زکیہ کی بیعت کی گئی اور بنی اُمیہ کے خلاف اقدامات کے متعلق غور وخوض کیا گیا۔

(۲) بنی اُمیہ کے خلاف جس تحریک کا آغاز کیا گیا وہ تحریک ''مہدویت'' کے نام سے شروع ہوئی تھی۔ امام جعفر صادقؑ نے اس کی مخالفت کی تھی۔

(۳) بنی اُمیہ کے آخری دور میں بنی عباس نے خفیہ تبلیغات شروع کی تھیں۔ اُنھوں نے مبلغین کی تربیت کی اور اُنھیں دور دراز علاقوں میں اُموی حکومت کے خلاف لوگوں کو متحرک کرنے کی ذمے داری دی۔ ان مبلغین میں ابوسلمہ خلال اور ابومسلم سرفہرست تھے۔ ابوسلمہ خلال کوفہ میں رہائش پذیر تھا اور اسے وزیر آل محمد کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا جبکہ ابومسلم خراسان میں مقیم تھا اور اسے امیر آل محمد کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

(۴) بنی اُمیہ بالخصوص حجاج بن یوسف نے عراق اور بنی اُمیہ کے دیگر حکام نے خراسان میں ظلم وتشدد کا بازار گرم کر رکھا تھا جس کی وجہ سے بنی اُمیہ کے خلاف چھوٹی بڑی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں اور خلفائے بنی اُمیہ لوگوں کی نظر سے گر گئے تھے۔ بنی اُمیہ کے خلاف اہل ایران بلکہ اہل خراسان نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ خراسان میں حضرت زید اور حضرت یحییٰ کے قیام (اور اُن کی مظلومانہ شہادت) کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ بنی اُمیہ سے لوگوں کی ناراضگی سے بنی عباس نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور عوامی جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

(۵) ابوسلمہ ایک سیاست دان تھا۔ ابراہیم امام کے قتل کے بعد اس نے خلافت کا رخ اولادِ علیؑ کی طرف موڑنا چاہا۔ اس نے ایک ہی مضمون کے دو خطوط مدینہ روانہ کئے۔ ایک خط امام جعفر صادقؑ اور دوسرا خط عبداللہ محض کے نام تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے اس کے خط کو کوئی اہمیت نہ دی اور اسے پڑھے بغیر جلا ڈالا جبکہ عبداللہ محض اس خط کو پڑھ کر بہت خوش ہوا اور وہ دوسری صبح امام کے پاس آیا اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ ابھی عبداللہ کا جوابی خط ابوسلمہ خلال تک نہیں پہنچا تھا کہ ابومسلم نے سازش کے ذریعے اُسے قتل کروا دیا۔

(۶) بنی عباس کی سیاست کا دارومدار ۱۳۲ھ سے ۲۱۸ھ یعنی ابتدائے حکومت سے معتصم کے دور تک

اہل ایران پر رہا تھا۔ اس دور میں عربوں کے خلاف ایرانی حمایت کی بنیاد پر عباسی حکومت قائم رہی۔ بنی عباس کے اس دور میں برامکہ اور فضل بن سہل جیسے ایرانی وزراء کو عروج حاصل ہوا تھا۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے بنی عباس نے اہل ایران سے بڑھ کر فارسی زبان کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لی تھی اور بنی عباس کی طرف سے ایران نوازی کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پیشرو بنی اُمیہ کی طاقت کا دارومدار اہل عرب پر تھا لہٰذا اُن کا زور توڑنے کے لیے بنی عباس نے اہل ایران کو نوازنے کا سلسلہ شروع کیا۔

(۷) بنی عباس کی سیاست جھوٹی احادیث کی تخلیق، من گھڑت واقعات کی اشاعت، غداری اور مسلمانوں کے قتل و غارت پر مبنی تھی۔

(۸) امام جعفر صادقؑ ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت عبدالملک بن مروان کی حکومت تھی۔ آپ نے ۶۵ برس کی عمر پائی اور ۳۴ برس تک امامت کے فرائض سرانجام دینے کے بعد ۲۵ شوال ۱۴۸ھ ماہ رجب میں منصور عباسی کے زہر سے شہید ہوئے۔ آپ کو بقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ آپ کی زندگی میں بنی اُمیہ اور بنی عباس کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہوئی تھی جس کے نتیجے میں بنی اُمیہ کی حکومت ختم ہوگئی اور بنی عباس برسراقتدار آئے۔

(۹) آپ کے عہد امامت کے اٹھارہ برسوں میں درج ذیل پانچ اموی خلفاء کی حکومت رہی۔

(۱) ہشام بن عبدالملک (۱۱۴ھ تا ۱۲۵ھ)

(۲) ولید بن یزید بن عبدالملک (۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ)

(۳) یزید بن ولید بن عبدالملک (۱۲۶ھ)

(۴) ابراہیم بن ولید بن عبدالملک (۷۰ دن)

(۵) مروان بن محمد (۱۲۶ھ تا ۱۳۲ھ)

(مروان حمار پر اُموی اقتدار کا خاتمہ ہوا) اس کے بعد آپ نے ۱۶ برس تک امامت و رہبری کے فرائض دو عباسی خلفاء ابو العباس سفاح (۱۳۲ھ تا ۱۳۷ھ) اور منصور عباسی (۱۳۷ھ تا ۱۴۸ھ) کے زمانہ حکومت میں سرانجام دیئے تھے۔

(۱۰) امام حسینؑ اور امام جعفر صادقؑ کے عہد امامت میں اسلامی دنیا کی صورت حال میں بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ امام حسینؑ کے عہد امامت میں امت اسلامیہ کو صرف یزید کی خلافت و حکومت کا مسئلہ درپیش تھا جبکہ بنی اُمیہ کے آخری دور میں لوگوں میں فکری آزادی پیدا ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں

اُن میں ایک علمی شعور پیدا ہوا تھا اور لوگوں میں عقائد کی جنگ کا بازار گرم تھا۔

(۱۱) اسلامی نظر سے امام جعفر صادقؑ کا زمانہ فکری اور اعتقادی انقلابات کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ایسے عقائد منظرعام پر آچکے تھے جو اسلام کے لیے سخت خطرے کا باعث تھے۔ اس دور میں زنادقہ، متکلمین اور صوفیہ کے علاوہ بہت سے فقہی دبستان وجود میں آچکے تھے اور خوارج اور مرجئہ کے عقائد کو بھی خوب فروغ مل رہا تھا۔

(۱۲) امام جعفر صادقؑ کے عہد امامت میں علمی ترقی کے کچھ اسباب وعوامل حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام نے لوگوں کو نظم وضبط اور تفکر کی دعوت دی تھی۔

(۲) مختلف اقوام وملل سے تعلق رکھنے والے افراد کی عالم اسلام میں آمدورفت بڑھ گئی تھی۔

(۳) مسلمان کسی مخصوص خطّے کو اپنا وطن نہیں سمجھتے تھے۔

(۴) اہل کتاب سے درگزر اور ان کی حوصلہ افزائی کی پالیسیاں۔

(۱۳) آپ کے علمی مکتب نے بہت سے نامور شاگرد پیدا کیے، چند مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

(۱) ابان بن تغلب (۲) ابوبصیر (۳) برید بن معاویہ عجلی (۴) ابوحمزہ ثمالی (۵) زرارہ بن اعین (۶) حمران بن اعین شیبانی (۷) جابر بن یزید جعفی کوفی (۸) صفوان جمال (۹) عبداللہ بن ابی یعفور (۱۰) معلی بن خنیس (۱۱) محمد بن علی نعمان (۱۲) ہشام بن حاکم (۱۳) مفضل بن عمر جعفی

(۱۴) امام موسیٰ کاظمؑ ۷ صفر ۱۲۸ھ کو ابواء کے مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ۳۵ برس تک امامت کے فرائض سرانجام دیئے اور ۲۵ رجب ۱۸۳ھ کو ہارون نے زہر دلوا کر آپ کو شہید کیا۔ آپ کاظمین میں دفن ہوئے۔

(۱۵) آپ کے ہم عصر خلفاء کے نام یہ ہیں:

(۱) منصور عباسی (۱۳۸ھ تا ۱۵۸ھ)

(۲) مہدی عباسی (۱۵۸ھ تا ۱۶۸ھ)

(۳) ہادی عباسی (۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ)

(۴) ہارون رشید (۱۷۰ھ تا ۱۸۳ھ)

(۱۶) امام موسیٰ کاظمؑ کے کچھ بنیادی اقدامات حسب ذیل ہیں:

(۱) فکری رہنمائی اور اس دور کے دینی ومذہبی انحرافات کی مناسب تردید۔

(۲) تاحد امکان اپنے والد کے علمی وفرہنگی کام کو جاری رکھنا۔

(۳) اپنے ماننے والوں کی براہ راست نگرانی اور انھیں ضروری رہنمائی فراہم کرنا۔

(۴) آپ نے ہارون رشید کے سامنے اپنے حق خلافت کے لیے بحث کی اور بتایا کہ خلافت صرف میرا ہی حق ہے۔

(۵) آپ نے امت میں انقلابی روح کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کیں اور واقعہ فخ کی مانند دوسرے قیاموں کی ترغیب دی تھی۔

(۱۷) معتبر اور مشہور ترین روایت کے مطابق آپ کو چار سال تک تاریک قید خانے میں رکھا گیا اور قید کے دوران آپ کو یہ پیشکش کی گئی کہ آپ زبانی اور رسمی طور پر ہارون سے معذرت کر لیں تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا لیکن آپ نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔

(۱۸) امام موسیٰ کاظمؑ بغداد میں کچھ عرصہ فضل بن ربیع کی قید میں رہے۔ کچھ مدت کے بعد فضل امام کا عقیدت مند بن گیا اور اس نے آپ کو زندان میں بہت سی سہولتیں فراہم کیں۔ جاسوسوں نے ہارون کو اطلاع دی تو اس نے امام کو فضل بن یحییٰ برمکی کی تحویل میں دیدیا۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی امام کا گرویدہ ہوگیا۔ ہارون کو اس کا علم ہوا تو اس نے امام کو سندی بن شاہک کے قید خانے میں بھیج دیا اور فضل پر بہت ناراض ہوا۔

(۱۹) ائمہ طاہرینؑ کو لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ہارون کے مقربین میں بھی امام موسیٰ کاظمؑ کے عقیدت مند موجود تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک علی بن یقطین تھا جو پوری مملکت میں دوسری اہم سرکاری شخصیت تھی۔

(۲۰) ہارون، امام موسیٰ کاظمؑ سے حسد کرتا تھا اور انھیں اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا اور پھر جب اس نے آپ کی استقامت کو دیکھا تو آپ کو قید کر لیا اور بعد ازاں شہید کرا دیا۔

(۲۱) یحییٰ برمکی چاہتا تھا کہ خلیفہ اس کے بیٹے فضل سے راضی ہو جائے اسی لیے اس نے خرما میں زہر ملایا اور وہ زہر آلود خرمے سندی بن شاہک کے سپرد کیے اور اس نے زہر آلود خرمے امام کو کھلائے (جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی)۔

(۲۲) امام علی بن موسیٰ الرضاؑ ۱۱ ذی قعدہ ۱۴۸ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۵۵ برس کی عمر میں ۲۰۳ھ ماہ صفر کے آخر میں مامون کے زہر سے شہادت پائی۔

(۲۳) امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کے متعلق مختلف قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔

(۱) یہ مامون کی اپنی سوچ تھی اور وہ آخر دم تک اس سوچ پر قائم رہا۔ شیعہ علماء اس نظریے کو نہیں مانتے۔

(۲) مامون ابتدا میں مخلص تھا لیکن بعد میں اس کی رائے بدل گئی تھی۔
(۳) ولی عہدی کا فیصلہ مامون کا نہیں بلکہ فضل بن سہل کا تھا۔ اس نے مامون کو یہ تجویز پیش کی تھی۔ وہ شیعہ تھا اور اس کا یہ اقدام خلوص پر مبنی تھا۔ چنانچہ جرجی زیدان اور ایڈورڈ براؤن اس نظریے کے حامی ہیں۔
(۴) یہ فضل بن سہل کی تجویز تھی۔ وہ نومسلم ایرانی تھا اور اپنے اس منصوبے کے ذریعے اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ایران کو مجوسی دور میں واپس لانے کا خواہش مند تھا۔
(۵) یہ تجویز خود مامون کی تھی مگر اخلاص کی بنیاد پر نہیں تھی۔ اس طرح وہ اہل ایران کی ہمدردیاں سمیٹنا، علویوں کے قیام کو بے اثر بنانا اور خود امام علی رضاؑ کو غیر مؤثر بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہماری روایات میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ امام علی رضاؑ نے مامون سے فرمایا تھا کہ مجھے ولی عہد بنانے سے تیرا صرف یہی ایک مقصد ہے۔

(۲۴) مامون نے امام کو خراسان آنے کی دعوت دی تھی جس کے مقاصد یہ تھے:
(۱) شیعوں کی متحرک انقلابی کارروائیوں کو غیر مؤثر بنانا۔
(۲) امام علی رضاؑ کی ولی عہدی سے عملی طور پر یہ ثابت کرنا کہ اگر خلفاء کی حکومتیں ناجائز اور باطل ہوتیں تو امام علی رضاؑ ولی عہدی کا منصب قبول نہ کرتے۔
(۳) امام جو کہ ہر اسلامی تحریک کا روح رواں ہوتا ہے، اُسے ولی عہدی کے ذریعے براہ راست اپنے کنٹرول میں لینے کی کوشش کی گئی تھی۔
(۴) معنوی اور روحانی عزت کا حصول۔
(۵) مامون کا خیال تھا کہ امام جب ولی عہد مقرر ہوں گے تو اس کے تمام غلط کاموں کی توجیہ و تاویل کریں گے۔

(۲۵) ولی عہدی کے بارے میں امام کو پہلے سے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا بلکہ آپ کے مرو پہنچنے کے بعد ولی عہدی کا مسئلہ چھیڑا گیا۔

(۲۶) مامون نے اپنے نمائندوں کے ذریعے آپ کو ولی عہدی کی پیشکش کی۔ آپ نے دھمکیوں کے باوجود اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر جب آپ کو مجبور کیا گیا تو آپ نے ولی عہدی اس شرط پر قبول کی کہ میں امور سلطنت میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کروں گا۔

(۲۷) امام کی حسب ذیل تدابیر سے مامون اپنے مقصد میں ناکام ہوگیا تھا:

(۱) جب مامون نے امام کو خراسان آنے کی دعوت دی تو امام نے خراسان جانے سے پہلے کچھ ایسے اقدامات کیے جن کی وجہ سے مدینہ کی فضاؤں میں مامون کے لیے نفرت بڑھ گئی۔

(۲) جب مرو میں آپ کو ولی عہدی کی پیشکش کی گئی تو آپ نے اسے سختی سے مسترد کر دیا۔

(۳) آپ نے مجبور کیے جانے پر ولی عہدی کا منصب اس شرط پر قبول کیا کہ امور سلطنت میں آپ کسی طرح کی مداخلت نہیں کریں گے۔ مامون کو آپ کی یہ شرط آخرکار تسلیم کرنا ہی پڑی۔ اگرچہ اس کا خیال تھا کہ مستقبل میں امام امور سلطنت انجام دیں گے۔

(۴) آپ کی ولی عہدی کی وجہ سے تقیہ کے دبیز پردے کچھ عرصے کے لیے ہٹ گئے اور شیعی نظریہ امامت دنیا کے سامنے واضح ہوا اور تشیع کا پیغام عوام کے کانوں تک پہنچنے لگا۔

(۵) مامون کی یہ خواہش تھی کہ امام کا رابطہ اپنے پیروکاروں سے براہ راست نہ ہونے پائے اسی لیے اس نے آپ کے خراسان کے سفر کے لیے جو روڈ میپ تیار کیا تھا وہ ان شہروں سے گزرتا تھا جہاں شیعہ آبادی بہت کم تھی لیکن مامون کی تمام تر احتیاط کے باوجود آپ کو جہاں بھی موقع ملا آپ نے عوام سے براہ راست رابطہ کیا۔ آپ اہواز پہنچے تو لوگوں کو امامت کی واضح نشانیاں دکھائیں اور جب بصرہ پہنچے تو لوگوں کی محبتوں کا مرکز قرار پائے اور جب نیشاپور پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو حدیث سلسلۃ الذہب کا تحفہ دیا اور مرو میں بھی جب موقع ملتا، حکومتی حصار سے نکل کر عوام میں گھل مل جاتے تھے۔

(۶) آپ کی ولی عہدی کی وجہ سے شیعیت کو فروغ ملا حتیٰ کہ دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں بھی تشیع کا پیغام لوگوں تک پہنچا اور حکومتی اداروں میں شیعوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

(۲۸) جو بات قابل قبول ہونے کے ساتھ تاریخ سے بھی مطابقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جب مامون خراسان سے بغداد کی طرف آرہا تھا تو اس نے بنی عباس کی مخالفت کو ختم کرنے کے لیے امام علی رضاؑ کو زہر دے کر شہید کرایا تاکہ وہ بنی عباس سے یہ کہہ سکے کہ اب تو ولی عہدی کا مسئلہ ہی ختم ہو چکا ہے۔ تمھیں مخالفت کی کیا ضرورت ہے؟!

(۲۹) جواد الائمہ امام محمد تقیؑ ۱۰ رجب یا بقولے ۱۵ یا ۱۹ رمضان ۱۹۵ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے اور ذی قعدہ ۲۲۰ھ میں معتصم عباسی نے آپ کو زہر دلوایا جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی۔

(۳۰) آپ کے ہم عصر خلفاء یہ تھے:

مامون (۲۰۳ھ تا ۲۱۸ھ)

معتصم عباسی (۲۱۸ھ تا ۲۲۰ھ)

(۳۱) حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرح سے امام محمد تقیؑ کم سنی میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔

(۳۲) مامون اور معتصم مدینہ میں امام کی موجودگی کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اسی لیے انھوں نے زبردستی آپ کو بغداد بلا بھیجا جہاں آپ عملی طور پر نظر بند تھے۔

(۳۳) مامون اور معتصم کے عہد میں امام نے مختلف مذاہب کے علماء سے مناظرے کئے جن میں سے اہم ترین ناظرہ مامون کے دربار میں قاضی یحییٰ بن اکثم کے ساتھ ہوا تھا۔

(۳۴) آپ نے عباسی حکومت کے اہم شہروں مثلاً اہواز، ہمدان، سیستان، رے، بصرہ، واسط، بغداد، کوفہ اور قم میں اپنے نمائندے مقرر کئے تھے۔ آپ کے نمائندے لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے، ان سے شرعی مالیات جمع کرتے اور آپ کے امام و امت کے درمیان رابطے کا کام کرتے تھے۔

(۳۵) امام محمد تقیؑ اور دوسرے ائمہ ہدیٰؑ کی زندگی کا ایک تربیتی پہلو بھی تھا۔ ائمہ ہدیٰؑ نے سیکڑوں شاگردوں کی تربیت کی تھی اور اس طرح ائمہ اپنے علوم کو معاشرے تک پہنچاتے تھے۔

امام محمد تقیؑ کڑی سرکاری نگرانی میں رہے۔ آپ کی زندگی بہت مختصر تھی۔ آپ نے صرف ۲۵ برس کی عمر پائی تھی اسی لیے تاریخ میں آپ کے راویوں کی تعداد کافی کم دکھائی دیتی ہے مگر اس کے باوجود تاریخ میں آپ سے روایت کرنے والوں کی تعداد ایک سودس افراد ہیں۔

(۳۶) امام محمد تقیؑ کے اہم ترین اصحاب حسب ذیل ہیں:

(۱) علی بن مہزیار (۲) احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی (۳) زکریا بن آدم (۴) محمد بن اسماعیل بن بزیع (۵) حسین بن سعید اہوازی (۶) احمد بن محمد بن خالد برقی (۷) سید عبدالعظیم حسنی

یہ لوگ علم فقہ میں اہم مقام رکھتے تھے۔

(۳۷) امام علی نقیؑ ۱۵ ذی الحجہ ۲۱۲ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۰ھ ماہ ذی الحجہ کو آٹھ برس کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ آپ نے ۳۳ برس تک امامت و رہبری کے فرائض سرانجام دیئے۔ آپ نے ۱۳ برس تک مدینہ میں امامت کے فرائض ادا کئے اور ۲۰ سال تک سامرا میں مخلوق خدا کی رہنمائی کی۔ معتز کے زہر کی وجہ سے ۳ رجب ۲۵۴ھ کو آپ نے شہادت پائی اور اپنے گھر میں ہی مدفون ہوئے۔

(۳۸) امام علی نقیؑ کے دور کے خلفاء یہ تھے:

(۱) معتصم عباسی (۲۲۰ھ تا ۲۲۷ھ)

(۲) واثق بن معتصم (۲۲۷ھ تا ۲۳۲ھ)

(۳) متوکل بن معتصم (۲۳۲ھ تا ۲۴۸ھ)

(۴) منتصر بن متوکل (چھ ماہ)

(۵) مستعین یہ منتصر کا چچا زاد تھا (۲۴۸ھ تا ۲۵۲ھ)

(۶) متوکل کا دوسرا بیٹا معتز بن متوکل (۲۵۲ھ تا ۲۵۴ھ)

مذکورہ بالا تمام خلفاء میں سے منتصر واحد خلیفہ تھا جو خاندان پیغمبرؐ سے بہتر سلوک رکھتا تھا۔

(۳۹) امام علی نقیؑ کی زندگی کے اہم واقعات حسب ذیل تھے:

(۱) خلافت کی عظمت و ہیبت کا زوال۔

(۲) درباریوں کی عیاشیاں۔

(۳) ظلم اور مفاد پرستی کا عروج۔

(۴) علوی تحریکوں میں تیزی۔

(۴۰) امام علی نقیؑ کی زندگی میں بنی عباس کے خلاف علویوں کی حسب ذیل تحریکیں اٹھیں:

(۱) محمد بن قاسم کا قیام (۲) یحیٰی بن عمر بن حسین کا قیام

(۳) حسن بن زید بن محمد کا قیام (۴) محمد بن جعفر کا قیام

(۴۱) امام حسن عسکریؑ ۲۴ ربیع الاول یا ۸ ربیع الثانی ۲۳۲ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۴ھ میں آپ نے امامت کا عہدہ سنبھالا۔

(۴۲) امام حسن عسکریؑ کی سخت نظر بندی کی وجہ یہ تھی کہ خلفاء کو معلوم تھا کہ ان کی صلب سے امام مہدی پیدا ہوں گے۔ چنانچہ عباسی خلفاء بھی فرعون کی طرح امام کے گھر کی خصوصی نگرانی کرتے تھے۔ وہ گاہے بگاہے آپ کے گھر کی تلاشی لیا کرتے تھے اور جب آپ کی شہادت ہوئی تو انھوں نے اس وقت بھی آپ کے گھر کی مکمل تلاشی لی تھی۔

(۴۳) حضرت امام مہدیؑ شب جمعہ ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کو سامرا میں پیدا ہوئے اور ۲۶۰ھ میں امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔

(۴۴) آپ کی غیبت صغریٰ ۲۶۰ھ سے شروع ہوئی اور ۳۲۹ھ تک جاری رہی۔ اس دوران آپ کے یہ چار نائب آپ کے اور امت کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دیتے تھے۔

(۱) عثمان بن سعید عمری (۲) محمد بن عثمان بن سعید عمری (۳) حسین بن روح نوبختی (۴) علی بن محمد سمری

(۴۵) امام مہدیؑ کی عمر مبارک چھ برس کی تھی کہ آپ کے والد ماجد کو شہید کر دیا گیا۔ امام حسن عسکریؑ اپنی

زندگی میں اپنے خاص شیعوں کو آپ کی زیارت کراتے تھے۔ عام افراد کو اس کی اطلاع نہیں تھی۔ امام حسن عسکریؑ کی زندگی میں آپ کے بیٹے کی پیدائش کی خبر لوگوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ امام اپنے بیٹے کو خلفاء سے چھپائے ہوئے ہیں۔

(۴۶) انتظار فرج دو طرح کا ہے۔

(۱) ایسا انتظار جو فائدہ مند ہے اور ملت کے مفاد میں ہے۔

(۲) ایسا انتظار جو گناہ ہے۔

یہ دو طرح کے انتظار اصل میں مہدی موعودؑ کے عظیم ظہور کے دو طرح کے معلولات کا نتیجہ ہیں اور اس کا تعلق تاریخ کی تبدیلیوں اور انقلابات کے متعلق فکر کے مخصوص زاویے سے ہے۔

(۴۷) انتظار کی کچھ واضح خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) انسانیت کے روشن مستقبل کے لیے پُر امید ہونا۔

(۲) استکبار اور ظلم کے خلاف، بہتری، تقویٰ اور عدل و انصاف کی آخری فتح۔

(۳) ایک عالمی حکومت کا قیام۔

(۴) زمین کی آباد کاری۔

(۵) انسانیت اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کی حامل ہوگی۔

(۶) زمین کے خزانوں سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

(۷) تمام انسانوں کے درمیان مساوات قائم ہوجائے گی۔

maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

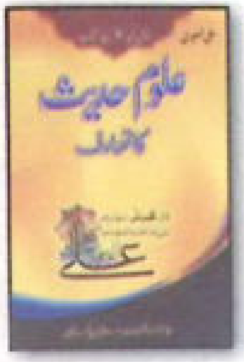

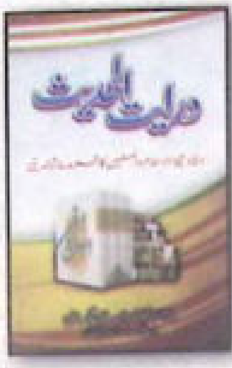

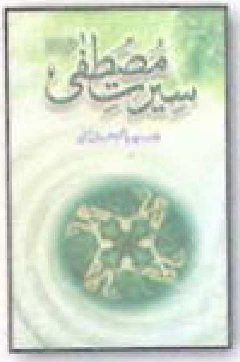

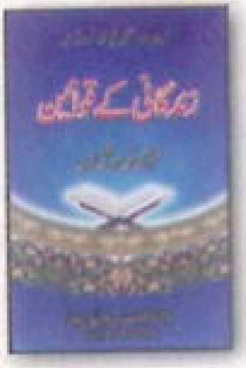

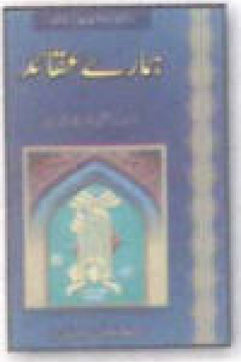

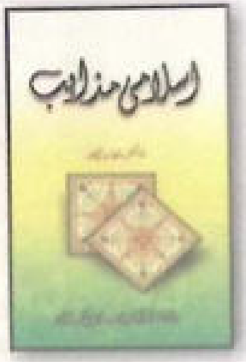

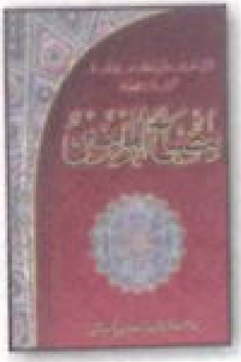
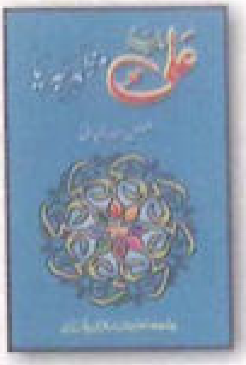

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان